

اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کا مطالعہ

(منتخب مجموعوں کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

عرفان طارق



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجس، اسلام آباد

جنوری ۲۰۱۹ء

اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کا مطالعہ

(منتخب مجموعوں کے حوالے سے)

مقالہ نگار:

عرفان طارق

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۱۹ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کا مطالعہ (منتخب مجموعوں کے حوالے سے)

رجسٹریشن نمبر: 1320/M/U/S17

پیش کار: عرفان طارق

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: زبان و ادب اردو

ڈاکٹر نعیم مظہر

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ

اقرار نامہ

میں، عرفان طارق حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالرشپ کی حیثیت سے ڈاکٹر نعیم مظہر کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

عرفان طارق

مقالہ نگار

فہرست ابواب

III	مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم
IV	اقرار نامہ
V	فہرست ابواب
VIII	مقالے کا دائرہ کار
X	Abstract
XII	مقالے کا مقصد
XIII	اظہار تشکر
۱	باب اول موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث
۱	الف۔ موضوع کا تعارف
۲	بیان مسئلہ
۲	مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق
۲	تحقیق کی اہمیت
۳	تحدید، مقاصد تحقیق، تحقیقی سوالات
۳	نظری دائرہ کار، پس منظری مطالعہ
۴	تحقیقی طریقہ کار
۵	ب۔ کردار کیا ہے؟
۱۲	ج۔ کردار کی اقسام
۲۲	د۔ اشفاق احمد شخصیت اور فن (اجمالی جائزہ)
۳۶	حوالہ جات

۳۸	اشفاق احمد کے افسانوں کے مردانہ کرداروں کا مطالعہ	باب دوم
۳۸	الف) "ایک محبت سو افسانے" کے مرکزی کردار	
۵۴	ب) "ایک محبت سو افسانے" کے ضمنی کردار	
۷۰	ج) "اجلے پھول" کے مرکزی کردار	
۹۲	د) "اجلے پھول" کے ضمنی کردار	
۱۰۸	حوالہ جات	
۱۱۳	اشفاق احمد کے افسانوں کے نسوانی کرداروں کا مطالعہ	باب سوم:
۱۱۳	الف) "ایک محبت سو افسانے" کے مرکزی کردار	
۱۳۱	ب) "ایک محبت سو افسانے" کے ضمنی کردار	
۱۴۱	ج) "اجلے پھول" کے مرکزی کردار	
۱۴۹	د) "اجلے پھول" کے ضمنی کردار	
۱۶۲	حوالہ جات	
۱۶۵	اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کے امتیازات	باب چہارم
۱۶۵	الف) عشقیہ اور رومانوی کردار	
۱۷۲	ب) مذہبی عناصر کے حامل کردار	
۱۸۰	ج) علمی و ادبی کردار	
۱۹۰	حوالہ جات	
۱۹۲	مجموعی جائزہ	باب پنجم
۱۹۲	مجموعی جائزہ	
۱۹۹	نتائج	
۲۰۰	سفارشات	
۲۰۱	کتابیات	

مقالے کا دائرہ کار

میں نے اپنی تحقیق بعنوان "اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کا مطالعہ" (منتخب مجموعوں کے حوالے سے) موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ اشفاق احمد کا پہلا افسانوی مجموعہ "ایک محبت سو افسانے" کے نام سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل تیرہ افسانے ہیں۔ جن میں توبہ، رات بیت رہی ہے، مسکن، توتا کہانی، پناہیں، بندر ابن کی کنج گلی میں اور امی جیسے مشہور افسانے شامل ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں "اجلے پھول" کے نام سے دوسرا افسانوی مجموعہ شائع ہوا۔ جس میں نو افسانے شامل ہیں۔ جن میں اجلے پھول، گڈریا، صفدر ٹھیلا، ایل ویرا، برکھا اور گل ٹریا قابل ذکر ہیں۔ اس کے لیے مقالے کو پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے۔

باب اول "موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث" ہے۔ آغاز میں موضوع کا تعارف بیان کرنے کے ساتھ ہی بیان مسئلہ اور تحدید کی گئی ہے اور تحقیق کے مقاصد، تحقیقی سوالات، پس منظر، مطالعہ، ماقبل تحقیق اور تحقیقی طریقہ کار کو واضح کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کردار کیا ہے اور کرداروں کی اقسام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ تحقیق بنیادی طور پر چونکہ افسانوں کے کرداروں کے حوالے سے ہے۔ لہذا کردار کا لغوی معنی اور اصطلاحی مفہوم واضح کیا گیا ہے۔ کردار کا مفہوم واضح کرنے کے ساتھ ساتھ کردار کی تعریف بیان کی گئی ہے اور کرداروں کی اقسام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ افسانہ نگار اشفاق احمد کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ان کی ادبی خدمات، مصروفیات اور اعزازات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

باب دوم "اشفاق احمد کے افسانوں کے مردانہ کردار" کے عنوان سے ہے۔ دوسرے باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں "ایک محبت سو افسانے" کے مردانہ کرداروں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ جسے مزید دو ذیلی عنوانات مرکزی کردار اور ضمنی کردار کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے دوسرے افسانوی مجموعے "اجلے پھول" کے کرداروں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اسے بھی مزید دو ذیلی عنوانات مرکزی کردار اور ضمنی کردار کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔

باب سوم "اشفاق احمد کے افسانوں کے نسوانی کردار" کے عنوان سے ہے۔ تیسرے باب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں "ایک محبت سو افسانے" کے نسوانی کرداروں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ جسے مزید دو ذیلی عنوانات مرکزی کردار اور ضمنی کردار کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے دوسرے افسانوی مجموعے "اُجلے پھول" کے نسوانی کرداروں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اسے بھی مزید دو ذیلی عنوانات مرکزی کردار اور ضمنی کردار کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔

باب چہارم: اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کے امتیازات کے نام سے ہے۔ اس باب میں اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کے امتیازات کا "عشقیہ و رومانوی کردار"، "مذہبی عناصر کے حامل کردار" اور "علمی و ادبی کردار" کے تحت جائزہ لیا گیا ہے۔ مختلف امتیازات کو واضح کرنے کے لیے کرداروں کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں تحقیق کا مکمل نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مجموعی جائزہ کے تحت تحقیق کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اس تمام تر تحقیق سے جو نتائج سامنے آئے ہیں ان کو "نتائج" کے تحت درج کر دیا گیا ہے۔ جبکہ تمام تحقیقی کاوش کو مد نظر رکھتے ہوئے سفارشات مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

Abstract

The title of my research thesis for M.Phil. Urdu is “A Study of the characters of Ashfaq Ahmad’s Short Stories”. Only two books of short stories (Aik Muhabat so Afsany & Ujaly Phool) have been taken in this discussion. These books have been published in ۱۹۵۱ and ۱۹۵۷. The purpose of this research is to study of Ashfaq Ahmad s’ thoughts and thinking about human life which was presented through characters of his short stories. The characters of Ashfaq Ahmad in the short stories have unique identity. The central characters and supporting Characters (Male and Female) of these short stories not only have helped us to understand these short stories but also provided their basic identities.

This research has been divided into five chapters. The first Chapter includes title “Introduction of the topic and basic discussion”. In the start of this chapter the introduction of topic has been described. After this problem statement and limitations of research has been mentioned. After that the objectives of research has been expressed. In this chapter a short discussion has been conducted about what is a Character and has also been discussed major types of characters in short stories. In the last portion of first chapter, it has also been described the personality of Ashfaq Ahmad and his contribution in Urdu literature.

The second chapter is “A Study of Male Characters in Short Stories” .This chapter has been divided into two sections and more two sub sections for discussion about central charters and supporting characters. This chapter also includes the study of central characters and supporting Characters (Male) of the both short story books.

Third chapter’s title is “A Study of Female Characters in Short Stories” .This chapter has also been divided into two sections and more two sub sections for discussion about central characters and supporting characters. This chapter also includes the study of central characters and supporting characters (Female) of the both short story books.

Forth Chapter is a “Major Identities of characters in Short Stories” .In this chapter discussion launched under three main points Romantic characters, Religious elements in characters and Educational & Literary characters. In this chapter a study and thoroughly discussion have been made about major identities of characters and influence of characters has also been debated.

In the Fifth Chapter an overall analysis has been made. This chapter is based on a comprehensive study, conclusions and reconditions deduced as a result of the overview of the discussion in the first fourth chapters, reaching a summarize and compiling a few suggestions at the end.

مقالہ کا مقصد

یہ تحقیقی مقالہ بعنوان "اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کا مطالعہ (منتخب مجموعوں کے حوالے سے)" ہے۔ کسی بھی کہانی، افسانے اور ناول میں کردار مرکزی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کرداروں کی بنیاد پر ہی کوئی تخلیق کار اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے منطقی انجام تک پہنچاتا ہے۔ اشفاق احمد کی افسانہ نگاری کے حوالے سے دیکھا ہے کہ انھوں نے جو بے مثال، یادگار اور شاہکار افسانے لکھے اس میں ان کے کرداروں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کے کئی کردار شہرت عام حاصل کر چکے ہیں۔ زیرِ نظر تحقیقی مقالے کا مقصد اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے کرداروں کے اوصاف، خصائص، انداز، لب و لہجہ، حقیقی، غیر حقیقی ہونے کو سامنے لانا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کرداروں کی انفرادیت اور امر ہو جانے کا بھی جائزہ لینا مقصود ہے۔

اس تحقیقی مقالے کا ایک مقصد کا یہ بھی ہے کہ اشفاق احمد جنھوں نے بطور افسانہ نگار اپنی مخصوص شناخت قائم کی ہے، کے افسانوں میں کردار نگاری کی مختلف جہات کو سامنے لانا ہے۔ اردو ادب میں افسانہ نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اشفاق احمد کے افسانے ان کے فن کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہمیں وہ اپنے فن کی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے معاشرتی مسائل پر قلم اٹھایا ہے اور انھیں منظر عام پر لائے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے حالات سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کا ہاتھ زمانے کی نبض پر تھا۔ ان کے افسانوں میں انسانی رشتوں، محبت، مذہب اور علم و ادب کو ایک نئے انداز سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے افسانے سبق آموز اور موثر ہونے کی بنا پر ان کی حیثیت کو اور نمایاں کر دیتے ہیں۔ انھوں نے معاشرے کے تمام طبقات اور ہر نوع کے کرداروں کو اپنی کہانیوں میں جگہ دی ہے۔ ان کے افسانے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں کرداروں کے ذریعے حقیقی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ اس لحاظ سے اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کا مطالعہ بہت ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ان کو ادبی دنیا کے سامنے لایا جاسکے۔

اظہار تشکر

اس مقالے کی تکمیل کے لیے خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا اور بے حد شکر گزاری واجب ہے جس ذات کے خاص کرم کی بدولت یہ کام بروقت پایہ تکمیل تک پہنچا۔ بے حد بے شمار درود و سلام حضرت محمد ﷺ خاتم النبیین کی ذات اقدس پہ، جن کی محبت مسلمانوں کا فخر اور اثاثہ ہے۔ ازاں بعد شکریہ واجب ہے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کی صدر شعبہ اردو ڈاکٹر روبینہ شہناز، رابطہ کارڈاکٹر فوزیہ اسلم اور واجب التکریم اساتذہ کرام کا، جن کی شفقت و محبت ہر لمحہ مجھے میسر رہی اور جن کی علمی قابلیت، پیشے سے لگن اور وابستگی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ خاص طور پہ نگران مقالہ ڈاکٹر نعیم مظہر کا انتہائی ممنون اور شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے ابتدا سے اب تک ہر قدم پر میرا ساتھ دیا، ہر ہر مرحلے پر ان کی شفقت و رہنمائی میرے شامل حال رہی اور مجھے جس وقت بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی وہ میری مدد اور مشفقانہ رہنمائی کے لیے موجود اور دستیاب رہے۔ چاہے وہ موضوع کا انتخاب ہو، خاکہ کی تیاری ہو، مواد کا حصول ہو یا دیگر فنی و تکنیکی باریکیاں۔ ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی بدولت یہ تمام مراحل آسانی سے طے ہوئے۔ اگرچہ ان کی شفقتوں اور عنایات کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔ والدین کی دعائیں ان تمام مراحل میں میرے ساتھ رہیں جن کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ اُن کا سایہ تادیر ہمارے سر پہ رکھے۔ امین۔ جن کا اس دنیا میں کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ ساتھی اسکا لرز محمد حنیف، محمد جمیل، سدرہ طاہر اور قاضی سلطان محمود سمیت میں تمام دوست احباب کا شکر گزار ہوں جن کے قیمتی مشورے، نیک خواہشات اور حوصلہ افزائی مجھے میسر رہی۔ خاص طور پہ شفیق دوست تیمور اختر کا جنھوں نے ایم اے اردو کے بعد ایم فل کے لیے نہ صرف تحریک دی بلکہ استفادہ کے لیے اپنی لائبریری اور کتب کا ذخیرہ میرے حوالے کر دیا۔ اور جب بھی میں نے کام اور رہنمائی کے سلسلے میں ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے انتہائی خلوص اور مروت کا برتاؤ کیا۔

اپنے بہن بھائیوں و دیگر اہل خانہ کا میں ضرور شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے یکسوئی سے کام کرنے کے لیے ماحول فراہم کیا اور دیگر مصروفیات سے بری الذمہ کیا اور میرے کام کے حوالے سے مجھے تحریک دی تاکہ میں جلد از جلد اپنا کام مکمل کر سکوں۔ اللہ تعالیٰ تمام کو جزائے خیر دے۔ امین

عرفان طارق

اسکا لر ایم فل اردو

باب اول

الف:- موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

موضوع کا تعارف

اردو ادب کی تاریخ جن شخصیات کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی ان میں اشفاق احمد کا نام بھی شامل ہے۔ ہمہ جہت شخصیت کے مالک اشفاق احمد (۱۹۲۵ء تا ۲۰۰۴ء) نے بطور افسانہ نگار، ناول نگار، مترجم، سفر نامہ نگار، ڈرامہ نگار، فلم ساز، ہدایت کار، ریڈیو میزبان، مدیر اور داستان گو کے طور پر اردو ادب کے لیے بے مثال و بے نظیر خدمات سر انجام دیں۔ ان کو معاصرین کے ہاں ممتاز اور منفرد مقام حاصل تھا۔ اشفاق احمد کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کا بطور مفکر، مصلح اور دانشور شہرت حاصل کرنا ہے۔ بطور افسانہ نگار ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ان کے افسانے گڈریا، تلاش، پناہیں اور عجیب بادشاہ وغیرہ منظر عام پر آئے اور جہاں عوام میں خاصے مقبول ہوئے وہیں پر فنی و موضوعاتی اعتبار سے ادیبوں اور نقادوں کے ہاں بھی پذیرائی حاصل کی۔ ابتدائی ایام میں ہی مقبولیت اور پذیرائی کے سبب اشفاق احمد نے اس صنف میں مزید کام کیا اور کئی شاہکار افسانے لکھے۔ ان کے اب تک پانچ افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں ایک محبت سو افسانے (۱۹۵۱ء) اُجلے پھول (۱۹۵۵ء) بھلکاری (۱۹۹۱ء) طلسم ہوش افزا (۱۹۹۸ء) اور افسانے صبحانے (۲۰۰۲ء) شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے سماج میں موجود حقیقی کرداروں کے ذریعے افسانوں میں رنگ بھرا ہے۔ ان کے کرداروں میں کرایہ دار، قاتل، معالج، فقیر، دیہاتی، ملزم، سرکاری ملازم، ٹیچر، آڑھتی، میاں بیوی، پروفیسر، بنک مینجر، مزدور، مویشی چرانے والا، طالب علم، جواری الغرض ہر نوع اور قسم کے کردار شامل ہیں۔ مجوزہ تحقیقی کام اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کا مطالعہ ہے جس میں ان کے منتخب افسانوی مجموعوں ایک محبت سو افسانے (۱۹۵۱ء) اور اُجلے پھول (۱۹۵۵ء) کے کرداروں کا مطالعہ کیا جائے گا۔ ان کے مرکزی کردار، معاون کردار، غیر اہم کردار، منفی کردار، ابنارمل کردار، مختلف پیشوں اور پس منظر کے حامل کرداروں کو زیر بحث لاتے ہوئے بطور خاص کردار نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے گا کہ ادبی، فنی اور تکنیکی اعتبار سے اشفاق احمد کے کرداروں کی کون کون سی خصوصیات اور اوصاف ہیں جو ان کے افسانوں کے کرداروں کو دیگر افسانہ نگاروں سے ممتاز اور منفرد حیثیت دلاتی ہیں۔

بیان مسئلہ

کسی بھی کہانی، افسانے اور ناول میں کردار مرکزی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کرداروں کی بنیاد پر ہی کوئی تخلیق کار اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے منطقی انجام تک پہنچاتا ہے۔ اشفاق احمد کی افسانہ نگاری کے حوالے دیکھا جائے تو انھوں نے جو بے مثال، یادگار اور شاہکار افسانے لکھے ان میں ان کے کرداروں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کے کئی کردار شہرت عام حاصل کر چکے ہیں۔ مجوزہ تحقیق میں اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کو زیر بحث لاتے ہوئے کرداروں کے اوصاف، خصائص، انداز، لب و لہجہ، حقیقی، غیر حقیقی ہونے کو زیر تحقیق لایا جائے گا۔ اسی کے ساتھ ساتھ کرداروں کی انفرادیت اور امر ہو جانے کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

- ۱۔ اشفاق احمد کی افسانہ نگاری مقالہ نگار ثمنہ شہباز ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی ۱۹۹۲ء
- ۲۔ اشفاق احمد کے مطبوعہ ڈرامے ایک جائزہ مقالہ نگار رحیلہ پروین ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی ۲۰۰۳ء
- ۳۔ اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور ممتاز مفتی کے افسانوی ادب میں جہان مردوزن از انجم نورین ایم فل بی زیڈ یو ملتان ۲۰۰۴ء
- ۴۔ کھیل تماشا اور حاصل گھاٹ کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ مقالہ نگار عزیزہ سعید ایم اے جی سی نیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء
- ۵۔ اشفاق احمد اور منشیاد کی تخلیقی نثر میں پنجابی زبان اور اسلوب کا اثر مقالہ نگار نادیہ انجم ایم فل بی۔ زیڈ۔ یو ملتان ۲۰۰۶ء
- ۶۔ اشفاق احمد کی افسانہ نگاری (اجلے پھول کے حوالے سے) مقالہ نگار دُر نایاب ایم اے نمل اسلام آباد ۲۰۱۲ء
- ۷۔ اشفاق احمد کے ڈراموں میں عائلی زندگی کی عکاسی مقالہ نگار منزہ اسماعیل ایم فل ایجوکیشن یونیورسٹی لاہور ۲۰۱۷ء

تحقیق کی اہمیت

اشفاق احمد نامور ادیب اور لکھاری ہیں۔ اسی ناطے سے ان پہ بہت زیادہ کام ہو چکا ہے اور کئی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن افسانوں میں کرداروں کے حوالے سے کام نہیں کیا جاسکا ہے۔ چونکہ اردو افسانے میں کردار نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اشفاق احمد کے افسانوں میں کردار ایک خاص صورت میں نظر آتے ہیں۔ ان کے معاصرین اور ناقدین کی آراء کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی کئی مقام پہ اعتراف کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ پلاٹ کی بجائے کرداروں پہ توجہ مرکوز کیے ہوتے ہیں۔ اور کردار بھی معاشرے کے حقیقی، جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے۔ اشفاق احمد کرداروں کے ذریعے ہی کہانی کو مرتب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے معاشرے کے تمام طبقات اور ہر نوع کے کرداروں کو اپنی کہانیوں میں جگہ دی ہے۔ ان کے افسانے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں کرداروں کے ذریعے حقیقی زندگی کی عکاسی کی ہے۔

اس لحاظ سے اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کا مطالعہ بہت ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ان کو ادبی دنیا کے سامنے لایا جاسکے۔ اس حوالے سے یہ تحقیقی کام بہت اہمیت کا حامل ہوگا۔

تحدید

اشفاق احمد ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں۔ ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کے حوالے سے کافی کام ہو چکا ہے۔ مجوزہ تحقیق ان کے افسانوں کے کرداروں تک ہی محدود رہے گی۔ نیز ان کے تمام افسانوں کی بجائے صرف منتخب افسانوی مجموعوں کی کردار نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے کردار نگاری کو مختلف پہلوؤں سے دیکھتے ہوئے زیر تحقیق لایا جائے گا۔

مقاصد تحقیق

مجوزہ تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیش نظر ہوں گے۔

- ۱۔ اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کی انفرادیت کو سامنے لانا۔
- ۲۔ اشفاق احمد کے افسانوں کے مرکزی کرداروں میں حقیقی رنگ تلاش کرنا۔
- ۳۔ اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کا ادبی اور مذہبی پس منظر دیکھنا۔

تحقیقی سوالات

مجوزہ تحقیق میں درج ذیل سوالات پیش نظر ہوں گے۔

- ۱۔ اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کی انفرادیت کیا ہے؟
- ۲۔ اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کے امتیازات کیا ہیں؟
- ۳۔ اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کا ادبی اور مذہبی پس منظر کیا ہے؟

نظری دائرہ کار

اردو افسانے میں کردار نگاری کو خاص اہمیت اور مقام حاصل ہے۔ کرداروں کے ذریعے ہی افسانہ نگار زندگی سے متعلق اپنا مشاہدہ اور تجزیہ پیش کرتا ہے۔ مجوزہ تحقیقی کام میں اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کا مطالعہ اس پہلو سے کیا جائے گا کہ ان کے افسانوں کے کرداروں کے امتیازات کو بطور خاص سامنے لایا جاسکے۔

پس منظر کا مطالعہ

کوئی بھی تخلیق کار کردار کے بغیر اپنی کہانی مکمل نہیں کر سکتا ہے۔ کسی بھی افسانوی نثر پارے کی تخلیق میں پلاٹ، مکالمے، واقعات، منظر نگاری کے ساتھ ساتھ کردار بھی افسانے کے اجزاء میں اہم مقام کے حامل ہوتے ہیں۔ اشفاق

احمد کے کردار نہ صرف یہ کہ اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں بلکہ یہ کرداروں کو اس طرح تراش خراش کر کے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ وہ افسانے کی جان اور اس کی پہچان بن جاتے ہیں۔ ذاتی تجربے اور گہرے مشاہدے کے بغیر کرداروں کی بجائے محض کٹھ پتلی تو پیش کی جاسکتی ہے مگر حقیقی انداز میں کردار نہیں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ کرداروں کی پیشکش کو افسانوی ادب میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔

مجوزہ تحقیق اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کے مطالعے کے حوالے سے ہے۔ اشفاق احمد کی خدمات پہ جامعاتی سطح کے ساتھ ساتھ انفرادی طور پہ بھی بہت کام کیا جا چکا ہے۔ اس حوالے سے کیا گیا تحقیقی و تنقیدی کام پس منظر کی مطالعہ میں شامل ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری میں کردار نگاری اور اسی موضوع پہ لکھی گئی دیگر کتب و مضامین بھی زیر مطالعہ رہیں گی۔

تحقیقی طریقہ کار

مجوزہ تحقیقی کام کے لیے دستاویزی طریقہ تحقیق اپناتے ہوئے بنیادی ماخذات کے ساتھ تاریخی و تنقیدی کتب سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ بوقت ضرورت دیگر طریقہ ہائے تحقیق کو بھی اختیار کیا جاسکے گا۔ مطبوعہ و غیر مطبوعہ مواد کی جمع آوری کی جائے گی۔ سرکاری، جامعاتی و نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا جائے گا۔ انسائیکلو پیڈیا، انٹرنیٹ، پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا، انٹرویوز، کانفرنس، سیمینار، تحقیقی رسائل و جرائد و دیگر دستاویزات سے استفادہ کیا جائے گا۔

ب:- کردار کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ قرار دیا ہے۔ تمام مخلوقات میں جو بنیادی خصوصیات، خوبیاں اور اوصاف حضرت انسان کو ممتاز مقام دلوانے کا باعث ہیں۔ ان میں زبان یعنی بولنا، با معنی بولنا شعور اور اختیار۔ یعنی انسان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بول، سن اور سمجھ سکتا ہے اور شعوری و غیر شعوری طور پر کچھ سوچنے اور عمل کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور صورت حال و سوجھ بوجھ کے مطابق عمل کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ انسان اپنی یہی بولنے اور سوچنے کی صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے اپنے احساسات، جذبات اور مشاہدات کو لفظوں کے قالب میں ڈھالنے کا اختیار رکھتا ہے۔ یہی احساسات، جذبات اور مشاہدات جب اعلیٰ دماغوں میں جگہ پاتے ہیں، پلتے ہیں اور نشوونما پاتے ہیں تو ان کا خوبصورت انداز میں اظہار باقی لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ یہی الفاظ خوبصورت تحریروں کی صورت میں ادب کی تشکیل کرتے ہیں۔

ادب کسی بھی قوم کا سرمایہ ہوتا ہے۔ ادبی تحریروں میں اعلیٰ و ارفع مضامین، خیالات موزوں لفظوں اور جملوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں جس میں عام لوگ متاثر اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ادب لطیف پیرائے میں انسانی جذبات، احساسات اور مشاہدات کے اظہار کا دوسرا نام ہے۔ ادب ہئیت، روپ، صورت، وضع قطع، موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے مختلف اقسام اور اصناف پر مشتمل تخلیقات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ادب میں انسانی احساسات و جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ ادب بہترین اور موزوں الفاظ کی مدد سے اپنا مافی الضمیر لوگوں تک پہنچانے کا نام ہے۔ ایک ادیب اپنی تخلیق کے ذریعے لوگوں تک اپنی فکر اور سوچ پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے سماج، معاشرے اور حالات و واقعات سے جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے۔ اسے اپنی تخلیق کے ذریعے عوام الناس کے سامنے لے آتا ہے۔ اس مقصد کے لیے عموماً بڑی اقسام رواج پذیر ہیں۔ الف نظم۔ ب نثر

نثر میں قواعد، صرف و نحو، گرامر وغیرہ کا خیال رکھتے ہوئے جملہ معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں مگر شاعری میں اس کے ساتھ ساتھ دیگر شعری لوازمات کا خیال رکھا جاتا ہے مثلاً قافیہ، ردیف، استعارہ، تشبیہ، بحر، وزن، صوتی و صورتی آہنگ وغیرہ۔ جس طرح شاعری میں ہئیت اور موضوع کے اعتبار سے مختلف اقسام پائی جاتی ہیں مثلاً غزل، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، نعت اور گیت نگاری وغیرہ اسی طرح اسلوب، ہئیت اور موضوع کے اعتبار سے بہت سی اقسام اور اصناف نثری ادب میں رواج پذیر ہیں مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامہ، آپ بیتی، کالم نویسی، مکتوب نگاری، سوانح عمری، تذکرہ نویسی، مضمون نگاری، مزاح، سفر نامہ، سیرت، تفسیر، رپورتاژ وغیرہ۔ ان تمام اصناف ادب میں شعراء، ادیبوں اور تخلیق کاروں نے اپنے اپنے حصے کی خدمات کے ذریعے اردو ادب کے سرمائے کو وسعت بخشی ہے۔ مختلف اصناف ادب کو

وقت کے ساتھ ساتھ جہاں مقبولیت اور پذیرائی میں اضافہ نصیب ہوا۔ وہیں پر مختلف اصناف ادب ارتقائی مراحل سے گذرتے ہوئے آج بہترین صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ نثری اصناف ادب میں داستان، ناول اور افسانہ زیادہ معروف نظر آتی ہیں۔ اردو افسانہ بیسویں صدی کے اوائل میں لکھا جانے لگا۔ اس سے پہلے داستان اور ناول خاصی مقبول نثری اصناف تھیں۔ "داستان سے افسانے تک" میں سید وقار عظیم افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت کا مظہر بنا۔ کسی ایک واقعہ، ایک جذبے، ایک احساس، ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک روحانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو۔ افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا ہے۔^۱

قصہ، کہانی سننا انسان کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور انسان شروع سے ہی قصے کہانیاں سنتا سنا رہا ہے۔ قصہ گو اور داستان گو کو قدیم معاشرے میں اہم مقام اور حیثیت حاصل رہی ہے۔ قصہ گو، داستان گو موقع محل کی مناسبت سے مبالغہ آرائی، لفاظی، مافوق الفطرت عناصر کو بھی داستانوں میں شامل کرتے رہے ہیں۔ داستان سے ناول اور افسانے تک کا ارتقائی سفر انیسویں صدی میں طے ہوا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مغربی صنف Short Story کی طرز پر اردو میں افسانہ نویسی شروع ہوئی۔ اس ضمن میں انور جمال لکھتے ہیں۔

افسانہ داستان کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ داستان جو مافوق الفطرت اور غیر عقلی واقعات کا پلندہ تھی۔ نسبتاً حقیقی شکل میں ناول بنی اور پھر بیسویں صدی کے مشینی دور نے اسے مزید نکھار کر افسانہ بنا دیا۔ اگرچہ ناول اپنی جگہ ایک الگ صنف نثر کے طور پر بحال رہا۔^۲

واضح ہوتا ہے کہ افسانہ بہر حال ایک منفرد اور مختصر شکل کی ایسی کہانی ہے جو مغربی اثر کے نتیجے میں اردو ادب میں داخل ہوئی مگر اپنی الگ تھلگ شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ فنی، تکنیکی، موضوعاتی اور اسلوبی لحاظ سے اردو میں ابتدائی دور میں ہی شاہکار افسانے لکھے گئے جس کی بدولت افسانے کو مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوتی گئی۔ افسانہ، ناول اور داستان کو آگے بڑھانے والی تین بنیادی چیزیں ہوتی ہیں۔ پلاٹ، کردار اور منظر۔ ان تین اجزاء سے مل کر ہی کہانی تشکیل پاتی ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم اس ضمن میں رقم طراز ہیں۔

کہانی کی تشکیل میں ان ہی تین اجزاء میں سے کسی ایک کو مرکزی نقطہ بنا کر کہانی کا کہانی کی تشکیل کرتا ہے۔ کہانی کبھی پلاٹ کے ذریعے یعنی واقعیت کی بنیادوں پر بنی جاتی ہے تو کبھی کردار کہانی کا انکشاف کرتا ہے اور کبھی کبھی فضا کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے اور اس کے ذریعے کہانی بیان ہوتی ہے۔^۳

کردار کسی بھی افسانے کے اجزاء میں اہم مقام کا حامل ہوتا ہے۔ کردار کے ذریعے نہ صرف یہ کہ افسانہ نگار اپنی کہانی کو آگے بڑھاتا ہے بلکہ یہ اس کو اس طرح تراش خراش کر کے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے کہ وہ افسانے کی جان اور اس کی پہچان بن جاتے ہیں۔ ہر لکھاری یا قصہ گو کو کردار نگاری میں مہارت نہیں حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ اس فن میں ماہر وہ شخص ہو سکتا ہے جس کا مشاہدہ گہرا ہو اور وہ تجربہ کار ہو۔ زمانے کے حادثات سے گذرا ہوا ہو یا ان کو قریب سے ضرور دیکھا ہو۔ ایسا شخص جب کردار نگاری کرے گا تو منفرد اور بے مثال و لا جواب کردار سامنے لائے گا۔ ذاتی تجربے اور مشاہدے کے بغیر کردار کی بجائے محض کٹھ پتلی تو پیش کی جاسکتی ہے مگر حقیقی کردار نہیں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ کردار نگاری کو افسانوی ادب میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔ سید وقار عظیم اپنی کتاب "فن افسانہ نگاری" میں صرف کردار کو ہی افسانہ قرار دیتے ہیں۔ ایک مغربی ادیب کے حوالے وہ لکھتے ہیں۔

افسانہ کی فنی تعریف کرتے وقت ایک جگہ جیمس لن James Linns نے کہا ہے کہ افسانہ کسی

ایک کردار کی زندگی کے سب سے اہم موقع کو ڈرامائی صورت میں مختصر طور پر پیش کرنے کا نام ہے۔^۲

کردار محض کسی انسان کی زندگی کا واقعہ ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ لکھاری اپنے تخیل کی مدد سے اس کو اپنی مرضی سے کہانی اور حالات کے مطابق موڑتا رہتا ہے۔ جس سے کہانی نہ صرف اپنے انجام تک با آسانی پہنچ جاتی ہے بلکہ قارئین کی دلچسپی برقرار رکھنے کا باعث بھی ہوتی ہے۔

کردار کا لفظ انگریزی کے لفظ کیریکٹر کا ترجمہ ہے۔ انگریزی لفظ کیریکٹر لغوی، اصطلاحی، حقیقی اور مجازی لحاظ سے مختلف معنی دیتا ہے۔ اس لفظ کو اصطلاحی طور پر ہم جس معنی اور حیثیت سے استعمال کرتے ہیں یہ انگریزی ادب سے در آمد شدہ ہے۔ کردار لفظ موجود تھا اور کردار نگاری بھی ہو رہی تھی مگر بطور اصطلاح یہ مغرب کی دین ہے جسے ہمارے ہاں ادب اور تنقید میں رواج ملا۔ ڈاکٹر نجم الہدیٰ اپنی کتاب "کردار اور کردار نگاری" میں لکھتے ہیں۔

انگریزی میں کیریکٹر براہ راست یونانی χαρακτήρ سے مستعار ہے۔ جس کے معنی

ہیں نقش کرنا، کندہ کرنا (engraving)۔ اسی وجہ سے ابتدائے لفظ سکوں پر مہر لگانے کے

رنگ کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اس صورت کے لیے بھی جس سے مہر ہوتی تھی۔^۵

جیسا کہ بہت سی ادبی اصطلاحات اور الفاظ انگریزی میں یونانی زبان سے داخل ہوئے ہیں اسی طرح یہ لفظ بھی یونانی سے انگریزی زبان کا حصہ بنا۔ انگریزی زبان میں بطور اصطلاح کیریکٹر کے معنی ذیل کے ملتے ہیں۔

(۱) تعین سیرت (۲) تعین وصف (۳) کردار نگاری

Characterisation سیرت Character^۱

اردو ادب میں بھی کردار نگاری کسی فرد کی سیرت اور اس کے اوصاف کو بیان کرنا ہے۔ سیرت میں انسان کی جملہ خصوصیات شامل ہوتی ہیں۔ اس کے اوصاف کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ لکھاری انھی پہلوؤں کو مد نظر رکھ کے اپنے تخیل کے کرشمے دکھاتا ہے۔ کردار کی گفتگو، لب و لہجہ، انداز، وضع قطع، لباس، عادات و اطوار کو نکھار کر قارئین کے سامنے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ "The World Book of Encyclopedia" میں کردار کی تعریف اس طرح سے کی گئی ہے۔

Character is the principal material from which a plot is created. Incidents develop mainly through the speech and behaviour dramatic characters. The characters must be shaped to fit the needs of the plot and all parts of each characterization must fit together. ^۷

واضح ہوتا ہے کہ کردار ہی وہ بنیادی اور اہم شے ہے جس پر کوئی بھی پلاٹ تخلیق کیا جاتا ہے۔ واقعات بھی عام طور پر ڈرامائی کرداروں کے رویوں اور بات چیت و گفتگو سے ہی وجود میں آتے ہیں۔ کرداروں کو کہانی میں ایسی شکل و صورت دی جانی چاہیے کہ وہ پلاٹ کی ضرورت پوری کریں اور اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ ہر کردار کے تمام حصے اور اجزاء آپس میں باہم مربوط اور جڑے ہوئے ہوں۔ روزینتھال کی مرتب کردہ "Dictionary of Philosophy" (لغات سماجی علوم و فلسفہ) کے مترجم پروفیسر ڈاکٹر خیال امر و ہوی لفظ Character کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

حرکت اور عمل کے ذریعے کلیت اشیاء کی نفسیاتی خصوصیات انسانی رویوں کی رفتار اور ساخت، انسانی سوسائٹی کے رویے کی شناخت کا وسیلہ۔ سماجی نفسیات۔ اس کا وجود فطری طور پر نہیں ہوتا بلکہ ماحول، تعلیم و تربیت پر مشتمل ہوتا ہے۔ ^۸

مزید بحث کرتے ہوئے اسی حوالے سے Character in Arts کے ذیل میں یوں رقمطراز ہیں۔
فن کارانہ تشکیلات جو سماجی، ذہنی اور دیگر وسائل سے انسانی چال چلن میں نمودار ہوتی ہیں۔
مخصوص انسانی رویہ جو مخصوص حالات کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ آرٹ جمالیات کا متقاضی ہوتا ہے لہذا ہر انسانی رویہ آرٹسٹ کی کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ^۹

لفظ کردار بنیادی طور پر فارسی زبان کا لفظ ہے جو کہ اردو میں دو طرح سے استعمال میں آتا ہے۔ ایک تو بطور صفت جبکہ کسی فن میں آکر اسم فاعل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ "قاموس مترادفات" میں کردار کے معنی یہ درج ہیں۔ "چال چلن،

سیرت، فعل، کیریکٹر، طرز عمل، روش، عادت، وضع، کام، کار۔ ۱۰" اسی طرح اس لفظ کے اردو لغات میں لغوی معنی یہ درج ہیں۔

جامع اللغات:- روش، طور طریق، طرز، شغل، کام، دھندا، عمل، قاعدہ،

چلن، رویہ، مرکبات میں جیسے بدکردار۔^{۱۱}

فیروز اللغات:- کردار (ف۔ ا۔ مذکر) ۱۔ طرز۔ طریق ۲۔ چال چلن۔

کردکھانا (ہ۔ مص) ۱۔ عمل کر کے دکھانا ۲۔ انجام کو پہنچا دینا۔^{۱۲}

نسیم اللغات:- روش، چلن، عادت، کیریکٹر، ڈرامے وغیرہ کے نمایاں افراد۔^{۱۳}

فرہنگ عامرہ:- ایکٹ، کام، عمل، عرف، تشبیہ، مانند۔^{۱۴}

لغوی معنی کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ کردار ایک صفت ہے اور لفظ کردار جب بطور صفت استعمال ہوگا تو صفت بری بھی ہو سکتی ہے اور اچھی بھی۔ غرض کردار اپنے لغوی معنوں میں بطور صفت ہی مستعمل ہے۔ مثلاً اچھا کردار، برا کردار، کردار سازی وغیرہ لیکن یہ لفظ جب بطور اصطلاح استعمال کیا جاتا ہے تو معنی کچھ اور دیتا ہے۔ فن اور صنف میں یہ بطور اسم فاعل استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اچھائی یا برائی کا عمل کرنے والا۔ جب کسی فن پارے میں کسی شخص کو عملی طور پر چلتا پھرتا دکھایا جاتا ہے تو اسے ہی کردار کہا جاتا ہے۔ اس کی عادات و اطوار اور حرکات و سکنات سے اس کے عمل کی وضاحت ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ وہ کردار اچھا ہے یا برا۔ حقیقی یا غیر حقیقی، فطری وغیرہ کا تعین اسی سے کیا جاتا ہے۔ کردار کے لغوی معنی کے بعد بطور اصطلاح مفہوم کا جائزہ لیتے ہیں کہ اردو ادب میں کردار کن معنی اور مفہوم میں مستعمل ہے۔ ادبی اصطلاحات کا تعارف کراتے ہوئے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں۔

کردار Character کہانی کے واقعات جن افراد قصہ کو پیش آتے ہیں انہیں اصطلاح میں

کردار کہا جاتا ہے۔ ایسی ہر صنف ادب میں جس میں کہانی کا دخل ہو۔ لازماً کرداروں سے بھی

واسطہ پڑتا ہے۔^{۱۵}

بیان کردہ معانی کے مطالب و مفاہیم سے واضح ہوتا ہے کہ افسانے کے اجزاء میں کردار ایک اہم جز ہے جس کے بغیر کسی بھی افسانے کے نقوش اور خدوخال واضح طور پر ابھر کر سامنے آسکتے ہیں اور نہ کسی افسانے کی حقیقت اور اصلیت واضح کی جاسکتی ہے۔ کردار ہی وہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں جن کے ذریعے کوئی بھی تخلیق کار اپنی بات قاری تک پہنچا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے کردار نگاری بھی ایک اہم فن کارانہ صلاحیت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ کیونکہ جس ادیب اور تخلیق کار کو اس فن میں جتنی مہارت حاصل ہوگی اور جتنی خوبی سے کرداروں کو استعمال کرنا جانتا ہوگا۔ ادب پارہ اتنا ہی اعلیٰ ادبی مقام کا حامل

ہوتا چلا جائے گا۔ کردار نگاری ہے کیا؟ کسی انسان کی چال ڈھال، عادات و خصائل، شکل و صورت، اعمال افعال کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات و احساسات کی عکاسی میں حقیقت کارنگ بھرنا کہ اس کی شخصیت پوری طرح ابھر کر سامنے آجائے کردار نگاری کہلاتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کی اس فن میں مہارت کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مشاہدہ گہرا ہو، افراد و واقعات کا باریک بینی سے جائزہ لینے والا ہو۔ کسی بھی واقعہ یا سانحہ سے درست نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ کرداروں کے ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن پر بھی غور و فکر کرنے والا ہو اور ساتھ ساتھ اپنی معلومات، مشاہدات اور احساسات کو لفظوں کے قالب میں ڈھالنے کا فن جانتا ہو۔ ایسا ادیب بے مثال، لازوال اور یادگار کردار تخلیق کرنے پر قادر ہو سکے گا۔ چونکہ افسانہ ایک مختصر کہانی ہے اور اس میں بھی زندگی کے صرف کسی ایک ہی پہلو کو نمایاں طور پر بیان کیا جاتا ہے لہذا افسانہ نگار کے لیے اور بھی لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس فن یعنی کردار نگاری میں مہارت کا حامل ہو کیونکہ ناول، داستان یا ڈرامے میں تو کسی کردار کو تفصیلی طور پر پیش کرنے کی گنجائش ہوتی ہے مگر افسانے میں اس قدر تفصیلات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بالفاظ دیگر افسانہ نگار کے لیے کسی بھی کردار کو پیش کرنا مزید مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے کہانی کے محدود پہلو کو سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ کردار نگاری کی اہمیت سے کسی صورت انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بعض نقاد اور ادیب کرداروں کو ہی کسی فن پارے میں مرکزی اہمیت دیتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ ہنری جیمز کا ایک قول نقل کرتے ہیں۔ "کوئی تصویر یا ناول کیا ہے؟ اگر وہ کردار کے بارے میں نہیں ہے تو کردار کے علاوہ ہم ناول یا تصویر میں تلاش ہی کیا کرتے ہیں اور حاصل ہی کیا کرتے ہیں۔" ۱۶ افسانہ نگاری میں کردار نگاری ایک مشکل مرحلہ ہے۔ اسے افسانہ نگار کی آزمائش سمجھا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ کردار نگاری کے سلسلے میں افسانہ نگار بہت سی پابندیوں میں قید ہوتا ہے۔ اس کے کردار اُن خصوصیات کے حامل ہوں جن کے لیے انہیں پیش کیا جا رہا ہے۔ بادشاہ، غلام، کنیز، ملکہ، استاد، شاگرد، تاجر، مزدور الغرض جو بھی کردار دیا جائے اس میں فطرت اور حقیقت کی جھلک ضرور نظر آنی چاہیے۔ ورنہ کرداروں میں تضاد پیدا ہونے کا خدشہ رہتا ہے اور اسے اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔

کسی بھی افسانے میں کردار، پلاٹ، منظر کشی اور کہانی کا حسین امتزاج ہمیں ملتا ہے۔ افسانہ نگار کبھی کہانی میں کردار کو تو کبھی قصے کہانی کو نمایاں کرتا ہے۔ کبھی واقعات کو نمایاں دکھایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں۔

جن میں قصہ و کردار نمایاں ہوں۔ اس کی صورت یہ کہ کردار، قصہ کے تسلسل اور اس کے ہر واقعہ سے اثر پذیر ہوتے دکھائے جائیں یعنی نہ تو وہ کٹھ پتلیوں کی طرح قصے کی مختلف ڈوروں سے بندھے ہوئے، نہ چپے ہوئے دکھائے جائیں اور نہ ہی ان کی انفرادیت اس قدر گہری ہو جائے کہ وہ قصہ کے واقعات سے بالاتر ہوں۔^{۱۷}

اسی طرح افسانہ نگار کرداروں کو ایسا مجسم اور پیکر مہیا کرتا ہے کہ وہ زندہ اور متحرک کھائی دینے لگتے ہیں اور کرداروں کا انفرادی پہلو اس طرح سے واضح کیا جاتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کردار، منظر یا پس منظر کا محتاج نہ رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کردار ایسا گونگا بھی نہ ہو کہ وہ کسی دکھ، تکلیف، کرب کو برداشت کرتا چلا جائے اور رد عمل کے اظہار پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ داخلی کرب کا اظہار کردار کے لب و لہجے، گفتگو، عمل اور حرکات و سکنات سے جھلکنا چاہیے۔ ویسے تو کردار کو مجسم صورت میں پیش کرنا ایک تخلیق کار اور افسانہ نگار کی تخیل کا ہی مرہون منت ہوتا ہے مگر چند ایک ضروری اجزاء ایسے بھی ہیں جن کا یہاں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ اجزاء جن سے مل کر کوئی بھی کردار ترتیب پاتا ہے یا یہ اجزاء بحیثیت مجموعی اس کردار کی تشکیل و تعمیر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کتاب "کردار اور افسانے" میں کیا گیا ہے۔

اشخاص قصہ کے نام، اشخاص قصہ کی ظاہری بناوٹ، کردار نگاری میں لباس کی اہمیت، اشخاص قصہ کے غیر اختیاری افعال، اشخاص قصہ کی گفتگو کا طرز، مشابہت اور انفرادیت، براہ راست اور بتوسط کردار نگاری، اجتماعی کردار نگاری۔^{۱۸}

واضح ہوتا ہے کہ کرداروں کے نام رکھنے میں احتیاط اور فنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح کرداروں کی ظاہری بناوٹ اور لباس کا بھی بطور خاص خیال رکھنا اشد ضروری ہے۔ کرداروں کا انداز گفتگو بھی بہت زیادہ کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ان کو کسی کے ساتھ مشابہت دی جائے یا ان کی انفرادیت کو مد نظر رکھا جائے تب بھی ان میں حقیقت اور اصلیت نظر آنی چاہیے۔ اسی طرح دیگر بہت سے فنی لوازمات ہیں جن کا پیش نظر رہنا ایک افسانہ نگار کے لیے بہت ضروری ہے تاکہ ادبی لحاظ سے فنی و تکنیکی طور پر کوئی کمی بیشی یا سقم باقی نہ رہے۔

ج: کردار کی اقسام

ناول، افسانہ، داستان اور ڈرامہ ایسی نثری اصناف ہیں جو مکمل طور پر کرداروں سے آراستہ ہوتی ہیں۔ کردار اس کی جان ہوتے ہیں۔ ہر صنف میں کردار کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں۔ ناول میں موضوعاتی وسعت کی بنا پر ناول نگار کو آزادی حاصل ہوتی ہے جبکہ افسانہ چونکہ مختصر کہانی ہوتی ہے لہذا افسانہ نگار کا انتخاب اور آزادی بھی محدود ہی ہوتی ہے اور اسی کے اندر رہ کر ہی وہ کردار نگاری کے جوہر دکھاتا ہے اور ان میں حقیقت کا رنگ بھر کے انھیں امر کر دیتا ہے۔ جس طرح افسانہ موضوع، تکنیک، اسلوب اور فنی اعتبار سے ایک جیسا نہیں ہوتا ہے اسی طرح اس میں شامل تمام کے تمام کردار بھی ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔ چونکہ افسانہ نگار کردار حقیقی زندگی اور اپنے معاشرے سے ہی لیتا ہے تو جس طرح معاشرے میں تمام افراد ایک جیسی صلاحیت اور اہلیت کے مالک نہیں ہوتے ہیں اسی طرح افسانے کے کردار بھی ہر لحاظ سے دوسرے کرداروں سے مختلف اور امتیازی پہلو لیے ہوتے ہیں۔

فن کردار نگاری کی مہارت یہ ہے کہ کردار زندگی اور حقیقت سے قریب تر اور قرین قیاس معلوم ہوں۔ زندگی سے بھرپور، دلچسپ اور جیتے جاگتے ہوں۔ ہر فن پارے میں کئی قسم اور انواع کے کردار ملتے ہیں۔ کرداروں کے عمل اور حرکات و سکنات سے ہی ان کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں۔ کرداروں کی اقسام اور درجہ بندی کئی لحاظ سے کی جاسکتی ہے۔ مثلاً بلحاظ پیشہ، بلحاظ موضوع، بلحاظ ہئیت، بلحاظ ذات پات، طبقاتی فرق، بلحاظ عمر، بلحاظ جنس وغیرہ۔ بلحاظ جنس دیکھا جائے تو کرداروں کی دو اقسام سامنے آتی ہیں مردانہ کردار اور نسوانی کردار۔ مزاج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو سنجیدہ کردار، المیہ کردار اور مضحکہ خیز یا مزاحیہ کردار سامنے آتے ہیں۔ فنی طور پر افسانے میں کرداروں کی تقسیم عموماً دو طرح سے کی جاتی ہے۔ مرکزی کردار اور ذیلی یا ضمنی کردار۔ اسی طرح حقیقی، اصلی، نقلی بھی فن کے اعتبار سے ہی اقسام تصور کی جاتی ہیں۔ ناول یا افسانے میں اثر پذیری اور اثر اندازی کے حوالے سے دیکھا جائے تو محدود کردار، سپاٹ کردار، ادھورے کردار، اور مکمل کردار سامنے آتے ہیں۔ ہئیت اور تکنیک کے اعتبار سے دیکھا جائے مرکب کردار، اکھرے کردار، پہلو دار کردار یا پیچیدہ کردار اس قسم میں شامل ہیں۔ کرداروں کی بنیادی اقسام کے حوالے سے سید عابد علی عابد لکھتے ہیں۔

کردار اصلاً دو اقسام کے ہوتے ہیں ایک ٹائپ یا جامد دوسرے ڈرامائی یا متحرک۔ جو کردار ٹائپ ہوتے ہیں وہ کسی طبقے کی، گروہ کی یا کسی معاشرتی جماعت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی سیرت ماہ و سال کے سانچوں میں ڈھل کر پختہ ہو جاتی ہے اور ان کا کردار اس اعتبار سے جامد ہوتا ہے کہ زندگی کے بدلتے ہوئے متغیرات کا ساتھ نہیں دیتے۔ ناول میں ایسے کردار کوئی غیر متوقع کام نہیں کرتے۔ ہمیں پہلے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ خاص

حالات میں ان کا رد عمل کیا ہوگا۔ دوسری قسم کے کردار جنہیں ڈرامائی کہا جاتا ہے بامتناہی واقعات کے فشار سے متاثر ہو کر بدلتے رہتے ہیں۔^{۱۹}

چونکہ کردار کسی بھی افسانے کا لازمی جزو ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں افسانے میں موجود ہوتے ہیں اور افسانے کے اندر یا پس منظر میں رہ کر انتہائی اہم رول ادا کرتے ہیں اس لیے افسانہ نگار کردار نگاری میں نہایت عرق ریزی اور فنی مہارت کو بروئے کار لاتا ہے۔ کیونکہ کہانی بھی دو طرح سے ہی آگے بڑھ سکتی ہے یا تو واقعاتی انداز میں یا پھر کرداری لحاظ سے۔ واقعاتی انداز میں واقعہ کے بعد واقعہ کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھایا جاتا ہے جبکہ کرداری لحاظ سے کہانی کو کرداروں کے ذریعے آگے بڑھایا جاتا ہے۔ جب کہانی کو کرداروں کے ذریعے ہی بڑھایا جاتا ہے تو کرداروں کی کئی اقسام سے واسطہ پڑتا ہے۔ قارئین کو بوریث سے بچانے کی خاطر اور ان کی دلچسپی برقرار رکھنے کی خاطر افسانہ نگار کئی قسم کے کرداروں کو افسانے میں متعارف کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش نے کرداروں کی مندرجہ ذیل اقسام بیان کی ہیں۔

- الف۔ اخلاقی و اصلاحی اور خیر و شر کے زاویے سے کردار نگاری، ب۔ مزاحیہ کردار نگاری،
- ج۔ تخیلی و رومانی کردار نگاری و حقیقت پسندانہ کردار نگاری، د۔ نفسیاتی و جنسی کردار نگاری،
- س۔ نسوانی کردار نگاری۔^{۲۰}

اردو افسانہ نگاری کی ابتدا کا جائزہ لیا جائے تو ان ہی اقسام کے کردار ہمیں نظر آتے ہیں۔ گو کہ اس سے پہلے داستان میں جو کردار پیش کیے جاتے تھے ان میں جن، بھوت، پری، چڑیل، جادوگر، ساحر، دیو وغیرہ کے کردار شامل ہیں۔ قدیم داستانوں میں غیر فطری کرداروں کی بھرمار نظر آتی ہے مگر اردو افسانے کی ارتقا کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اردو افسانے میں غیر فطری کرداروں کی شمولیت کم سے کم رہی ہے یا نہ ہونے کے برابر رہی ہے۔ اس کی وجوہات میں جہاں انگریزی تراجم نے اہم کردار ادا کیا ہے وہیں پر اُس دور میں چلنے والی مذہبی، سیاسی اور فکری تحریکیں بھی شامل ہیں۔ جن کی بدولت جنوں پریوں کا طلسم ٹوٹے لگا تھا اور ان کی جگہ سیاسی و سماجی شعور نے لے لی۔ ابتداء میں اسمائے صفت کے ذریعے کرداروں کی پیش کش کا چلن عام ہوا۔ مولوی نذیر احمد اور علامہ راشد الخیری نے ابتداء میں جو افسانے اور ناول لکھے ان میں اخلاقی اور اصلاحی پہلو واضح اور نمایاں ہوتا تھا تو ان کے کردار بھی اصلاحی اور اخلاقی زاویے سے سامنے آتے تھے۔ وہ تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد کا کردار نصوح اس کی بہترین مثال ہے جس میں اعلیٰ انسانی اوصاف اور خصائل کو بطور نمونہ پیش کیا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی کو بھی افسانے کے کرداروں کے ذریعے نمائندگی دی جانے لگی مثلاً مزدور، کسان، موچی، سیٹھ، کلرک، کوچوان، بھکاری، استاد، مولوی، نمبردار، قلی، بیوہ، یتیم وغیرہ۔ ان مختلف طبقات اور پیشوں کے نمائندہ کرداروں کے ذریعے سے معاشرے کے حقیقی اور جیتے جاگتے کرداروں

کو چنا گیا۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی کی اونچ نیچ اور مشکلات و مصائب کو بیان کیا گیا اور معاشرے کی اصل تصویر سامنے لانے کی کوشش کی گئی۔ نیز ظلم و ستم اور جبر کی کہانیاں جو معاشرے میں کسی صورت سامنے نہ آسکتی تھیں ان کو قلم کے ذریعے سامنے لایا گیا۔ اسی کے ساتھ تخیلی کرداروں کو بھی پروان چڑھایا گیا جو کہ عموماً رومانیت کے زیر اثر ہی رہے۔ ایسے کردار محبت اور جنس کی مختلف کیفیتوں اور صورت حال کو واضح کرنے کا سبب بنے۔ چونکہ مغربی تراجم کے زیر اثر مشرقی علوم میں نفسیات جیسے علم سے بھی لوگوں کو آگاہی حاصل ہونا شروع ہوئی تو نفسیاتی الجھنوں، ناآسودگیوں اور باطنی کشمکش کو بھی کرداروں کے ذریعے سامنے لانے کی شعوری کوشش کی جانے لگی۔ منٹو، عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی جیسے افسانہ نگاروں کے نام اس ضمن میں لیے جاسکتے ہیں۔ اسی دوران برصغیر پاک و ہند میں تقسیم عمل میں آئی اور اردو افسانے میں کرداروں کی ایک نئی کھیپ داخل ہوئی۔ اردو افسانے کو موضوعاتی لحاظ سے وسعت ملی۔ جہاں فسادات، بے وطنی اور گھروں کے جڑنے کی داستانیں افسانے میں داخل ہوئیں۔ وہیں پر تقسیم کے عمل نے کئی نئے کرداروں کا اضافہ کیا۔ ظلم و تشدد، یاد ماضی، ہجرت، بے سروسامانی کے ساتھ سفری صعوبتوں کا سامنا، تاریخ کا دھاراموڑ دینے کے لیے خون کا نذرانہ پیش کرنا وغیرہ جیسے عوامل نے کردار نگاری پر گہرا اثر چھوڑا۔ اشفاق احمد کے افسانے "گڈریا" کا داؤ بی اور منٹو کے افسانے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کا ٹشن سنگھ اس کی اہم مثالیں ہیں۔ اس کے بعد علامتی و تمثیلی کردار نگاری کا تجربہ بھی اردو افسانے میں کیا گیا جو کہ اردو افسانے میں جدت کی ترجمانی کرتا ہے۔

کرداروں کی درجہ بندی اور اقسام کا جائزہ صرف اور صرف ان کے احساسات و جذبات اور ان میں زندگی کا وجود تلاش کرنے کی غرض سے لیا جانا مقصود ہے۔ کرداروں کو جن جن ذیلی اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ذیل میں ان کا مختصر آجائزہ لیا جائے گا۔

مرکزی کردار

کسی بھی کہانی میں شروع سے لے کر آخر تک ایک کردار ایسا بھی ہوتا ہے جس کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے۔ عمل و حرکت سے وہ فعال کردار ادا کر رہا ہوتا ہے۔ فنی نقطہ نظر سے اُسے مرکزی کردار کہا جاتا ہے۔ پیدائشی یا معاشرتی و سماجی صورت حال اسے نامور اور مرکزی حیثیت دلاتی ہے اور وہ کہانی کو انجام تک پہنچاتا ہے۔ مرکزی کردار عموماً ہمہ جہت شخصیت کا مالک کردار ہوتا ہے۔ اسے مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ پہلو دار شخصیت ہی اس کو کہانی میں مرکزی مقام دلوانے کا باعث ہوتی ہے۔ وہ کہانی میں ہر وقت موجود ہوتا ہے اور کبھی بھی میدان یا منظر سے اس قدر غائب نہیں ہو جاتا ہے کہ کمی اور تشنگی محسوس کی جانے لگے۔ اعلیٰ اوصاف سے متصف مرکزی کردار افسانے میں ہمیشہ عالی شان اور قد آور نظر آئے گا۔ اعلیٰ شخصی اوصاف مثلاً متانت و سنجیدگی، قوت فیصلہ، سادگی، شرافت کا عملی نمونہ ہوتا ہے۔

مرکزی کردار میں شخصی خامیاں بھی پائی جاتی ہوں گی مگر واضح جھلک اُن اوصاف اور خوبیوں کی ضرور نظر آئے گی جس کا تقاضا مصنف، قاری یا صورت حال کر رہے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ مرکزی کردار میں تہذیب، سماج اور عہد کا واضح اظہار ضرور ملتا ہے۔ صورت حال اور کہانی کے مطابق مرکزی کردار اپنے عہد یا سماج کا نمائندہ کہلانے کا مستحق ہو گا۔ یا اگر وہ کسی خاص پیشے یا طبقے سے تعلق رکھتا ہے تو بھی اسی ذات، طبقے، پیشے، نسل کی نمائندگی کرنے کی اہلیت موجود ہوگی اور حقیقی رنگ واضح طور پر نظر آئے گا۔ عام طور پر مرکزی کردار ناقابل شکست ہوتا ہے اور قاری کی امیدوں کا مرکز بھی ٹھہرتا ہے۔ مرکزی کردار اپنی الگ اور انفرادی پہچان کا حامل ہوتا ہے اور کہانی میں شروع سے لے کر آخر تک اثر انداز ہونے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔

ثانوی کردار

اگر کہانی میں مرکزیت صرف ایک ہی کردار کو حاصل رہے تو کہانی مکمل نہیں ہو پاتی۔ اس کی جزئیات اور تفصیلات مکمل طور پر کھل کر سامنے نہیں آ سکتیں۔ تصویر کا دوسرا اور مکمل رخ دیکھنے کے لیے مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ ثانوی کرداروں کی اہمیت بھی مسلمہ ہے۔ اکثر ثانوی کردار، مرکزی کرداروں سے تعلق رکھتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جہاں مرکزی کردار کئی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے وہیں پر ثانوی کردار بھی مرکزی کردار سے مختلف نہیں ہوتے۔ بلکہ مرکزی کردار کی معاونت کا فرض ثانوی کردار سرانجام دیتے ہیں۔ مثلاً "انارکلی" میں انارکلی کا کردار مرکزی ہے تو اس میں سلیم کی حیثیت ثانوی کردار کی سی ہے۔ جو اسی طرح کہانی کی ضرورت ہے مگر اصل کہانی جس کے گرد گھومتی ہے وہ انارکلی ہی ہے۔ کسی بھی کہانی میں ثانوی کردار ہمیشہ مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ ہی نظر آئے گا اور اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ کسی بھی افسانے میں جہاں واقعاتی پہلو کمزور ہوتا نظر آئے تو مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ ثانوی کردار اس صورت حال کو سنبھالا دیتا نظر آتا ہے تاکہ کہانی کی دلکشی اور دلچسپی برقرار رہے۔

ذیلی کردار

مرکزی اور ثانوی کرداروں کے ساتھ ذیلی کردار بھی کسی کہانی کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ یہ مرکزی اور ثانوی کرداروں کے درمیان میں نظر آتے ہیں۔ اس قسم کے کرداروں کا عمل ضمنی سا ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی افسانے میں مرکزی اور ثانوی کرداروں کی معاونت کرتے نظر آئیں گے۔ یہ مختصر سے وقت کے لیے دکھائی دیتے ہیں اور اپنے حصے کا کام کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ موقع محل کی مناسبت سے ان کو پیش کیا جاتا ہے اور انہی موقع پر یہ دکھائی دیتے ہیں اور اپنے وجود کا احساس دلاتے ہوئے کبھی دیر تک اور کبھی وقتی طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہ کہانی میں ہمیشہ کے لیے نہیں دکھائی دیتے ہیں بلکہ کسی

بھی صورت حال میں وقتی طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ مرکزی اور ثانوی کرداروں کی طرح ان کی حیثیت اور اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ افسانہ نگار کی تخلیقی صلاحیتوں کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ کس فنی مہارت سے ذیلی کرداروں کو کہانی میں شامل رکھتا ہے۔ ذیلی کرداروں میں زیادہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ مختصر وقت کے لیے سامنے آتے ہیں تو اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا پیکر اس خوبصورتی سے تراشا جائے کہ یہ مکمل نظر آئیں۔

سپاٹ کردار

کسی بھی افسانے یا کہانی میں شروع سے لیکر آخر تک ایک جیسارویہ رکھنا، ایک جیسے افعال سرانجام دینے والے کردار کو سپاٹ کردار کہا جائے گا۔ اس قسم کے کرداروں میں انہونی حالات نہیں پائے جاتے۔ ان میں کسی خاص صورت حال میں کسی خاص رد عمل کی بجائے طے شدہ رد عمل کی توقع کی جاتی ہے یعنی ان میں اپنے طور پر خاص رد عمل ظاہر کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً کسی مذہبی یا جنونی گروہ سے تعلق رکھنے والا کردار یا ناکامیوں میں مبتلا کردار اس کی اہم مثالیں ہیں۔ ان پر کسی صورت حال، اضطرابی کیفیت کا اثر نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص طے شدہ سوچ اور فکر کے حامل کردار ہوتے ہیں۔ ایسے کردار بھی افسانے کا خاصہ ہوتے ہیں اور بعض اوقات یکسانیت سے بچانے کے لیے ان کو سامنے لایا جانا ضروری ہو جاتا ہے۔

اکہرے کردار

کسی افسانے کا ایسا کردار جس پر صرف ایک ہی رویے یا طرز عمل کی گہری چھاپ ہو، اکہرا کردار کہلاتا ہے۔ یہ پوری کہانی میں ایک ہی انداز میں حرکت و عمل کرتے نظر آئیں گے۔ ان سے صرف ایک جیسے رد عمل اور طرز عمل کی توقع کی جاتی ہے۔ یہ افسانے میں کسی خاص طرز فکر، سوچ یا طبقے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ زندگی کے کسی ایک پہلو کو واضح کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں زندگی، معاشرے اور سماج کو کسی ایک زاویہ سے دیکھنے کی صلاحیت اور توقع کی جاتی ہے۔ بعض افسانوں اور کہانیوں میں یہ صورت حال کے تقاضوں کے مطابق کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے شامل کیے جاتے ہیں تاکہ کہانی پایہ تکمیل تک پہنچ سکے۔

مرکب کردار

ایک سے زائد رویوں اور طرز عمل کے حامل کردار مرکب کردار کہلاتے ہیں۔ عام طور پر مرکب کردار بہت کم پائے جاتے ہیں۔ مرکب کردار دو متضاد صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ کسی افسانے میں ایسے کردار بھی شامل کیے جاتے ہیں

جو کسی خاص واقعہ میں ایسا طرز عمل اپناتے ہیں اور ایسا رد عمل پیش کرتے ہیں جن سے ان کی شخصیت میں تضاد سامنے آتا ہے۔ ان کو کہانی میں دوہرا کردار ادا کرنے کے لیے دیا جاتا ہے تاکہ کسی خاص صورت حال میں یا کسی خاص واقعہ کے ذریعے مطلوبہ نتائج اور اہداف حاصل کیے جاسکیں۔

مجهول کردار

ایسے کردار جو اپنے اعمال و افعال میں کسی قدر جھول رکھتے ہیں اور اس سے ایسے کرداروں کے تاثر میں بھی فرق آنے لگتا ہے ایسے کردار کمزور طرز عمل کی وجہ سے مجہول کردار کہلاتے ہیں۔ ایسے کردار جو کسی مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے دوران ہی ختم ہو جائیں، ان کا شمار مجہول کرداروں میں کیا جاتا ہے۔ ایسے کردار کسی خاص صورت حال میں کسی کے اکسانے پر یا تحریک دینے پر کچھ دیر کے لیے دکھائی دیتے ہیں مگر پھر منظر نامے سے غائب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے کردار قارئین پر کچھ خاص تاثر جمائے میں کامیاب نہیں ہو پاتے ہیں اور نہ افسانے و کہانی پر ایک خاص حد سے زیادہ اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

محدود کردار، عارضی کردار

محدود کردار ایسے کردار ہوتے ہیں جو وقتی اور عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جو افسانہ میں صورت حال کے مطابق وقتی طور پر وہ کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ خاص مواقع پر نمودار ہوتے ہیں اور اپنے حصے کا کام کر کے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ کسی بھی قصہ، کہانی اور افسانہ میں مخصوص مناظر میں کئی محدود کردار سامنے لائے جاتے ہیں کیونکہ کسی ایک محدود کردار سے مختلف قسم کے اعمال و افعال کی ادائیگی ممکن نہیں ہوتی ہے۔ ان پر گہری چھاپ نہیں لگ سکتی ہے بلکہ وقتی اور عارضی طور پر وہ روپ اختیار کر لیتے ہیں جیسے کھلاڑی، خریدار، مسافر وغیرہ۔ مثلاً کسی دوکان میں کوئی چیز خریدنے کے لیے جب کوئی شخص جائے گا تو وہ وقتی طور پر گاہک یا خریدار کہلائے گا یا اگر کوئی کردار کھیل کے میدان میں اترتا ہے تو کھلاڑی کہلاتا ہے یا پھر اگر کسی کو کوئی سفر درپیش ہو تو کسی گاڑی، ہوائی جہاز میں سوار ہوتے ہی وہ مسافر یا سواری کا روپ دھار لیتا ہے۔ یاد رہے کہ کسی کو روٹ پکھری میں پیش ہونے والے وکیل کا موکل یا کسی سکول مدرسے میں جانے والا استاد، شاگرد وقتی یا محدود کردار نہیں کہلائیں گے چاہے کسی افسانے میں ان کو تھوڑی دیر کے لیے ہی کیوں نہ پیش کیا جائے۔ کیونکہ یہ مستقل نوعیت کے کردار ہوتے ہیں۔ حاصل بحث یہ ہے کہ وقتی، عارضی کردار مختصر وقت کے لیے وہ کیفیت اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں یا پھر وہ روپ دھار لیتے ہیں جو صورت حال تقاضا کر رہی ہوتی ہے۔

نقلی کردار

جب تخلیق کار کسی خاص گروہ (مذہبی، لسانی، علاقائی، سیاسی) یا فرقہ پرست کردار تخلیق کرتا ہے تو اس کا انداز متعصبانہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ غیر جانبدارانہ ہونا چاہیے۔ تعصبانہ رویے کی وجہ سے کردار زندگی کی حقیقت سے دور ہو جائے گا اور ایسا کردار نقلی کردار کہلائے گا۔ چونکہ افسانے میں کردار اپنے احساسات و جذبات کا اظہار خود کرنے پر قادر ہوتا ہے لہذا افسانہ نگار کو اپنا تعصب، مخالفت اور ذاتی آراء و نقطہ نظر کی چھاپ کردار پر نہیں لگنے دینی چاہیے ورنہ وہ اصلی کی بجائے نقلی یا جعلی کردار کہلائے گا۔ کرداروں کی حرکات و سکنات، اعمال و افعال، کہانی، قصے یا صورت حال کے تابع ہونے چاہیے نہ کہ افسانہ نگار ان کی آزادی سلب کر لے بلکہ ان کو زندگی کی حقیقی عکاسی کرنے دی جانی چاہیے۔

پیچیدہ کردار

پیچیدہ شخصیت کے حامل اور نہ سمجھ آنے والی باطنی کیفیات کے حامل کردار پیچیدہ کردار کہلاتے ہیں۔ افسانوں میں جہاں اکہرے، ادھورے، نامکمل کردار پائے جاتے ہیں تو پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کے لیے پیچیدہ کردار ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے کرداروں کی سوچ، فکر، طرز عمل اور حرکات و سکنات کسی نہ کسی نفسیاتی پیچیدگی کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ ایسے کردار عام طور پر خود کو جیسا ظاہر کر رہے ہوتے ہیں اور جیسے ان کو پیش کیا جا رہا ہوتا ہے ویسے حقیقت میں ہوتے نہیں ہیں۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے لائے جاتے ہیں۔ "جدید اردو افسانے کے رجحانات" میں ڈاکٹر سلیم آغا قرزلہاش لکھتے ہیں۔

فی الحقیقت کردار نگاری کے سلسلے میں آزاد تلازمہ خیال، شعور کی رو، خواب کا طرز بیاں نیز خود کلامی اور بالواسطہ اور بلا واسطہ طریق کار کے استعمال نے کردار کی پیش کش کو پہلو دار بنا دیا ہے۔^{۲۱}

یہاں واضح ہوتا ہے کہ افسانے میں جس قدر جدت آئی ہے اور نئی سے نئی تکنیکوں کا سہارا لیا جانے لگا تو اس کا اثر کردار نگاری پر بھی پڑا۔ کرداروں کی ایک اور قسم کا اضافہ ہونے سے پیچیدہ کردار پیش کیے جانے لگے ہیں۔

مزاحیہ کردار

کسی بھی افسانے، قصے کہانی میں ہنسنے ہنسانے والے کردار مزاحیہ کردار کہلاتے ہیں۔ یہ عام طور پر دل بہلانے کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اس طرح کے کردار ہنسی مذاق سے کسی بھی فن پارے میں مزاح کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ سرسید احمد خان کی مقصدی و اصلاحی تحریک کے نتیجے میں جو فضا بن چکی تھی اس کے رد عمل کے نتیجے فکاہی ادب کا چلن عام ہوا۔ اودھ پنچ

کے مضمون نگاروں نے مزاحیہ تحریریں لکھنا شروع کیں تو جب افسانہ ابتدائی شکل میں سامنے آیا تو بعض افسانہ نگاروں نے کہانیوں میں بھی مزاحیہ کردار اور عناصر داخل کرنے کی کوشش کی۔ ایسے کردار عموماً سیدھے سادھے، بھولے بھالے ہوتے ہیں جو آنکھیں بند کیے اپنے آپ میں مگن زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ یہ عموماً اپنی مثبت یا منفی خصوصیات کی بنا پر معاشرے کے کسی خاص طبقے یا گروہ کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ عملی مذاق کی صورت میں بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ابتدائی خدوخال اور نقوش سجاد حیدر یلدرم کے افسانے "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" میں ملتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد کا کردار مرزا ظاہر دار بیگ بھی اس کی اولین مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ مزاحیہ کرداروں کی پیشکش کے لیے ضروری ہے کہ افسانہ نگار کا اپنا مزاج اور گرفت اس لحاظ سے مضبوط ہو کہ وہ کسی خاص صورت حال میں لطف اندوز ہونے کا سامان پیدا کر سکے۔ اس طرح کے کرداروں کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوتی ہے تاکہ قارئین کو بوریت سے بچایا جاسکے۔ قارئین کو دلچسپی کا سامان بہم پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بعض افسانوں میں مزاحیہ کردار دلکشی، طرز عمل و رویہ کے باعث مرکزی کردار کی سی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ احمد شاہ پطرس بخاری کے افسانہ نما مضامین میں مزاحیہ کردار ملتے ہیں۔ اسی تسلسل کو امتیاز علی تاج کے جاندار کردار چچا چھکن نے آگے بڑھایا۔ اسی طرح شفیق الرحمان نے باقاعدہ مزاحیہ افسانے تحریر کیے اور ادو ادب کو شیطان نامی مزاحیہ کردار دیا۔

اخلاقی و اصلاحی کردار

جس طرح یہ دنیا خیر و شر کی قوتوں کے مجموعے کا نام ہے یعنی اس میں خیر اور شر کی قوتیں کار فرما ہیں۔ اس کا اظہار ہمیں اردو ادب میں واضح طور پر ملتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں سماج اور معاشرے میں روایات اور اقدار کو برقرار رکھنے کی شعوری طور پر کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ لہذا اردو افسانہ میں ابتدائی طور پر ایسے کردار بھی سامنے آئے جو کہ حق پرستی، راست گوئی، اصول پسندی، نیک و متقی اور دیانت داری کا عملی نمونہ تھے۔ اس طرح کے کردار مقصدیت کے تابع ہوتے ہیں اور تخلیق کار ان کے ذریعے اچھائی و برائی کے اصلاحی پہلوؤں کو قارئین کے سامنے لاتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کے مشہور کردار نصوص اور ابن الوقت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اسی طرح منشی پریم چند، راشد الخیری اور سجاد حیدر یلدرم نے ابتدائی دور میں اصلاحی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے کردار متعارف کروائے۔ ان کے ہاں واقعات سے زیادہ کردار طاقت ور ہوتے ہیں جو کہانی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں اچھائی اور برائی کی قوتوں کا ٹکراؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کا افسانہ "ازدواجِ محبت" پر خلوص محبت کی کہانی پر مشتمل ہے۔ اسی طرح "نکاحِ ثانی" میں بھی جنسی بے راہ روی پر محبت کا جذبہ غالب آجاتا ہے اور اس میں یہ کردار ایک طے شدہ حکمت عملی کے تحت ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح پریم چند کے ایک افسانے "بڑے گھر کی بیٹی" میں ہندو سماج کی بہو بیٹی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس

میں "آئندی" کا کردار اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ جس کے ذریعے پریم چند ہندو گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو احساس دلانا چاہتے ہیں کہ گھرانے کی سلامتی اور عافیت کے لیے ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اردو افسانے میں اخلاقی و اصلاحی کردار نگاری کا مقصد زندگی کے مسائل، مصائب اور پیچیدگیوں کی گتھیاں سلجھانا تھا۔

رومانوی کردار، تخیلی کردار

چونکہ اردو افسانہ کی بنیاد داستان ہے اور داستان میں تخیلی کرداروں کا ہونا ایک عام اور معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ لہذا اس کے اثرات اردو افسانے پر بھی مرتب ہوئے۔ چنانچہ افسانے میں بھی تخیلی اور رومانوی کردار متعارف کرائے گئے۔ گو کہ وہ افسانے کی مجموعی فضا اور واقعاتی اتار چڑھاؤ کے مطابق ہی ہوتے تھے مگر ان میں تخیلاتی جھلک واضح طور دیکھی جاسکتی تھی۔ ایسے کردار جذباتیت کا شکار ہوتے ہیں۔ حسن و عشق کے معاملات کو ہی دنیاوی زندگی کا حاصل اور مقصد سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ مجموعی فضا پر رومانوی اثرات عشقیہ کرداروں کے ذریعے چھائے ہوئے ملتے ہیں۔ اس حوالے سے سلیم آغا قزلباش ڈاکٹر صادق کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

رومانوی افسانہ نگار چونکہ جذباتیت کو ترجیح دیتے تھے اور طرز ادا کو اولیت کا درجہ اس لیے ان کے یہاں کردار نگاری میں وہ ارضیت، حقیقت آفرینی، تحرک اور عمل نہیں دکھائی دیتا جس کا فقدان ان کرداروں کو کھپتلیاں بنا کر رکھ دیتا ہے۔^{۲۲}

صنفی کردار

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بلحاظ صنف جوڑے کی صورت میں پیدا کیا ہے۔ مرد اور عورت اس کے دو روپ ہیں۔ بلحاظ صنف اور جنس اگر درجہ بندی کی جائے تو ہمیں مردانہ اور نسوانی کردار کسی بھی افسانے میں ملتے ہیں۔ جس طرح کسی افسانے کا مرکزی کردار بے شمار خوبیوں کا حامل ہوتا ہے اور جدوجہد سے کامیابی حاصل کرتا ہے۔ اس طرح نسوانی کرداروں میں بھی ان خوبیوں کا پایا جانا اشد ضروری ہوتا ہے۔ حسن و دلکشی و خوبصورتی کے ساتھ ساتھ با وفا، ثابت قدم اور قربانی دینے کو تیار یہ مشرقی عورت کی خوبیاں اور خصوصیات ہیں۔ اگر کسی افسانے میں مرکزی کردار نسوانی ہے تو وہ عام لوگوں اور عورتوں سے ہٹ کر ہو گا۔ دیکھا جائے تو کسی کہانی میں مرکزیت صرف مردانہ کرداروں کو ہی حاصل رہے تو معاشرے کی چلتی پھرتی کہانیاں سامنے بھی نہیں آ پاتی ہیں اور مکمل بھی نہیں ہو پاتی ہیں۔ تصویر کا دوسرا رخ اور اصل چہرہ دیکھنے کے لیے نسوانی کرداروں کو شامل کیا جاتا ہے۔

جنسی و نفسیاتی کردار

جنسی جذبے کا اظہار انسان کا جبلی معاملہ ہے۔ انسانی کردار کی نفسیات کو دیکھا جائے تو جنسی جذبہ مختلف شکلوں اور صورتوں میں کارفرما نظر آتا ہے۔ چونکہ افسانے میں بھی معاشرے کی عکاسی کی جاتی ہے لہذا معاشرے کے چلتے پھرتے موضوعات عورت مرد کی محبت، نوجوانی اور اداس جوانی کے جنسی مسائل، نفسیاتی الجھنیں، معاشرے کی بے جا پابندیاں اور اقدار کی پاسداری، سماجی سطح پر پایا جانے والا غیر متوازن رویہ، متشدد رویے اور بے اعتدالیاں افسانے کا حصہ بنیں تو انسانی نفسیات کا گہرائی و گیرائی سے جائزہ لیا گیا۔ شعور اور لاشعور کے پیچھے چھپے اصل انسانی چہرے کو سامنے لانے کی کوششیں کی گئیں۔ فرد اور سماج کا ٹکراؤ اور کشمکش کو واضح کیا گیا۔ اردو افسانے کے ابتدائی دور میں جہاں اخلاقی و اصلاحی کردار متعارف کرائے گئے وہیں پر جنسی پہلو کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی۔ اس حوالے سے سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم کا افسانہ ازدواج محبت اور پریم چند کا وفا کی دیوی کے کردار جنسی رخ کو ظاہر کرتے ہیں۔ بعینہ قاضی عبدالغفار کے افسانہ تین پیسے کی چھو کری کا کردار تھوڑورا، علی عباس حسینی کے افسانے میلہ گھومنی کی بہو اور محمد علی رودلوی کے کئی ایک منفرد طرز کے کردار اسی پہلو کی نشاندہی کرتے ہیں۔^{۲۳}

جب کہ بعد میں آنے والے لکھاریوں کے ہاں بھی اسی طرز فکر کا اظہار ملتا ہے۔ منٹو نے جنسی مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ "کالی شلوار"، "کھول دو" اور "ٹھنڈا گوشت" اس حوالے سے اہم مثالیں ہیں۔ کردار نگاری کا ایک اور طریقہ ممتاز مفتی کے ہاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے براہ راست کی بجائے بالواسطہ طریق اپناتے ہوئے کرداروں کے شعوری رویوں کے ذریعے چھپے ہوئے مسائل کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ممتاز مفتی نے متوسط گھرانوں کی لڑکیوں اور عورتوں کو موضوع بنایا جو بظاہر چار دیواری کے اندر زندگی بسر کر رہی ہوتی ہیں مگر نفسیاتی و جنسی الجھنوں کا شکار ہوتی ہیں۔ ناآسودگی اور محرومی کا عنصر بھی ان کے کرداروں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ مفتی کے ہاں آپا عذرا اور دیوی جیسے نسوانی کردار اس کی اہم مثالیں ہیں۔ عصمت چغتائی کے متعدد افسانے "الحاف"، "تل"، "گیندا"، "چوتھی کا جوڑا" اور "پردے کے پیچھے" کے کرداروں کو اس سلسلے کی اہم کڑی قرار دیا جاسکتا ہے۔

باغی کردار

برصغیر پاک و ہند ایک طرف نوآبادیاتی نظام کا حصہ رہا ہے تو دوسری طرف جاگیر دارانہ و سرمایہ دارانہ نظام اس معاشرے پر حاوی نظر آتا ہے۔ اسی طرح مختلف مذاہب کی تقسیم، ذات پات، نسل خاندان اور طبقاتی امتیازات نے پوری طرح اس معاشرے کو اپنی جکڑ میں لے رکھا تھا۔ ان حالات میں اردو افسانے کی ابتداء و ارتقا ہوئی تو معاشرے میں

مذہبی، سیاسی، لسانی اور سماجی بغاوت ایک فطری امر اور جذبہ تھا جس کی گہری چھاپ ہمیں اردو افسانے میں بھی ملتی ہے۔ اردو افسانے اور ناول میں بہت سے ایسے کردار ہمیں نظر آتے ہیں جنہوں نے معاشرے کے بالادست طبقے سے بغاوت کر دی اور باغی کہلائے۔ یہ باغی کردار اردو افسانے میں کافی زیادہ تعداد میں نظر آتے ہیں۔

د۔ اشفاق احمد شخصیت و فن (اجمالی جائزہ)

اشفاق احمد مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور میں بمقام مکتبہ ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام محمد خان اور والدہ کا نام سردار بیگم تھا۔ آپ کے دادا کا نام دوست محمد خان تھا۔ آپ کا تعلق پٹھان راجپوت فیملی سے تھا۔ قصبہ مکتبہ سکھوں کا مذہبی متبرک مقام ہے جس میں سکھ آبادی کا تناسب ۹۲ فی صد تھا۔ اشفاق احمد کا آبائی مکان جو کہ حویلی نما تھا، محلہ، حیرہ میں واقع تھا۔ آپ کا گاؤں دریائے ستلج سے ۳۳ میل دور تھا جس کی آبیاری اور فصلوں کا دار و مدار صرف بارش پر تھا۔ زمینیں خشک اور بخر تھیں۔ آپ سات بہن بھائی تھے اور پانچ بھائیوں میں اشفاق احمد سب سے چھوٹے تھے جب کہ دو بہنیں آپ سے چھوٹی تھیں۔ آپ کے دیگر بھائیوں کے نام آفتاب احمد خان، افتخار احمد خان، اقبال احمد خان، اسحاق احمد خان جب کہ بہنوں کے نام فرخندہ اور راحت تھے۔ آپ کا پورا نام اشفاق احمد خان تھا جب کہ قلمی نام اشفاق احمد تھا۔ آپ کی شادی ۱۹۵۶ء میں معروف ادیبہ بانو قدسیہ کے ساتھ ہوئی۔ اشفاق احمد نے ابتدائی تعلیم اپنے قصبے کے ہائی سکول سے حاصل کی۔ میٹرک کے سن میں اختلاف ہے۔ اے حمید نے اپنی کتاب "اشفاق احمد شخصیت و فن" میں میٹرک کا سال ۱۹۴۳ء^{۲۴} لکھا ہے جب کہ جی سی یونیورسٹی لاہور کے "راوی" اشفاق احمد نمبر میں میٹرک کا سال ۱۹۴۲ء^{۲۵} درج ہے۔ تعلیم کی تفصیل درج ذیل ہے۔

میٹرک فیروز پور تحصیل مکتبہ ۱۹۴۲ء ایف اے گورنمنٹ کالج لاہور ۱۹۴۴ء بی اے
گورنمنٹ کالج لاہور ۱۹۴۶ء ایم اے اردو گورنمنٹ کالج لاہور ۱۹۵۰ء گرے نوبل
یونیورسٹی فرانس سے فرانسیسی زبان میں ڈپلومہ ۱۹۵۳ء روم یونیورسٹی اٹلی سے اطالوی زبان
میں ڈپلومہ ۱۹۵۷ء نیویارک یونیورسٹی امریکہ سے ریڈیائی نشریات کی خصوصی تربیت
۱۹۶۲ء ورمونٹ Wermont امریکہ میں بریڈ لوف Bread Loaf انٹرز
گروپ میں شرکت ۱۹۶۲ء^{۲۶}

قیام پاکستان کے بعد اشفاق احمد کا خاندان پاکستان منتقل ہوا۔ لاہور میں ان کو گھر الاٹ کیا گیا۔ شروع میں حالات بہتر نہ تھے تو آپ نے جہاں مہاجرین کو عارضی طور پر پاکستان آمد کے بعد ٹھہرایا جاتا تھا وہاں ملازمت شروع کر دی۔ اشفاق احمد اس مہاجر کیمپ میں مہاجرین کی رجسٹریشن کا کام کرنے لگے۔ اس کے بعد آپ کو مہاجرین کے نام پکارنے کے لیے لاؤڈ

سپیکر پراناؤنسمنٹ کی ذمہ داری دے دی گئی۔ شروع سے ہی لکھنے لکھانے کا شغف تھا۔ اسی کے ساتھ ریڈیو پاکستان کے لاہور اسٹیشن سے تعلق قائم ہوا۔ ریڈیو کے مشہور آرٹسٹ محمد حسین المعروف علی بابا نے اشفاق احمد کو ڈرامہ نگاری کے سلسلے میں ابتدائی رہنمائی اور معانت فراہم کی تو آپ نے "اچی ماڑی" کے نام سے ایک مشہور پروگرام پیش کیا جو بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۶۸ء میں ریڈیو پہ آپ نے اپنا مشہور زمانہ پروگرام "تلقین شاہ" کے نام سے شروع کیا جو کہ ۱۹۸۷ء تک ریڈیو پہ چلتا رہا۔ یہ ایک مستقل سلسلہ تھا جسے عوام میں بہت زیادہ مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ جمیل احمد اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

ریڈیو پر اشفاق احمد نے بہت کام کیا اور اسی لیے تلقین شاہ نامی فیچر نے ریکارڈ توڑا اور پھر ریکارڈ قائم کیا۔ اس ریکارڈ سے مراد اس پروگرام کا طویل عرصے تک نشر ہونا ہے۔ ورنہ ریڈیو پر کوئی مقبول سے مقبول پروگرام چوتھائی صدی تک نہیں چل سکتا۔ یہاں بھی نقادوں نے اشفاق احمد کو تلقین شاہ ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا۔^{۲۷}

تلقین شاہ کے علاوہ آپ نے ۳۸ ڈرامے لکھے۔ ان ڈراموں کے رائٹر، صداکار آپ خود ہوا کرتے تھے۔ یہ پروگرام دنیا کا دوسرا اور براعظم ایشیا کا پہلا طویل ترین ریڈیو پروگرام قرار دیا گیا۔ آپ نے آل انڈیا ریڈیو لاہور اسٹیشن پر اناؤنسمنٹ کے فرائض بھی ۱۹۴۴ء^{۲۸} میں سرانجام دیئے۔ جب کہ آزاد کشمیر اور راولپنڈی ریڈیو اسٹیشن میں بطور براڈکاسٹر بھی کام کرنے کا موقع ملا۔^{۲۹}

ملازمت

اشفاق احمد نے بطور لیکچرر پاکستان و بیرون ملک کام کیا۔ سب سے پہلے ۵۲-۱۹۵۱ء لیکچرر شعبہ اردو دیال سنگھ کالج لاہور میں کام کیا۔ وہاں سے آپ کو ۵۴-۱۹۵۳ء میں بطور لیکچرر اردو اٹلی کی روم یونیورسٹی میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی طرح آپ نے ایک سال ۱۹۶۷ء میں آنریری لیکچرر پنجابی کے طور پر پنجاب یونیورسٹی میں کام کیا۔ آپ کو ۱۹۶۶ء میں اردو سائنس بورڈ لاہور کا ڈائریکٹر جنرل بنایا گیا جہاں پر آپ یکم جولائی ۱۹۸۹ء تک تعینات رہے۔

جب کہ ۲۶ مارچ ۱۹۹۱ء تا ۱۹ جون ۱۹۹۳ء (عرصہ دو سال قریباً) دوبارہ یہ عہدہ سنبھالا۔ اسی کے ساتھ ساتھ آر۔ سی۔ ڈی ریجنل کلچر انسٹیٹیوٹ پاکستان برانچ کے ڈائریکٹر کے طور پر بھی ۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۰ء تک فرائض سرانجام دیئے۔ اسی عرصہ کے دوران ۱۹۶۳-۶۴ء میں آپ نے بطور ایڈیٹر لیل و نہار بھی کام کیا۔

ٹیلی ویژن

پاکستان ۱۹۶۴ء میں ٹیلی ویژن نے اپنی نشریات کا آغاز کیا تو ریڈیو پہ کام کرنے والے لوگوں کو ہی شروع شروع میں کام کرنے کا موقع ملا۔ جو لوگ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ٹیلی ویژن کے ابتدائی دور میں منظر عام پر آئے اور اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ان میں اشفاق احمد کا نام بھی شامل ہے۔ چونکہ اشفاق احمد کے اندر ایک افسانہ نگار اور کہانی نویس چھپا بیٹھا تھا تو جب آپ کو ٹیلی ویژن کی وسیع دنیا میں کام کرنے کا موقع ملا تو آپ نے اپنی صلاحیتوں کا کھل کر اظہار کیا اور ٹیلی ویژن کو کئی یادگار پروگرام، ڈرامے اور فیچرز دیئے۔ اے حمید لکھتے ہیں کہ "ٹیلی ویژن کے لیے اس نے جو فیچر اور ڈرامے لکھے ان کی تعداد پونے چار سو کے لگ بھگ ہے۔" ۳۰ "اُن میں "ایک محبت سو افسانے"، "کاروان سرائے"، "حیرت کدہ"، "من چلے کا سودا"، "بندگلی"، "توتا کہانی"، "اور ڈرامے"، "قلعہ کہانی"، "نگلے پاؤں"، "گل دان" اور "بجنگ آمد" کافی مشہور ہیں۔ جب کہ اردو کے ساتھ ساتھ اشفاق احمد نے پنجابی ڈرامے بھی تحریر کیے۔ ان میں اچے برج لاہور دے، ٹاہلی دے تھلے کافی مشہور ہوئے۔ "ایک محبت سو افسانے" کے نام سے اشفاق احمد نے ڈراموں کی سیریز لکھی۔ جس میں کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ڈراموں میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے کردار لیے اور زندگی کی حقیقتوں کو اپنا موضوع بنایا۔ اس سیریز کے ڈراموں نے بہت زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ معروف شاعر، ادیب، کالم نگار اور ڈرامہ نگار امجد اسلام امجد نے اشفاق احمد کو پی ٹی وی کا بانی ڈرامہ نگار قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

اشفاق احمد نے اس دور ان حیرت کدہ کے نام سے علامتی ڈرامہ پیش کیا جو ناظرین کے ذہنوں کے بند دروازوں پر دستک دیتا ہے۔ ان حالات میں ٹی وی پر ایک نیا تجربہ کرنا اشفاق صاحب کا ہی خاصہ تھا۔ اسی لیے ڈرامہ نگاروں کی صف اول میں بھی ممتاز تھے اور بلاشبہ ہم انھیں ٹی وی ڈرامہ نگاری کا بانی کہہ سکتے ہیں۔ ۳۱

ٹیلی ویژن کے ساتھ ساتھ اشفاق احمد نے خود کو بڑی سکرین پر بھی متعارف کرانے کا فیصلہ کیا کیونکہ ہر تخلیق کار اپنے جذبات کے اظہار کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنا چاہتا ہے۔ ریڈیو سے ٹیلی ویژن اور ٹیلی ویژن سے فلم کا سفر اشفاق احمد نے شوق کی تکمیل کے لیے کیا مگر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ اگر کوئی ادیب کوئی ناول، افسانہ لکھ دیتا ہے تو پبلشر اسے شائع کر دیتا ہے۔ کتاب بعد میں بکٹی رہتی ہے۔ ریڈیو پہ آپ نے کوئی پروگرام کیا، نشر ہوا، سامعین نے سن لیا یا ٹیلی ویژن پر آپ کا کوئی ڈرامہ نشر کیا جاتا ہے تو اشتہار ملتے ہیں اور ڈرامہ چلتا رہتا ہے مگر عوامی رد عمل یا مقبولیت کا اندازہ اس طرح نہیں ہوتا جس طرح فلم بنانے والوں کو ہوتا ہے۔ فلم کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ فلم کی کہانی اشفاق احمد نے خود

لکھی۔ نئے چہرے کاسٹ کیے گئے۔ اشفاق احمد نے ہدایت کاری خود کرنے کا فیصلہ کیا۔ نا تجربہ کاری آڑے آئی اور فلم جب تیار ہو کر سینما ہاؤسز میں پہنچی تو مقبول نہ ہو سکی۔ جلد ہی سینماؤں سے اتر گئی اور فلم بینوں کے دل میں بھی رہ نہ پائی۔ اس ناکام تجربے کے بعد اشفاق احمد نے فلم بنانے کا نام نہ لیا۔

افسانہ نگاری

اشفاق احمد ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ ادبی زندگی کا آغاز انھوں نے افسانہ نگاری سے کیا۔ اشفاق احمد بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے اور ان صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع بھی قدرت نے ان کو دیئے۔ بطور افسانہ نگار پہلا افسانہ ۱۹۴۲ء میں لکھا جو "توبہ" کے نام سے ادبی دنیا رسالے میں شائع ہوا۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ہی جب کہ اشفاق احمد فنی سفر کے آغاز میں تھے، آپ نے "گڈ ریا"، "ملاش"، "پناہیں" جیسے معروف اور مقبول عام افسانے لکھے بلکہ "گڈ ریا" کو تو ادبی ماہرین اور ناقدین ایک شاہکار افسانہ قرار دیتے ہیں۔ بلاشبہ اس افسانے نے اشفاق احمد کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا اور ادبی دنیا میں بھی اشفاق احمد کے قد کاٹھ میں نمایاں اضافہ ہوا۔ اشفاق احمد زندگی کا گہرا شعور اور مشاہدہ رکھتے تھے اس لیے ان کی کہانیاں اور افسانے حقیقت سے قریب تر ہونے کی بنا پر عوام میں مقبول رہے۔ انھیں اپنی بات نئے انداز میں کہنے کا ڈھنگ اور سلیقہ آتا تھا۔ انھوں نے کبھی پرانے موضوعات پر قلم نہیں اٹھایا۔ اگر لکھا بھی تو اس پیرائے میں کہ بات دل تک اتر جاتی۔ موضوعات اور تکنیک کے لحاظ سے اشفاق احمد بے پناہ وسعت کے مالک افسانہ نگار تھے۔ اشفاق احمد نے ابتدائی دور میں ہی "گڈ ریا" جیسا شاہکار افسانہ لکھ کر دنیاے ادب میں اپنی آمد کی خبر دی۔ یہ کردار نگاری اور موضوع کے اعتبار سے ایسا اچھوتا شاہکار تھا کہ اشفاق احمد کی وفات پر کہا گیا کہ آج گڈ ریا چل بسا۔ بلاشبہ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کیونکہ متنوع قسم کے مشاغل اور اپنی توانائیاں اتنے شعبوں میں صرف کی تھیں کہ کسی ایک صفت کی چھاپ یا لیبل لگنا بہت مشکل امر تھا۔ اپنے خاص اسلوب اور انداز کی بدولت ان کے افسانے لوگوں کو تادیر یاد رہیں گے۔ آزادی کے بعد جن افسانہ نگاروں کا ادبی مقام اور قد کاٹھ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے اشفاق احمد بھی ان میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اشفاق احمد کی افسانہ نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت نگاری کھری، بے ڈھنگم، اذیت ناک، فاحش اور انتہا پسند نہیں ہوتی۔ وہ جس ماحول یا کردار سے متاثر ہو کر افسانہ لکھتے ہیں اسے حد درجہ سبک، نرم، میٹھے، سادہ اور دھیمے لہجے میں قاری کے دل و دماغ میں اتار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ اصلاحی اور تعمیری مقصد ان کے یہاں نہیں ہوتا۔ ضرور ہوتا ہے لیکن اس طور پر نہیں کہ مقصد تبلیغی مشن سے آگے نکل جائے اور افسانہ پیچھے رہ جائے۔^{۳۲}

اشفاق احمد کا پہلا افسانوی مجموعہ "ایک محبت سو افسانے" کے نام سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل تیرہ افسانے تھے جن میں توبہ، رات بیت رہی ہے، مسکن، توتا کہانی، پناہیں، بندر ابن کی کنج گلی میں اور امی جیسے مشہور افسانے شامل تھے۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں "اجلے پھول" کے نام سے افسانوی مجموعہ شائع ہوا جس میں نو افسانے شامل تھے۔ جن میں اجلے پھول، گڈریا، صفدر ٹھیلا، ایل ویرا اور گل ٹریا قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں آپ کا افسانوی مجموعہ "سفر مینا" کے نام سے شائع ہوا اس میں گیارہ افسانے تھے۔ اس مجموعے کے مشہور افسانے قاتل، مانوس اجنبی، پانچ میل دور، محسن محلہ، کالج سے گھر تک اور چور وغیرہ تھے۔ ۱۹۹۸ء میں "طلسم ہوش افزا" کے نام سے افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا۔ یہ اردو میں سائنس فکشن کا بہترین اضافہ تھا۔ اس میں اردو سائنس بورڈ کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرنے والے شخص کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس مجموعے میں کل بارہ افسانے شامل ہیں۔ جن میں قصاص، ملک مروت، سونی، کھکشاں ٹیکسی سٹینڈ، بولتا بندر، قلعے اور کوٹ و دو پاور ہاؤس شامل ہیں۔ اس مجموعے میں آپ نے علم فلکیات، طب، طبعیات، الیکٹریکل انجینئرنگ، علم آثار قدیمہ، علم اقتصادیات اور مینیکل انجینئرنگ جیسے علوم کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ اس میں کردار زیادہ تر سائنسی نوعیت کے ملتے ہیں مگر ان کو افسانوں میں اس خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ کہیں بھی اجنبیت محسوس نہیں ہونے دیتے ہیں، قارئین کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور جدا نہیں ہونے دیتے ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں "صبحانے افسانے" کے نام سے جو مجموعہ منظر عام پر آیا اس میں کل بائیس افسانے شامل تھے۔ اماں سردار بیگم، آڑھت منڈی، ماسٹر روشنی، شازیہ کی رخصتی، بے غیرت مدت خان، رازداں، پل صراط اور پاسپورٹ، خانگی سیاست وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس مجموعے کے پہلے افسانوی طرز کے مضمون کو اشفاق احمد نے اپنی والدہ سردار بیگم کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ جس میں اپنے ابتدائی حالات کے ساتھ ساتھ اپنی والدہ محترمہ کی شفقت اور مامتا کی محبت کے بے شمار چھوٹے چھوٹے واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ اپنی والدہ کی دانش بھری باتوں، نصیحتوں اور سنائے گئے نصیحت آموز چھوٹے چھوٹے قصے کہانیوں کو بیان کیا گیا ہے اور اپنی والدہ کو احسن طریقے سے خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اشفاق احمد کا افسانوی مجموعہ "پھلوا ری" کے نام سے ۱۹۹۱ء سے شائع ہوا۔ جس میں پندرہ افسانے شامل تھے۔ اشفاق احمد کا بطور افسانہ نگار ۱۹۴۲ء سے شروع ہونے والا سفر ۲۰۰۲ء کے افسانوی مجموعے کے شائع ہونے تک جاری رہا۔ گو کہ اس دوران انھوں نے دیگر اصناف ادب ناول، ناولٹ، سفر نامہ، ڈرامہ نگاری اور تراجم میں بھی کام کیا مگر ان کے اندر چھپا ہوا افسانہ نگار اور کہانی نویس عوام کو تادیر یاد رہے گا۔ اشفاق احمد کے چھ افسانوی مجموعوں میں کل ۸۲ افسانے شامل ہیں۔

سفر نامہ

اشفاق احمد نے جہاں ریڈیو کے سامعین، ٹیلی ویژن کے سامعین اور افسانوں کے قارئین کو بے مثال اور یادگار تخلیقات دیں وہیں پر انھوں نے اپنے اسفار کو بھی قلمبند کیا۔ ایسا منفرد اسلوب اختیار کیا کہ قاری کو قلم کے جادو کے زیر اثر اپنے ساتھ گھماتے پھرتے رہتے ہیں۔ آپ کا سفر نامہ "سفر در سفر" کے نام سے ۱۹۸۱ء کو شائع ہوا۔ اس میں مختلف علاقوں اور عنوانات سے مضمون شامل ہیں۔ سودار و متہ الکبریٰ، خوابوں کا جزیرہ، عرش منور، چنگھو پاکستان، چچا سام کے ساتھ، ماؤزے تنگ ایک یاد کے نام سے لکھے گئے سفر نامے ایک مجموعے کی شکل میں شائع ہوئے۔ اشفاق احمد کو خدا تعالیٰ نے مناظر کو، تصاویر کو کاغذ پہ اتارنے کی صلاحیت دی ہوئی تھی۔ لہذا اپنے مشاہدے کی گہرائی اور گیرائی کے سبب وہ ایسا غضب کا نقشہ کھینچتے تھے کہ قاری خود کو اس مقام پر گھومتا پھرتا محسوس کرتا۔ بعض مناظر کی حیرت انگیز حد تک تصویر کشی کی بدولت قاری خود کو اس جگہ پر موجود پاتا ہے تو یہ اشفاق احمد کا کمال تھا۔ گو کہ اس صنف میں اشفاق احمد نے بہت تھوڑا لکھا مگر جو کچھ بھی لکھا وہ ایک ماہر سفر نامہ نگار کی حیثیت سے ان کے مقام کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ بہت سے سفر نامے ہمیں ایسے بھی پڑھنے کو ملتے ہیں جو کہ لکھاری صرف اس لیے لکھ رہا ہوتا ہے کہ وہ یہ ظاہر کر سکے کہ وہ اس ملک یا علاقے کی سیر کر آیا ہے اور اردو زبان میں لکھنا پڑھنا جانتا ہے۔ ایسے سفر ناموں سے مشہور مقامات، ہوٹلوں، کلبوں، راستوں، شاہراؤں وغیرہ کے بارے میں تو معلومات مل جاتی ہیں مگر یہی کام ایک ادیب کرتا ہے تو اس کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ کبھی بھی قاری کو اپنے سے الگ نہیں ہونے دیتا ہے۔ جس علاقے کا سفر نامہ ہوتا ہے وہاں کے پوشیدہ مناظر اور معلومات کو بھی قاری کے سامنے لا کے رکھ دیتا ہے۔ ایسے مناظر جو عام لوگوں کی نظروں سے تو اوجھل ہوتے ہیں مگر ان کا جاننا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اس علاقے کی تاریخ، تہذیب، تمدن، رسوم و رواج، لوگوں کی عادات، طرز زندگی، عادات پر اثر انداز ہونے والے عوامل، عوام کی ذہنی سطح و دیگر حالات کے بارے میں مکمل آگاہی ایک صاحب طرز ادیب ہی دے سکتا ہے اور یہ خوبی اشفاق احمد میں موجود تھی۔ اٹلی کے شہر روم میں جب اشفاق احمد کو قیام کا موقع ملا تو انھوں نے اس دوران کے حالات و واقعات کو قلمبند کیا۔ نیویارک شہر کے بارے میں یوں تو بہت سارے لوگوں نے لکھا ہے مگر اشفاق احمد نے زور قلم سے جو رنگ بکھیرے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ "سفر در سفر" میں اشفاق احمد نے اپنی موت کے بعد کے مناظر کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ انھوں نے خوبصورت انداز میں فنا و بقا کا اصول بیان کیا کہ کس طرح ایک انسان کے مر جانے سے نظام زندگی رک نہیں جاتا بلکہ نظام کائنات اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ انھوں نے ریڈیو، ٹیلی ویژن کی رنگارنگ دنیا کو اسی طرح اپنی موت کے بعد بھی آباد دیکھا۔ سکول، مدرسہ، بازار، کاروبار، ٹانگہ گاڑی، ناظرین، ڈرامہ، ریڈیو اسٹیشن الغرض سب کچھ اسی طرح چلتا رہا ہے۔ اشفاق احمد نے اس خوبصورت اور دکھ بھرے انداز میں

تصویر کشی کی ہے کہ انسان کے آنسو نکل آتے ہیں اور انسان کو دنیا کی بے ثباتی کا یقین ہو جاتا ہے۔ انسان کی اپنی اہمیت اور اوقات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی انسان کے ہونے یا نہ ہونے سے نظام قدرت پہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

داستان گو اور زاویہ

بنیادی طور پر اشفاق احمد داستان گو تھے۔ انسان شروع سے ہی قصے کہانیاں سننے کا شوقین رہا ہے۔ یہ اضافی وصف اللہ تعالیٰ نے اشفاق احمد کو دیا ہوا تھا کہ وہ اپنی گفتگو سے دلوں کو موہ لیتے تھے۔ کبھی بھی ان کی گفتگو کے دوران لوگوں نے اکتاہٹ یا بیزاری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اشفاق احمد کی گفتگو، مکالمے، ان کے بابے، ان کی گفتگو اور تحریروں میں پیش کیے جانے والے اعداد و شمار تمام کے تمام ان کی داستان گوئی کا ہی حصہ تھے۔ بات کو بڑھانے کے لیے اس کو ڈرامائی صورت حال دے دینا یا چانک ملاقاتی، سامعین یا ناظرین کو چونکا دینے کا فن انھیں آتا تھا۔ علم و حکمت سے لبریز، مزاح کی چاشنی لیے ان کی باتیں سننے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی تھیں اور خواہش ہوتی کہ وہ بولتے جائیں اور سننے والے سنتے جائیں۔ دانش مندی، حکمت، فلسفہ، سائنس اور تصوف سے بھرپور گفتگو نے ہی ان کے ریڈیو پروگرام تلقین شاہ کو اتنا کامیاب کیا تھا کہ لوگ ریڈیو سے لگ کر بیٹھ جاتے تھے اور پروگرام کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ سوچ متوازن اور معتدل تھی جس کی وجہ سے ہر فکر، سطح اور طبقے کے لوگوں میں مقبول تھے۔ وہ تجربات کے عادی انسان تھے۔

ریڈیو پاکستان کے لیے مختلف نوعیت کے پروگرام تجرباتی طور پر پیش کیے جو کہ بہت مقبول ہوئے۔ ان میں دستاویزی پروگرام، تقریریں (لیکچرز) فیچرز، انٹرویوز وغیرہ شامل ہیں۔ ٹیلی ویژن پر ان کے لیکچرز کا پروگرام زاویہ کے نام سے شروع کیا گیا۔ یہ پروگرام ۱۹۹۸ء کو پہلی بار ٹیلی کاسٹ ہوا۔ زاویہ پروگرام میں بیس سے پچیس شرکائے کرام کو دعوت دی جاتی تھی جن کے سامنے اشفاق احمد کسی ایک موضوع پر لیکچر دیا کرتے تھے۔ بیس سے پچیس منٹ دورانیے کے اس پروگرام کے ابتدائی حصے میں اشفاق احمد کسی موضوع پر بات چیت کیا کرتے تھے اور آخری حصے میں شرکاء کے سوالوں کے جواب دیا کرتے تھے۔ شوکت زین العابدین اس پروگرام کے پروڈیوسر تھے۔ وہ زاویہ پروگرام کی تاریخ کے حوالے سے اپنی یادیں تازہ کرتے ہوئے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

پروگرام زاویہ پہلی بار ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو ٹیلی کاسٹ ہوا اور اس کے پروڈیوسر اعظم خورشید

تھے۔ انھوں نے ۳۸ پروگرام ریکارڈ کیے اور ریٹائر ہو گئے۔ شوکت زین العابدین نے پہلا

پروگرام ۲۱ نومبر ۲۰۰۲ء کو پی ٹی وی لاہور سے نشر کیا اور یہ سلسلہ ۱۴ فروری ۲۰۰۴ء اشفاق

احمد کی علالت تک جاری رہا۔ ریکارڈنگ کا سلسلہ قریباً ساڑھے تین برس تک جاری رہا۔ شوکت

زین نے ۵۵ پروگرام ریکارڈ کیے جبکہ کل ۹۰ پروگرام ریکارڈ ہوئے۔^{۳۳}

زاویہ پروگرام ایک طرح سے نیا تجربہ تھا جو کہ اشفاق احمد کی شخصیت، طرز گفتگو اور انداز داستان گوئی کی بدولت کامیاب رہا۔ شرکاء کو تسلی بخش جوابات دینا، ان کے سوالات تخیل سے سننا، ان کی آمد و رفت، نشست و برخاست کا اہتمام، ریکارڈنگ کے لیے سیٹ لگانا، سیٹ میں بھی متنوع قسم کی تبدیلیاں کرتے رہنا تاکہ یکسانیت کی وجہ سے بوریت اور اکتاہٹ کا احساس نہ پیدا ہو جائے۔ یہ اشفاق احمد کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ زاویہ پروگرام کے لیکچرر اور گفتگو کو کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔ جو کہ ضخیم ہونے کی بنا پر دو حصوں میں اشاعت پذیر ہوا۔ حصہ اول ۲۰۰۴ء اور حصہ دوم ۲۰۰۵ء میں منظر عام آیا اس کے موضوعات میں چند ایک خاص درج ذیل ہیں۔

پنجاب کا دوپٹہ، وقت ایک تحفہ، خوشی کا راز، ویل واشنگ، تنقید اور تائی کا فلسفہ، ترقی کا ابلسی ناچ، بابے کی تلاش، ڈپریشن کا نشہ، شک، رشوت، محاورے، نظربد، اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، چغلی میٹنگ، من کی آلودگی، Psycho Analysis، تحائف، عالم اصغر سے عالم اکبر تک، بانسری، جیر ابلید^{۳۴}

زاویہ پروگرام کے موضوعات پر قدرے تنقید بھی ہوتی رہی ہے۔ چونکہ اشفاق احمد بطور مصلح، ناصح اور مبلغ گفتگو کیا کرتے تھے۔ یہ تمام کے تمام پروگرام اصلاحی پہلو لیے ہوتے تھے اور کسی پہ تنقید نہ کی جاتی تھی۔ اشفاق احمد کا اس سلسلے میں کہنا تھا کہ میری گفتگو کو اصل روح کے مطابق سمجھا ہی نہیں جاتا ہے لہذا اختلاف پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ لیکن اس بحث سے ہٹ کر ان کا یہ پروگرام عوامی مقبولیت اور پذیرائی کے لحاظ سے اہم مقام اور مرتبے کا حامل پروگرام تھا۔

شاعری

اشفاق احمد کو اللہ تعالیٰ نے علم اور اظہار کی طاقت دی تھی اس کا جادو انھوں نے نظم اور نثر میں خوب جگایا۔ نثر میں بطور ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، سفر نامہ نگار، فیچر رائٹر کام کر کے خوب نام کمایا مگر ان کی ادبی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی شاعری ہے۔ اشفاق احمد نے شاعری کے لیے اردو کی بجائے پنجابی زبان کو منتخب کیا اور اس میں شعر و شاعری کرتے رہے۔ اشفاق احمد باقاعدہ پنجابی شاعر نہ تھے مگر انھوں نے باقاعدہ شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی پنجابی شاعری میں طبع آزمائی کی۔ "اشفاق احمد کی ایک کتاب" کھٹیا وٹیا" ۱۹۵۸ء میں داستان گو پبلشرز نے شائع کی۔ یہ کتاب پنجابی نظموں، کافیوں اور بولیوں پر مشتمل ہے۔^{۳۵} اشفاق احمد کے کلام میں جہاں پرانے شعراء کی چھاپ نظر آتی ہے وہیں پر انھوں نے جدید خیالات اور معاشرتی موضوعات کو بھی اپنے کلام کا حصہ بنایا جس کی بدولت آپ کی پنجابی شاعری کو اردو داں طبقے میں بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ اس مجموعے میں ۶۹ نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں پر پنجاب کے صوفی شعراء حضرت بلھے شاہ، حضرت سلطان باہو اور شاہ حسین وغیرہ کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ بلکہ بہت سی جگہوں پر انھوں نے ان

صوفیائے کرام کے کلام کو اپنے منظوم پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح اشفاق احمد نے اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ و تراکیب اور مستعمل اصطلاحات کو بھی خوبصورتی کے ساتھ پنجابی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے لوک دانش، روزمرہ، ضرب الامثال، کہاوتوں اور محاورات کو بھی جگہ دی ہے۔ اشفاق احمد کا پنجابی سے لگاؤ ہی تھا کہ انھوں نے ۱۹۶۷ء میں آنریری لیکچرر پنجابی کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ شعبہ پنجابی پنجاب یونیورسٹی کے چیئرمین ڈاکٹر شہباز ملک نے اشفاق احمد کو پنجابی زبان کے محسنوں میں شمار کیا ہے۔ وہ اپنے مضمون میں بتاتے ہیں کہ اشفاق احمد نے پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ پنجابی کے اجراء، نصاب سازی اور تدریسی عمل میں بذات خود حصہ لیا جبکہ ان کا لکھا ہوا ڈرامہ ٹاہلی دے تھلے ۱۹۶۰ء سے اب تک ایم اے پنجابی کے نصاب میں شامل ہے۔ دیگر خدمات کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں۔

اونہاں مرکزی اردو بورڈ تے سائنس بورڈ دے ڈائریکٹر ہون دی حیثیت وچ پنجابی زبان تے ادب بارے جو کم کروائے اودی پنجابی ادب وچ میل پتھر دادر جہ رکھ دے نیں۔ اہناں وچ اردو پنجابی لغت ۱۹۷۲ء (مرتبہ ارشاد پنجابی) پنجابی اردو لغت ۱۹۸۹ء مرتبہ تنویر بخاری تے اردو کے خواہیدہ الفاظ ۱۹۷۲ء مرتبہ اشفاق احمد ذکر دے قابل نیں۔^{۳۱}

درج بالا پنجابی اقتباس میں ڈاکٹر شہباز ملک نے اشفاق احمد کی پنجابی زبان کے لیے خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی خدمات سنگ میل کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے اشفاق احمد کی خدمات بطور ڈائریکٹر مرکزی اردو بورڈ و سائنس بورڈ کا بھی ذکر کیا ہے کہ ان کوششوں سے پنجابی زبان کی پہلی لغت ۱۹۷۲ء میں مرتب کی گئی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اشفاق احمد کی شخصیت کا یہ ایک ایسا پہلو ہے جو عمومی طور پر نظروں سے اوجھل رہا مگر شاعر اور لغت مرتب کرنے کے حوالے سے اشفاق احمد کی پنجابی زبان کے لیے خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

اشفاق احمد بحیثیت ناول نگار اور مترجم

۱۹۶۰ء کی دہائی میں اشفاق احمد نے ناول نگار اور بحیثیت مترجم بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ۱۹۵۵ء میں ان کا ناولٹ "مہمان بہار" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ایک قسط وار کہانی کی شکل میں چھپتا رہا جسے کتابی شکل میں ۱۹۵۵ء میں شائع کیا گیا۔ بعد میں یہ ناولٹ ان کے افسانوی مجموعے "سفر مینا" میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا ایک اور ناول "کھیل تماشا" کے نام سے سال ۲۰۰۰ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ گو کہ اس میدان میں بھی اگر اشفاق احمد مزید کام کرتے تو بہت اچھا ادب تخلیق کر سکتے تھے مگر ان کی پہلی ترجیح اب ٹیلی ویژن اور ریڈیو تھا جس کی ریکارڈنگ وغیرہ کے معاملات میں ہی مصروف رہتے تھے۔ اشفاق احمد نے ناولٹ بھی فرمائشی طور پر لکھا تھا کیونکہ نقوش کا ناولٹ

نمبر چھپنا تھا تو دوستوں نے کہا کہ آپ بھی لکھ کر دیں تو اس طرح یہ ناولٹ لکھا گیا۔ یہ ناولٹ بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تھا مگر اشفاق احمد نے اس صنف میں مزید کام نہ کیا۔ ۱۹۶۰ء ہی میں اشفاق احمد کے انگلش سے اردو تراجم بھی شائع ہوئے۔ ترجمہ نگاری کے حوالے سے اے حمید نے اپنی کتاب "اشفاق احمد شخصیت و فن" میں لکھا ہے۔

ہیمنگوے کی A Farewell to Arms کا انگریزی سے اشفاق احمد نے "وداع جنگ"

کے نام سے ترجمہ کیا جو دو جلدوں میں شائع ہوا تو بہت مقبول ہوا۔ اسی طرح ازرتاشی کے ناول

The Golden Hawks کا ترجمہ چنگیز خان کے "سنہری شاہین" اور ہیلن ٹیکٹر کی

تراسی صفحات کی کتاب Getting along with others کا ترجمہ "دوسروں سے

نباہ" کے نام سے کیا تو ترجمے کا حق ادا کر دیا۔^{۳۷}

ترجمہ نگاری ایک مشکل اور پیچیدہ فن ہے اور اس فن کے تقاضے اور معیار الگ سے ہوتے ہیں۔ مترجم کو فنی مہارت سے جہاں اصل عبارت کو سامنے رکھنا ہوتا ہے وہیں ترجمہ کی جانے والی زبان کی مقامی ضروریات اور تقاضے بھی مد نظر رکھنا ہوتے ہیں مگر اشفاق احمد نے اس کو بھی بخوبی کر ڈالا اور اے حمید کی رائے کے مطابق ترجمے کا حق ادا کر دیا۔

علمی و ادبی مجالس کی رکنیت

اشفاق احمد ایک دانش ور اور عہد ساز ادیب تھے۔ ان کی زندگی میں ہی ان کے افکار و نظریات سے استفادہ کے لیے ان کو مختلف اہم اداروں اور مجالس کی رکنیت اور اعزازی ممبر شپ دی گئی۔ کسی بھی ادیب اور لکھاری کے لیے جہاں یہ بات اعزاز کا درجہ رکھتی ہے وہیں لکھاری اور ادیب کو خدمت اور تخلیق کاری کے لیے ایسا فورم بھی میسر آ جاتا ہے جہاں وہ احسن طریقے سے اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکتے ہیں۔ منفرد اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک اشفاق احمد کو بھی مختلف تعلیمی اداروں اور ادبی مجالس کی رکنیت اور اعزازی ممبر شپ دی گئی تھی جس کی تفصیل ادب لطیف کے اشفاق احمد نمبر میں یوں درج ہے۔

ممبر انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ممبر پاکستان کورسز کمیٹی بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، لاہور

ممبر تعلیم بالغاں سوسائٹی، گوجرانوالہ

ممبر بورڈ آف سٹڈیز (پنجابی) پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ممبر اکادمی ادبیات پاکستان (Executive Body) اسلام آباد پاکستان

ممبر انجمن ترقی اردو بورڈ کراچی، پاکستان

ممبر مرکزی کمیٹی برائے پاکستان، برکے اردو پراگرام، برکے یونیورسٹی، امریکہ
ممبر، بحیرہ کمیٹی اسلام آباد

ممبر نیشنل کونسل آف دی آرٹس، اسلام آباد
اعزازی چیف ایڈیٹر، ماہنامہ سکھی گھر، لاہور۔^{۳۸}

اعزاز

کسی بھی لکھاری، تخلیق کار اور ادیب کے لیے اس کی شہرت اور مقبولیت کے ساتھ قارئین کی پسندیدگی ہی سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ مگر بعض ادارے اور تنظیمیں بھی ادیبوں کو وقتاً فوقتاً خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اعزازات پیش کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ حکومتی ادارے بھی سرکاری طور پر خاص دنوں اور مواقع پر مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات کی خدمات کا اعتراف کرتی ہیں۔ اشفاق احمد کو بھی مختلف اعزاز اور تمغوں سے نوازا گیا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ادب کا "تمغہ حسن کارکردگی" ۱۹۷۹ء

گر بیجوٹ ایوارڈ، چار مرتبہ

مجید الملکی ایوارڈ

ستارہ امتیاز (حکومت پاکستان)

دوحہ قطر ایوارڈ^{۳۹}

اشفاق احمد ایسے ادیب تھے جنہوں نے اپنی زندگی میں ہی عزت و شہرت پائی۔ عام طور پر ہمارے معاشرے میں شہرت اور خدمات کا اعتراف کسی ادیب کی زندگی میں کم ہی کیا جاتا ہے۔ مگر اشفاق احمد اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ انہیں معاصرین، ناقدین اور قارئین نے ان کی زندگی میں ہی اور بعد از وفات بھی عظمت کا اعتراف کیا۔

اشفاق احمد کی وفات مورخہ ۷ ستمبر ۲۰۰۴ء کو ہوئی۔ ان کی وفات کی خبر کو دکھ اور افسوس کے ساتھ شہ سرخیوں کی صورت میں پاکستان کے قومی اخبارات نے شائع کیا۔ روزنامہ مساوات کے مطابق
”معروف مصنف اور دانشور اشفاق احمد منگل کو لاہور انتقال کر گئے۔ ان کی عمر اسی سال تھی۔“^{۴۰}
ان کو منگل کی شام لاہور کے قبرستان ماڈل ٹاؤن میں دفن کر دیا گیا۔

He was laid to rest on Tuesday evening
at graveyard of Model Town.^{۴۱}

ان کی وفات کی خبر کو بین الاقوامی اخبارات نے بھی نمایاں طور پر شائع کیا۔ جبکہ قومی و بین الاقوامی الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا پہ بھی ان کی وفات کی خبر کو نمایاں جگہ دی گئی۔ اشفاق احمد کی وفات پہ اخبارات میں مضامین لکھے گئے جبکہ ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنماؤں، سماجی کارکنوں نے بھی گہرے غم اور دکھ کا اظہار کیا۔ ادبی حلقوں میں ان کی یاد میں تعزیتی ریفرنس و دیگر تقریبات کا انعقاد اہتمام کیا گیا جہاں محققین، ناقدین اور دیگر حلقوں کی جانب سے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور ان کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ یہ سچ ہے کہ ان کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا تادیر پُر نہیں ہو سکے گا اور ان کی کمی محسوس ہوتی رہے گی۔ ادبی دنیا ایک ادیب اور دانشور سے محروم ہو گئی۔ جس کے کئی روپ تھے۔ داستان سرائے کا داستان گو، زاویہ کا تلقین شاہ، گڈریے کا داؤ جی چل بسا لیکن ان کے الفاظ، تحریریں اور خدمات کو قاری اور لکھاری فراموش نہیں کر سکیں گے۔ چونکہ اشفاق احمد کا مقصد اصلاحی تھا، تنقیدی نہیں دوسرا وہ معاشرے کی فلاح اور انسانیت کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے، محبتیں بانٹنا ان کا کام تھا اور آسانیاں تقسیم کرنا ان کا مشغلہ۔ اس لیے وہ لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہو سکیں گے۔ وہ اپنے مشن اور مقصد میں کامیاب رہے جس کی گواہی ان کی عظمت کا اعتراف ہے۔

اردو کی نثری اصناف میں افسانے کو اہم مقام حاصل ہے۔ اردو افسانہ داستان اور ناول سے ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا موجودہ شکل میں موجود ہے۔ چونکہ قصہ کہانی سننا سنانا زمانہ قدیم سے ہی انسان کا محبوب مشغلہ رہا ہے اس لیے اس کو ہر دور میں ہی پسند کیا جاتا رہا ہے۔ انیسویں صدی میں برصغیر میں انگریز حکومت کی وجہ مغربی ادب کے اثرات کی بدولت ناول کے بعد افسانہ نگاری شروع ہوئی۔ افسانہ مختصر کہانی کا دوسرا نام ہے۔ اس مختصر طرز کی کہانی میں لکھاری کسی ایک واقعہ یا کسی ایک پہلو کو بیان کرتا ہے۔ کسی ایک تاثر کو بیان کر دینا کہ وہ پڑھنے والوں کو متاثر کر سکے۔ اسی بنا پر افسانہ ناول اور داستان یا ڈرامہ سے الگ اپنا مقام بنانے میں کامیاب رہا ہے۔ کیونکہ یہ تھوڑے سے وقت میں پڑھی جانے والی صنف ہے۔ افسانہ نگاری کی صنف کو شروع سے ہی عوام میں مقبولیت اور پسندیدگی حاصل رہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ رہی ہے کہ اردو ادب میں ابتدائی زمانے میں ہی شاہکار افسانے لکھے گئے۔

افسانہ کے اجزا میں پلاٹ، کہانی، منظر، کردار، مکالمے وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے۔ جہاں دیگر اجزا کا ہونا افسانے کے لیے نہایت ضروری ہے وہیں پر کردار افسانے میں اہم مقام اور مرتبے کے حامل ہوتے ہیں۔ کردار نگاری الگ ایک اہم مہارت اور فن کا نام ہے اور جو لکھاری اس فن میں مہارت کا حامل ہوتا ہے، وہ اسی مہارت کے بل بوتے پر جب اپنے فن پارے کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے تو وہ عوامی مقبولیت اور پذیرائی کا باعث بنتا ہے۔ ہر لکھاری کو اس فن میں مہارت نہیں حاصل ہوتی ہے۔ وہ لکھاری جس کا اپنا مشاہدہ گہرا ہو، زمانے کے حادثات سے گزرا ہوا ہو اور زندگی کے حالات و واقعات

کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہو تو ایسا ادیب، لکھاری اور افسانہ نگار جب بھی کردار نگاری کرے گا تو بے مثال اور لا جواب کردار سامنے لائے گا۔

کردار کسی بھی شخص کے ذاتی اوصاف و خصائل اور عادات اطوار کو لفظی شکل میں پیش کرنے کا نام ہے۔ کسی بھی شخص کی سیرت، وضع قطع، رنگ روپ، شکل و صورت اور چال ڈھال کو سامنے لانا اور اپنے تخیل کی مدد سے کہانی کا حصہ بنانا کہ اس پہ حقیقی ہونے کا گمان گزرے، یہ کردار نگاری میں مہارت کہلاتی ہے۔ افسانہ نگار کردار کی بدولت ہی کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ ایک کامیاب لکھاری اپنے افسانوں میں ایسے کردار پیش کرتا ہے جو معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں اور چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے افسانہ نگار کو عہد اور معاشرے کی جملہ خصوصیات سے آگاہی کا ہونا اشد ضروری ہے۔ افسانے اور ناول میں کردار کی بہت سی اقسام موجود ہوتی ہیں۔ افسانے میں قارئین کو یکسانیت اور یوریت سے بچانے کے لیے کئی انواع اور اقسام کے کردار پیش کیے جاتے ہیں۔ جنس کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق مذکر اور مونث کی صورت میں موجود ہے اس لیے جنس کے لحاظ سے مردانہ اور نسوانی کردار سامنے آتے ہیں۔ اگر کرداروں کے مزاج کو دیکھا جائے تو کچھ انسانوں کا مزاج سنجیدہ ہوتا ہے اور کچھ مزاج مزاح کے دلدادہ اور شوقین ہوتے ہیں۔ اسی طرح افسانوں میں بھی کہانی اور واقعات کے تقاضوں کے مطابق المیہ کردار یا سنجیدہ کردار شامل کیے جاتے ہیں۔ افسانے میں دلچسپی اور خوشگوار فضا قائم کرنے کے لیے مزاحیہ یا مضحکہ خیز افسانے کا حصہ بنائے جاتے ہیں۔ یہ کوئی بھولا بھالا شخص بھی ہو سکتا ہے جو اپنی حرکتوں یا سادگی کی بنا پر مزاح پیدا کرتا رہتا ہے۔ ان کو عام طور پر کسی خاص طبقے کی نمائندگی کے لیے شامل کیا جاتا ہے۔

اگر فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو مرکزی کردار اور ذیلی یا ضمنی کردار کی اقسام سامنے آتی ہیں۔ ایسا کردار جس کے گرد افسانے کی ساری کہانی گھومتی ہے اور اسے ہی کسی بھی افسانے میں مرکزیت حاصل ہوتی ہے ایسا کردار مرکزی کردار کہلاتا ہے۔ مگر صرف ایک ہی کردار کی بدولت کہانی اور افسانہ کا منطقی انجام تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے اس لیے ضمنی کردار شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ مرکزی کردار کے تابع ہوتے ہیں اور کہانی کو آگے بڑھانے میں معاونت فراہم کرتے ہیں۔ ضمنی کردار مختصر وقت کے لیے بھی ظاہر ہو سکتے ہیں اور کبھی کبھی کہانی میں مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ یہ کسی بھی افسانے کی ضرورت پر ہی منحصر ہوتا ہے۔

ہئیت اور تکنیک کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اکہرے کردار، مرکب کردار، مجہول کردار، پہلودار یا پیچیدہ کردار سامنے آتے ہیں۔ اکہرے کردار زندگی یا شخصیت کے کسی ایک ہی پہلو کو لیے ہوتے ہیں۔ ان میں کسی کردار کو صرف ایک ہی زاویہ سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ جبکہ مرکب کردار ایسے کردار ہوتے ہیں جو ایک سے زائد پہلوؤں پہ مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں

ایک سے زائد رویوں اور طرز عمل کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ یہ بھی کسی افسانے میں کسی خاص صورت حال کو پیش کرنے اور سامنے لانے کے لیے شامل کیے جاتے ہیں۔ پیچیدہ اور پہلو دار کردار نہ سمجھ میں آنے والی شخصیت کی نمائندگی کے لیے شامل کیے جاتے ہیں۔ ایک ہی افسانے میں ان کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے لائے جاتے ہیں۔ جیسا ان کو دکھایا جاتا ہے ویسے وہ ہوتے نہیں ہیں اس لیے ان کو پیچیدہ کردار کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اثر پذیری اور اثر انداز ہونے کے حوالے سے دیکھا جائے تو محدود کردار، ادھورے کردار اور مکمل کردار جیسی اقسام دکھائی دیتی ہیں۔ موضوع کو بھی شامل کر لیا جائے تو اخلاقی و اصلاحی کردار اور خیر و شر کے زاویے سے بننے والے کردار، تخیلی و رومانوی کردار، جنسی کردار اور باغی کردار جیسی اقسام بھی سامنے آتی ہیں۔ اخلاقی اور اصلاحی کرداروں کے ذریعے کوئی بھی لکھاری اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ کسی کہانی میں کوئی اخلاقی یا اصلاحی سبق آموز پیغام پہنچانے کے لیے اس قسم کے کرداروں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ رومانوی اور عشقیہ کردار ایسی کہانیوں کا حصہ ہوتے ہیں جس میں پیار و محبت اور عشق و عاشقی کے قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ ظلم و جبر کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا اور معاشرے کے رسم و رواج و امتیازات سے بغاوت بھی انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ معاشرے میں رائج نظام مثلاً جاگیر داری، سرمایہ دارانہ نظام وغیرہ کے خلاف جدوجہد کرنے والے کردار باغی کردار کہلاتے ہیں۔

دیکھا جائے تو کردار نگاری میں یہ رنگارنگی اور انواع و اقسام کی موجودگی ہی افسانے کے قارئین کے لیے یکسانیت، بوریت اور اکتاہٹ سے بچاؤ کا باعث بھی ہے اور افسانے کی صنف کی مقبولیت کا سبب بھی ہے۔ کرداروں کی یہ مختلف اقسام ہمیں کہانیوں میں دکھائی دیتی رہتی ہیں۔ کوئی بھی افسانہ نگار ان کا سہارا لے کر قارئین اور ناقدین میں قبولیت حاصل کرتا ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، الو قار پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۲۲
- ۲۔ انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ۱۹۹۸ء ص ۱۰
- ۳۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی اسلام آباد ۲۰۰۷ء ص ۲۰
- ۴۔ سید وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد ۱۹۳۵ء ص ۱۰۳
- ۵۔ ڈاکٹر نجم الہدی، کردار اور کردار نگاری، میر بخش علی اسٹریٹ مدراس ۱۹۸۰ء ص ۶
- ۶۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، مرتب، فرہنگ اصطلاحات (انگریزی اردو) Glossary of Technical Terms
ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۸ء اشاعت اول ص ۵۷
۷. The World Book of Encyclopedia, Volum ۵, Field enterprises
education corporation ,Chicago, London ,Rome, Sydney,
Toronto. Copy right ۱۹۷۰ (Printed in USA) Page ۲۶۹
- ۸۔ ڈاکٹر خیال امر و ہوی، مترجم، لغات سماجی علوم و فلسفہ یو پبلشرز اردو بازار لاہور ۲۰۰۸ء ص ۵۸
- ۹۔ ایضاً، ص ۵۸
- ۱۰۔ وارث سرہندی، قاموس مترادفات، اردو سائنس بورڈ پرمال لاہور ۱۹۸۶ء ص ۷۸۲
- ۱۱۔ خواجہ عبد المجید، مولفہ و مرتبہ، جامع اللغات، جلد دوم، اردو سائنس بورڈ لاہور س۔ ن ص ۱۱۴-۱۱۵
- ۱۲۔ مولوی فیروز الدین، مرتبہ و مولفہ، فیروز اللغات، فیروز سنز لاہور ۲۰۰۱ء ص ۵۳۴
- ۱۳۔ سید قائم رضا نسیم امر و ہوی، سید مرتضی فاضل لکھنوی (اردو مترجمین) نسیم اللغات، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور
س۔ ن، ص ۸۸۹
- ۱۴۔ محمد عبداللہ خان خوینگی، مرتبہ، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۹ء ص ۴۹
- ۱۵۔ ابوالعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب لاہور ۲۰۱۵ء ص ۳۸۸
- ۱۶۔ گوپی چند نارنگ، نیا اردو افسانہ، انتخاب، تجزیے اور مباحث، اسلم پبلشرز کراچی ۱۹۸۹ء ص ۳۱
- ۱۷۔ ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی، ناول کیا ہے؟ درداکادمی لاہور ۱۹۶۴ء ص ۲۶
- ۱۸۔ عبدالقادر سروری، کردار اور افسانہ، حصہ دوم، مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن ۱۹۲۹ء ص ۶

- ۱۹۔ سید عابد علی عابد، اصول انتقاد ادبیات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰ء ص ۵۰۸
- ۲۰۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۲۰۱۶ء اشاعت دوم ص ۲۳۳-۲۳۳
- ۲۱۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۲۰۱۶ء اشاعت دوم ص ۲۲۲
- ۲۲۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۲۰۱۶ء اشاعت دوم ص ۲۳۸
- ۲۳۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۲۰۱۶ء اشاعت دوم ص ۲۳۳
- ۲۴۔ اے حمید، اشفاق احمد شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد ۱۹۹۸ء ص ۱
- ۲۵۔ نوید الحسن، توقیت اشفاق (مضمون) مشمولہ راوی اشفاق نمبر جی سی یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء ص ۱
- ۲۶۔ ایضاً، ص ۱
- ۲۷۔ جمیل احمد، اشفاق احمد Top Shot (مضمون) مشمولہ راوی اشفاق نمبر جی سی یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء ص ۹۲
- ۲۸۔ نوید الحسن، توقیت اشفاق (مضمون) مشمولہ راوی اشفاق نمبر جی سی یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء ص ۱
- ۲۹۔ ایضاً، ص ۱
- ۳۰۔ اے حمید، اشفاق احمد شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد ۱۹۹۸ء ص ۴
- ۳۱۔ امجد اسلام امجد، رجحان ساز ڈرامہ نگار (مضمون) مشمولہ راوی اشفاق نمبر جی سی یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء ص ۸۸
- ۳۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۸۲ء ص ۲۷۷
- ۳۳۔ شوکت زین العابدین، زاویہ کی تاریخ (مضمون) مشمولہ راوی اشفاق نمبر جی سی یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء ص ۸۵
- ۳۴۔ نوید الحسن، توقیت اشفاق (مضمون) مشمولہ راوی اشفاق نمبر جی سی یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء ص ۵
- ۳۵۔ امتیاز حسین، اشفاق احمد کی پنجابی شاعری (مضمون) مشمولہ راوی اشفاق نمبر جی سی یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء ص ۱۰۲
- ۳۶۔ ڈاکٹر شہباز ملک، ٹاہلی دے تھلے، کسمولہ راوی اشفاق نمبر جی سی یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء ص ۳۵۸
- ۳۷۔ اے حمید، اشفاق احمد شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد ۱۹۹۸ء ص ۶۹
- ۳۸۔ سوانحی خاکہ، (مضمون) ماہنامہ ادب لطیف جلد نمبر ۷۰ شمارہ نمبر ۵ لاہور مئی ۲۰۰۵ء ص ۱۳
- ۳۹۔ نوید الحسن، توقیت اشفاق (مضمون) مشمولہ راوی اشفاق نمبر جی سی یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء ص ۲
- ۴۰۔ روزنامہ مساوات، لاہور، بدھ ۸ ستمبر ۲۰۰۴ء

باب دوم

اشفاق احمد کے افسانوں کے مردانہ کردار

اشفاق احمد کا پہلا افسانوی مجموعہ "ایک محبت سو افسانے" کے نام سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل تیرہ افسانے ہیں۔ جن میں توبہ، رات بیت رہی ہے، مسکن، توتا کہانی، پناہیں، بندر ابن کی کچ گلی میں اور امی جیسے مشہور افسانے شامل ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں "اجلے پھول" کے نام سے دوسرا افسانوی مجموعہ شائع ہوا۔ جس میں نو افسانے شامل ہیں۔ جن میں اجلے پھول، گڈریا، صفدر ٹھیلّا، ایل ویرا، برکھا اور گل ٹریا قابل ذکر ہیں۔

الف: "ایک محبت سو افسانے" کے مرکزی کردار

اعجاز (توبہ)

اشفاق احمد کا پہلا افسانہ ۱۹۴۲ء میں "توبہ" کے نام سے اس زمانے کے انتہائی معیاری ادبی رسالے "ادبی دنیا" میں شائع ہوا جبکہ اس وقت افسانہ نگار کی عمر محض سترہ سال تھی۔ اشفاق احمد شروع سے ہی محبت کے پیامبر بن کر سامنے آئے اور دلوں پہ چھا گئے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک نوجوان اعجاز ایک رومانوی کردار ہے جو کہ سگریٹ نوشی جیسی عادت بد کا شکار ہے۔ اس کے والدین بیٹے کی اس عادت سے تنگ تھے اور اس کو ہر قیمت پر سگریٹ نوشی جیسی بلا سے بچانا چاہتے ہیں۔ اس کی والدہ نے اس کو روپے پیسے کا لالچ دیا، کئی دفعہ اس کو سگریٹ چھوڑنے کے وعدے پر دس دس روپے کا انعام دیا مگر یہ باز نہ آیا۔ والدہ نے کوٹ کی غلط جیب میں ہاتھ ڈالا تو سگریٹ برآمد ہوئے تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ قریب بیٹھے والد نے کہا کہ چلو بیٹا تمہارے ساتھ ایک سودا کرتے ہیں۔ سگریٹ چھوڑ دو اور جو مرضی انعام مانگ لو لیکن ہو میری ہمت اور طاقت کے مطابق۔ نوجوان نے سائیکل مانگ لی۔ جو کہ اس کے پاس تھی مگر پرانی کے بدلے نئی سائیکل کا تقاضا کیا۔ جو کہ اس شرط پہ منظور ہوا کہ آئندہ سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ سائیکل ملتے ہی نوجوان پانڈے بھیا کی دکان پہ پہنچتا ہے اور سگریٹ کی ڈبیا خرید لیتا ہے۔ اُن دنوں خالہ کے ہاں شادی پہ جانا ہوا۔ وہاں ایک خوب روڈ و شیزہ لیکھا سے محبت ہو جاتی ہے۔ شادی کے دنوں میں وہ اس سے سگریٹ چھڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ آخر میں خود سگریٹ سلگا لیتی ہے تو یہ سگریٹ پینا چھوڑ دیتا ہے۔ اعجاز نامی نوجوان اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جو کہ ہمارے معاشرے میں ہر دوسرے گھر میں پایا جاتا ہے۔ ہر دوسرے گھر میں والدین اس بات سے پریشان دکھائی دیتے ہیں کہ ان کے بیٹے نے بری صحبت کا شکار ہو کر سگریٹ نوشی جیسی بری عادت کو اپنا لیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس افسانے کا موضوع اور کہانی ہر گھر کی ہے۔ دوسرا اشفاق احمد نے اس کہانی کے ذریعے محبت جیسے آفاقی جذبے کی قوت اور طاقت کو ظاہر کیا ہے کہ کس طرح وہ

نوجوان جس پر ہر حربہ آزمایا گیا۔ ہر ممکن کوشش کی گئی۔ روپے پیسے کا لالچ اور سائیکل جیسے منہ مانگے انعام ملے مگر نوجوان نے اپنی عادت نہ چھوڑی۔ مگر جیسے ہی وہ ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ لڑکی غیر محسوس طریقے سے اس عادت کو چھڑا دیتی ہے۔ افسانے کے آخر میں وہ انتہائی متاثر کن انداز میں سگریٹ نوشی جیسی عادت سے باز رہنے کا اشارہ دے جاتی ہے۔ "لاہور میں اردو افسانے کی روایت" کے مصنف ڈاکٹر طاہر طیب اس مرکزی کردار کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ان کا افسانہ توبہ بھی محبت کے موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے جس میں انسانی نفسیات کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے میں اعجاز کا کردار اہم ہے جو والدین کے کہنے پر سگریٹ نوشی ترک نہیں کرتا مگر لڑکی کے لمس یا محبت کے ہاتھوں سگریٹ نوشی ترک کرنا گوارا کر لیتا ہے۔^۱

اشفاق احمد نے محبت کو بطور ہتھیار استعمال میں لاتے ہوئے ایک اہم معاشرتی پہلو کو اجاگر کیا اور نوجوانوں کی ایک بری عادت میں مبتلا ہو جانے کے رجحان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ چونکہ خود محبت کے داعی تھے لہذا وہ اس مسئلے کا حل بھی محبت میں تلاش کرتے ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار لالچ و انعام، تعریف و ستائش اور جبر و زبردستی سے قابو میں نہیں آتا ہے مگر اپنی محبت کے ہاتھوں وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد نے محبت کے اندر چھپی ہوئی طاقت کو آزمانے کا کلیہ سکھایا ہے۔ انسانی فطرت اور کمزوری سے آگاہ کیا ہے کہ پہاڑ جیسے مضبوط ارادے کا مالک انسان اپنی محبت کے آگے سر بسجود ہو جانا انسانی فطرت ہے۔ اس لحاظ سے اشفاق احمد نے نفسیاتی پہلو بھی سامنے رکھا ہے کہ انسان کی سرشت میں یہ شامل ہے کہ اسے طاقت و اقتدار کے مقابلے میں سرکشی سے باز نہیں رکھا جاسکتا ہے مگر ایک پاکیزہ جذبہ، کسی کا معصوم کردار اور دو میٹھے بول اس کو اپنی قید میں لے لیتے ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار بھی اپنی معصوم محبت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے اور توبہ کر لیتا ہے۔ نوجوان کی ذہنی کیفیت اور محبوبہ کے بارے میں جذبات کو اشفاق احمد نے بھرپور نمائندگی دی ہے۔ نوجوان اپنی محبوبہ لیکھا کا تعارف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

اس کا قد لمبا تھا۔ رنگ سانولا، ناک بہت ستواں اور نیم باز لمبی پلکیں بند ہوتی چھوٹی موٹی کی طرح اتنی پیاری کہ چھو لینے کو جی چاہتا۔ لال قلعہ دہلی کے عجائب گھر میں عین اسی کی شکل کی ایک عرب لڑکی کی تصویر ہے۔ پر دور کیوں جائیے۔ آپ نے کوئی لیکھا نہیں دیکھی۔^۲

یہاں پر اشفاق احمد نے نوجوان کی محبوبہ کا بہت خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ ایک محبوب کے لیے دلی کیفیات اور جذبات کو لفظوں کی شکل دی ہے۔ اوائل نوجوانی اور لڑکپن میں جب کہ نوجوانوں میں جسمانی و بدنی تبدیلیوں کے سبب ذہنی کیفیات بھی تبدیل ہو رہی ہوتی ہیں اور رومانویت کا جذبہ جڑ پکڑ رہا ہوتا ہے۔ عہد شباب میں پہنچتے ہی جنس مخالف کی کشش

میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے تو اس وقت محبوبہ کی جو تصویر ذہن میں بن رہی ہوتی ہے اس کو اشفاق احمد نے بیان کیا ہے۔ اسی طرح لڑکی نے کئی دفعہ پیار بھرے انداز میں سگریٹ کے استعمال پہ ناگواری کا اظہار کیا۔ انتہائی دھیمے لہجے میں وہ سگریٹ سے بیزاری اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہے۔

وہ جانے لگی تو میں بے چین ہو گیا "بس"؟ میں بولا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ وہ ٹھہر گئی۔
 "یہ سیٹی پنسلیں نہ چھٹ سکیں آپ سے۔ پتہ نہیں ان میں کیا مزا ہے" یہ کہہ کر وہ چل دی اور پھر نہ رکی نہ ہی میں نے روکا۔ مزے سے سگریٹ پئے گیا۔^۳

اشفاق احمد نے مرکزی کردار کے ذریعے انسانی فطرت اور نفسیات کے ایک اور پہلو کو بھی سامنے لایا ہے۔ چونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنی کسی برائی، خامی یا عیب کو برا نہیں جانتا ہے اور نہ ہی اسے وہ نظر آتی ہے۔ مگر جب وہ یہ کام کسی کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو کراہت سی محسوس کرتا ہے اور اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ یہاں پر اس افسانے میں مرکزی کردار بھی اسی کیفیت سے دوچار ہوا ہے۔ انسانی نفسیات کے اس کمزور پہلو کو اشفاق احمد نے مرکزی کردار کے ذریعے سامنے لایا ہے اور اس کو بطور ہتھیار اور حربہ استعمال کیا ہے۔ جب مرکزی کردار اپنی محبوبہ کو سگریٹ سلگاتے ہوئے دیکھتا ہے اسے اس کام میں برائی نظر آ جاتی ہے اور وہ سگریٹ نوشی سے توبہ کر لیتا ہے جو کہ اس افسانے کا موضوع بھی ہے۔ کردار نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو مصنف نے اس کو بالکل حقیقی طرز میں پیش کیا ہے اور انسانی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں حقیقت کا رنگ بھرا ہے۔ اس لحاظ سے مرکزی کردار بہت خوبصورت انداز میں کہانی کو منطقی انجام تک پہنچاتا ہے اور مرکزی کردار قارئین پر گہرے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔

فہیم (فہیم)

"فہیم" افسانے کے مرکزی کردار کا نام فہیم ہے۔ اشفاق احمد کے اندر ایک داستان گو چھپا ہوا تھا جو کہ زاویہ اور تلقین شاہ کی صورت میں اس افسانہ کے لکھنے کے کافی عرصے بعد منظر عام پر آیا مگر یہ افسانہ داستان گوئی کی عمدہ مثال ہے۔ اس افسانے کا اسلوب داستانوی ہے۔ اس افسانے میں نانی اماں اپنے بچوں فہیم، سلیم، پروین، نسرین کو کہانی سناتے سناتے ماضی میں کھو جاتی ہیں اور اپنی زندگی اور نانا کے حالات و واقعات سناتی ہیں۔ سردی اور بارش کے موسم میں بچے کہانی سننے سننے سو جاتے ہیں۔ نانی اماں بچوں کو نانا کا تعارف ایک خدا ترس اور ہمدرد انسان کے طور پر کراتی ہیں کہ سرکاری نوکری چھوڑ کر ایک فقیر کے پیچھے چل دیئے۔ وہ فقیر جعلی تھا اور یہ سب کچھ لٹا کر واپس آ گئے۔ ساتھ ہی خدا ترسی اتنی کہ ایک غریب بیوہ عورت بچوں والی ساتھ لے آئے۔ اس کے بچوں کو پڑھائی لکھائی کے واسطے سکول بھیجا اور محنت مزدوری کر کے ان کے کپڑے جو تے کا انتظام کرتے رہے۔ نانا ہر وقت حالت سفر میں رہتے۔ واپسی پہ گھر کوئی تحفہ ضرور لے کر آتے کبھی کوئی

فقیر، عورت یا کتا۔ کتا جو لے آئے تو اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کو کھانا کھلاتے وقت ساتھ رکھتے، خاطر خدمت کرتے۔ کتا بہت سیانا تھا ایک دفعہ ہمسایوں کا نقب لگاتے چوروں کو دیکھ لیا، ان کا پیچھا کیا۔ بعد میں نانا و دیگر لوگوں کے ساتھ جنگل گئے اور مال مسروقہ صندوق کھدائی کر کے برآمد کیا گیا۔ مگر پھر سردیوں کی ایک رات بارش کے موسم میں پپ نامی یہ کتا باہر رہ گیا اور سردی سے ٹھٹھڑ ٹھٹھڑ کر مر گیا۔ جس کے غم میں نانا کو بخار نے آلیا اور وہ اسی بخار کے ساتھ اس دنیا جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ یہ کہانی اس جملے کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی ہے کہ کہانی کا مرکزی کردار فہیم نانی کے سر ہانے بیٹھا رہا ہے جبکہ باقی تین بہن بھائی کہانی سنتے سنتے سو گئے تھے۔ یہ افسانہ اشفاق احمد کے افسانوں میں سے ایک بہترین افسانہ ہے۔ اس میں مرکزی کردار کا نام فہیم رکھا گیا ہے جو کہ اپنے دیگر بہن بھائیوں سے زیادہ عقل و شعور رکھنے والا دکھایا گیا ہے۔ یہ کردار اسم با مسمی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ کرداروں کے نام بھی ایک مکمل سائنس اور فن کی سی حیثیت رکھتے ہیں لہذا اس کردار کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فہم و فراست رکھنے والا ہوگا۔ فہیم کا مطلب ہے سمجھ بوجھ رکھنے والا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اشفاق احمد نے کردار کا نام رکھنے میں بھی کمال مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کہانی میں ماضی کے واقعات کو جس انداز میں یاد کیا گیا ہے اور محبت و الفت جیسے جذبے کو جگہ دی گئی ہے۔ اس کے اندر چھپے ہوئے دکھ اور کرب کو صرف مرکزی کردار فہیم ہی سمجھ سکا اور آخر میں رو پڑتا ہے۔ فہیم اپنے عقل و شعور اور حساس رویے کی وجہ سے کہانی میں مرکزی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے معصوم ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں جو وہ بار بار نانی سے پوچھتا ہے اور اپنے فہم میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ بظاہر یہ سوالات بہت بچکانہ اور معصومانہ سے ہوتے ہیں مگر معنوی لحاظ سے دیکھا جائے تو گہریت لیے ہوتے ہیں۔ یہ ایک حساس کردار ہے جو واقعات کا اثر لیتا ہے۔ جب نانی اماں نانا کا تعارف کراتی ہیں تو بھی فہیم کے ذہن میں معصوم سا سوال جنم لیتا ہے۔

تمہارا نانا خدا سے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، فقیر تھا۔ "فقیر"؟ فہیم بھونچکا ہو

کراٹھ بیٹھا۔ ہاں بیٹا۔۔۔۔۔ مگر یہ فقیر نہیں جو گلیوں میں مارے مارے پھرا کرتے ہیں۔^۲

یہاں پر اشفاق احمد دو باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک تو فہیم بچوں کے سے انداز میں لفظ فقیر پر اپنی حیرت کا اظہار کرتا ہے تو نانی اس کی وضاحت کرتی ہیں۔ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ کوئی قصہ کہانی، واقعہ یا بات سنتے ہوئے بچے معصوم انداز میں سوال در سوال کرتے رہتے ہیں۔ جس سے قصہ کہانی سنانے کا تسلسل ٹوٹتا رہتا ہے اور دوسری بات یہ کہ ان سوالات کے ذریعے بچہ کہانی میں اپنی دلچسپی اور تجسس کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ کہانی کو ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا ہے۔ اسی طرح دوران کہانی جب نانی ایک گائے کا تذکرہ کرتی ہیں کہ نانا گائے لائے تھے تو ان کا چھوٹا بیٹا معصوم انداز میں گائے کو دیکھ کر کہنے لگا

کہ گائے بہت خوبصورت ہے میں اس گائے کے مرنے کے بعد اس کی کھال سے جوتیاں بنواؤں گا تو اسی دوران فہیم کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے۔

نانی اماں۔ فہیم نے اٹک کر پوچھا " کتے کے چمڑے سے بوٹ نہیں بنتے۔ اسے جون صاحب

کا کتا یاد آگیا جو کل مرا تھا اور جسے انھوں نے " بمعہ " کھال کھڑ میں پھینک دیا تھا " ۵

یہاں کہانی سنتے ہوئے ماضی کے واقعات میں سے فہیم کا ذہن گزشتہ روز مرنے والے کتے کی طرف چلا جاتا ہے کہ اگر گائے کی کھال سے جوتے بن سکتے ہیں تو کتے کی کھال کیوں ضائع ہو۔ اس طرح دیکھا جائے تو افسانے کے مرکزی کردار فہیم میں اشفاق احمد نے حقیقی رنگ بھرا ہے۔ اور بچوں کا کہانی سننے کا انداز، ان کا تجسس، دلچسپی، معصومانہ سوالات، مکالماتی انداز حتیٰ کہ کہانی سے دکھ بھرا تاثر لے کر روپڑنا جیسی باتوں کو بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک جیتا جاگتا کردار قرار پاتا ہے۔

ارشاد (رات بیت رہی ہے)

افسانے کا مرکزی کردار ارشد نامی نوجوان ہے جو کہ بحری فوج کے ساتھ بحری جہاز میں حالت جنگ میں ہے۔ افسانے کا موضوع محبت ہے اور اس میں دونوں جوان جوڑے رومانوی کردار ہیں۔ اس میں اس نوجوان کے ساتھ ایک اور نوجوان فوجی پیٹر بھی ہے جو بحری جہاز پہ سوار اپنی محبوبہ کو یاد کر رہا ہے۔ یہ دراصل مکتوباتی انداز پر مشتمل کہانی ہے۔ وہ جوان اپنی محبوبہ کو طویل خط لکھتا ہے۔ اس کے سامنے اس کا نوجوان دوست پیٹر بھی اپنی محبوبہ مارگریٹ کو خط لکھ کر پوسٹ کر دیتا ہے اور خود دوران پرواز جہاز کی دُم میں آگ لگنے کی وجہ سے جل کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس کو فوجی اعزاز کے ساتھ آخری رسومات ادا کرنے کے بعد جلے ہوئے جہاز کے ساتھ سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ کیونکہ حالت جنگ میں کہاں ایک لاش اور جلے ہوئے جہاز کو سنبھال کے رکھا جائے۔ پیٹر اپنی محبوبہ مارگریٹ کے کہنے پر فوج میں بھرتی ہوا تھا مگر اسے یاد کر کر کے آخر کار دنیا سے چلا جاتا ہے۔ آخری وقت میں وہ اپنی محبوبہ کی تصویر چومتا ہے جو کہ خاصا رقت آمیز منظر ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگلی پرواز مرکزی کردار کی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنا خط مکمل کر دیتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے اشفاق احمد نے دیس سے میلوں دور فوجی جوانوں کی پردیسی زندگی کو سامنے لایا ہے۔ پردیسی جوانوں کے جذبات، محسوسات اور محبت کا تذکرہ کر کے محبت جیسے آفاقی جذبے کی قوت و طاقت کو سامنے لایا ہے۔ اپنی محبت کے کہنے پر پیٹر فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے۔ پائلٹ بن کر محاذ پر چلا جاتا ہے اور دوران پرواز اپنی جان دے دیتا ہے تو اشفاق احمد محبت کی طاقت کو سامنے لاتے ہیں کہ کس طرح ایک شخص اپنی محبت / محبوبہ کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہاں وہ اپنی محبوبہ کو یاد کرتا ہے اور اسی محبوبہ کی خواہش کو پورا کرتے ہوئے اس کی تصویر دیکھتے دیکھتے

جان دے دیتا ہے۔ مرکزی کردار اپنی پریشانی اور اضطرابی کیفیت سے فرار حاصل کرتے ہوئے اپنے ماضی کی طرف سفر کرتا ہے اور محبوبہ کے ساتھ گزرے لمحات کو یاد کرتا ہے۔ محبت بھرے انداز میں محبوبہ کا نوجوان کو پڑھائی کی طرف مائل کرنا جب کہ وہ ایف اے کرنے کے بعد پڑھائی چھوڑنے کا فیصلہ کر بیٹھا تھا۔ وہ ان لمحات کو یاد کرتا ہے جب محبوبہ اسے بی اے کرنے پہ مجبور کرتی ہے۔

تم نے مجھے اسی دن ڈیوڑھی میں روک کر کہا تھا "بی اے کا داخلہ ابھی بند نہیں ہوا۔ کسی کالج میں داخل کیوں نہیں ہو جاتے،،؟ تو میں نے کہا تھا "ہو جائیں گے ایسی کون سی جلدی ہے۔ میرا دل پڑھنے کو نہیں چاہتا"۔ لیکن میرا دل چاہتا ہے۔ "تم تو پڑھ رہی ہو"۔ اپنے لیے نہیں، تمہارے لیے کہہ رہی ہوں۔۔۔۔۔۔ کم از کم بی اے تو کر لو۔۔۔!"

یہاں اشفاق احمد مرکزی کردار کے ذریعے محبت جیسے جذبے کو ایک سرکش نوجوان پر اثر انداز ہوتے دکھائی دیتے ہیں کہ کس طرح وہ نوجوان دوبارہ پڑھائی کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور داخلہ لے لیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اور جگہوں پر نوجوان محبوبہ کی مرضی اور فرمائش کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ یہاں اشفاق احمد واضح کرنا چاہتے ہیں کہ محبت ایک معصوم اور پاکیزہ جذبہ ہے جس میں کوئی لالچ، حسد، جلن، خود نمائی وغیرہ نہیں پائی جاتی ہے۔ بس محبت کرنے والوں کے دل ایک ساتھ دھڑکنے شروع کر دیتے ہیں اور وہ دونوں محبوب اور محب ایک ہی رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ "اردو افسانے میں رومانی رجحانات" میں ڈاکٹر محمد عالم خان اس بارے میں لکھتے ہیں۔

وہ ماضی کی جن یادوں کو مجسم بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان میں مسرت کا ہلکا سا احساس ملتا ہے اور یاد ان افسانوں میں خوشی کے نعمات کی صورت گو نجی ہے اور ہرن کی طرح چوڑیاں بھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے افسانے رات بیت رہی ہے، مسکن اور توتا کہانی اور عجیب بادشاہ اسی حسین ماضی کی یادیں ہیں جن میں کہیں کہیں درد کی کسک ہے لیکن یہ تلخ ہونے کی بجائے کسی حد تک شیریں ہیں۔^۴

اشفاق احمد نے سمندری سفر، حالت جنگ، ساتھی پائلٹ کی وفات کے ساتھ مرکزی کردار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ جاندار انداز میں پوری کہانی پہ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ محبوبہ کی یادوں کی کسک اس کے دل میں ہے اور یاد ماضی اسے افسردہ کر رہی ہے۔ سمندری سکوت اور سکون کے ساتھ مرکزی کردار حال سے ماضی کی طرف سفر کرتا ہے اور ماضی سے حال میں لوٹ آتا ہے۔

احسان (تلاش)

"تلاش" تقسیم ہند کے دوران رونما ہونے والے واقعات اور فسادات کے پس منظر کو لیے ہوئے ایک بچے کی کہانی ہے۔ یہ ایک علامتی و تمثیلی کردار ہے جو کہ اپنے کتے جیکی سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ قیام پاکستان کے وقت ایک مہاجر خاندان جب پاکستان کی جانب رخت سفر باندھتا ہے تو صرف اور صرف اپنی ضروریات زندگی کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور کم سے کم سامان ساتھ رکھا جاتا ہے۔ مگر احسان نامی بچہ اپنے جیکی کو ہر قیمت پر پاکستان ساتھ لے کر آنا چاہتا ہے۔ وہ فوجیوں سے بحث مباحثہ کر کے خان صاحب کی مہربانی سے کتے کو سامان کے ساتھ ٹرک میں لاد دیتا ہے۔ کتے میں احسان کی جان ہوتی ہے۔ وہ اسے بہت زیادہ پیار محبت دیتا ہے مگر والدہ کتے کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ ایک دن سخت غصے میں وہ خان صاحب کو طعنہ دیتی ہیں کہ وہ بھی جیکی کو پاکستان لانے میں برابر کا شریک ہے۔ خان صاحب غصے میں جیکی کو اٹھا کر دور کہیں پھینک آتا ہے۔ احسان سکول واپسی پہ جیکی کو نہ پا کر تلاش شروع کر دیتا ہے۔ اس کا بھائی توقیر، والدہ، بہنیں، خان صاحب سبھی گھر کے لوگ اس تلاش میں شامل ہو جاتے ہیں اور احسان کتے کو تلاش کرتے کرتے خود بھی کھو جاتا ہے اور لوٹ کر واپس نہیں آتا۔ یہ کہانی ایک بچے کے گرد گھومتی ہے جو کہ اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ اشفاق احمد کے حوالے سے ڈاکٹر مسعود رضا خاکی کی رائے ہے کہ "محبت کے سلسلہ میں بچوں کی نفسیات کو پیش کرنے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ اس کی جھلک ان کے افسانے تلاش اور شب خون میں ملتی ہے۔" ۸ احسان نامی بچہ اس کہانی کا مرکزی کردار ہے جو کتے سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ ہر وقت اس کی خاطر مدارت میں لگا رہتا ہے۔ جیکی کا بہت خیال رکھتا ہے اور اپنی ماں سے چھپ چھپ کر اسے مکھن گھی کے نوالے کھلاتا ہے۔ اس کی شرارتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے جب وہ اسے شام کو گھمانے کے لیے لے جاتا ہے۔ مگر اس کے گھر والے یہ سب پسند نہیں کرتے ہیں۔ گھر والوں کو خصوصاً اس کی والدہ کو گھر میں جیکی کا وجود ناقابل برداشت حد تک ناپسند ہے۔ اس سب کے باوجود ننھے منے معصوم دل میں جیکی کے لیے محبت میں کمی نہیں آتی ہے۔ اس حوالے سے حشمت جہاں ناز قطر ارا ہیں۔

اشفاق احمد محبت کے نغمہ خواں ہیں اور محبت بھی وہ جو گھروں اور خاندانوں میں پروان چڑھتی

ہے۔ اس محبت میں ننھے منے بچے جو اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ تلاش اور

شب خون اس کی اچھی مثالیں ہیں۔^۹

اشفاق احمد اس افسانے کے ذریعے پیغام دینا چاہتے ہیں کہ عزیزوں کی عزیز اشیا کی قدر کرنی چاہیے۔ ان سے وابستہ اور منسوب چیزوں کی قدر کرنے سے ہی اپنی قدر میں اضافہ کیا جاسکتا ہے ورنہ کچھ بھی حادثاتی طور پر وقوع پذیر ہو سکتا

ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار کے لیے اس کا کتا جیکی، بہت اہمیت کا حامل تھا۔ وہ اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تر سمجھتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اسے اپنا بھائی قرار دیتا تھا۔ جب غصے میں والدہ کتے کو گھر سے نکالنے کا کہہ دیتی ہیں تو احسان کہتا ہے۔

اور سن، خان، یا تو پھینک آ اس کو سمندر میں۔ نہیں تو باندھ اپنا بوریا بستر۔ خان ہنسنے لگا۔ اس نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ امی جہاں مجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے، یوں سمجھو کہ میں اکیلا آپ کے گھر نہیں آیا میرے ساتھ میرا چھوٹا بھائی بھی ہے " سب ہنسنے لگے اور امی کے ہونٹ پھیل گئے۔^{۱۰}

اشفاق احمد محبت کے جذبے کو انسانیت سے پھیلا کر تمام مخلوقات تک لے جاتے ہیں۔ احسان کا اپنے کتے سے پیار اس کا مظہر ہے۔ اشفاق احمد کی نظر میں جانوروں، چرند پرند سے بھی محبت کی جانی چاہیے اور اللہ کی یہ مخلوق بھی ہماری محبت کی حقدار ہوتی ہے۔ اس افسانے میں بھی ہمیں محبت میں سادگی اور معصومیت دکھائی دیتی ہے۔ احسان اپنے جیکی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ گھر والے احسان کو کھودیتے ہیں۔ جب جیکی کی گمشدگی پہ احسان رونادھونا شروع کر دیتا ہے تو والدہ ممتا کے جذبے سے مغلوب ہو کر پیر بخاری کی زیارت پہ منت مانتی ہیں اور دعائیں کرتی ہیں۔ توقیر بھائی اس کی تلاش میں ساتھ ساتھ پھرتے ہیں۔ والد ٹانگہ لے کر کراچی کی سڑکوں پہ تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ آپا، منی آپا بھی رو رو کر برا حال کر لیتی ہیں مگر احسان کو جیکی نہ ملا اور وہ گھر واپس نہیں آتا ہے۔ اشفاق احمد اس کردار کے ذریعے انسان تو انسان، حیوانات سے بھی محبت کا درس دیتے ہیں۔ ننھا احسان جس عہدگی اور وارفتگی سے اس کردار کو نبھاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ گھر والوں کی شدید مخالفت کے باوجود اپنے کتے سے لگاؤ محبت کو معنوی وسعت عطا کرتی ہے۔ فنی لحاظ سے ننھے احسان کا کردار بہت جاندار اور متحرک کردار ہے جس میں فطری جذبات کو حقیقی انداز میں بھرپور طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

نوجوان فوجی آفیسر (سنگ دل)

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان تقسیم ہو کر دو آزاد ریاستوں میں بٹ گیا تو دونوں اطراف میں بہت زیادہ ہجرتیں ہوئیں۔ دونوں اطراف سے لاکھوں لوگ لٹے پٹے اپنے پیاروں کی جدائی کا دکھ لیے اور درد بھری داستانیں ساتھ لیے آباد ہوئے۔ یہ افسانہ بھی فسادات کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس کے کردار بھی رومانوی ہیں۔ ہجرت کے بعد دونوں حکومتوں نے آپس میں گمشدہ لوگوں کی بازیافت کا معاہدہ کیا اور گمشدہ لوگوں کا سراغ لگانا شروع کیا اور سرحد کے آر پار لوگوں کا تبادلہ کیا جانے لگا۔ اسٹنٹ سرجن کا پیٹا فوجی کمیشن لے کر مشرقی پنجاب کے ضلع لیاٹاں میں مغوی لڑکیوں کی برآمدگی کے لیے تعینات ہوتا ہے۔ یہ اس کا آبائی گاؤں ہے۔ جہاں اس نے اور اس کی محبوبہ پچی جو کہ ہندو ہے، نے آٹھ سال اکٹھے گزارے تھے۔ نوجوان معمول کے مطابق خدمات سرانجام دیتا ہے کہ اسے پاکستان سے چٹھی موصول ہوتی

ہے۔ جو کسی لڑکی کے والد کی تھی کہ اس کی بیٹی سجن سنگھ نامی ایک سکھ کے پاس قید ہے۔ یہ اس پر لکھ دیتا ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود لڑکی کا سراغ نہیں مل سکا۔ مگر وہ چٹھی پٹی کمرے کی صفائی کرتے ہوئے پڑھ لیتی ہے اور اسے سنگ دل قرار دیتی ہے۔ رات کے اندھیرے میں وہ اسے اس لڑکی کا نہ صرف پتہ دیتی ہے بلکہ سجن سنگھ جیسے ظالم شخص کے گھر کی دیوار پھلانگ کر حسنا نامی مغوی لڑکی کو دیگر مغوی لڑکیوں کے ساتھ فوجی ٹرک میں سوار کرا دیتی ہے۔ یوں پٹی اس نوجوان کی محبت قربان کر کے اپنی جان پہ کھیل کر حسنا نامی لڑکی کو سرحد پار بھجوا دیتی ہے۔ یہ افسانہ اشفاق احمد کے پہلے افسانوی مجموعے میں شامل ہے اور جن دنوں یہ افسانہ لکھا گیا۔ وہ فسادات اور ہجرت کا زمانہ تھا۔ اشفاق احمد نے محبت کے جذبے کو ایک نئے روپ میں پیش کیا ہے جس میں مذہب، رنگ، نسل اور ملک کی تفریق سے بالاتر ہو کر بے لوث قربانی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ایک ہندو لڑکی ایک مسلمان لڑکی کی جان بچانے کے لیے آخری حد تک چلی جاتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کو آمادہ کر لیتی ہے کہ وہ پاکستان چلا جائے اور مغوی لڑکیوں کو اپنے والدین کے پاس پہنچائے۔ اور پاکستان سے اس کے لیے بھی ایسے تحفے بھیجے۔ مرکزی کردار اپنی محبت کی بنیاد اُن ملاقاتوں کو قرار دیتا ہے جو وہ بچپن میں کرتا رہا۔ وہ بچپن کی یادیں کچھ یوں تازہ کرتا ہے۔

میں اور پٹی چپکے چپکے گھر سے نکل کر تھانے کے پچھوڑے "دنگن" میں چلے جاتے جہاں بیروں، گوندنیوں اور سرس کے درختوں کے درمیان سبزی کے چوکور قطعے تھے۔ یہاں بیٹھ کر ہم نہ جانے کتنی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے۔ خورد سال شیشم کے گہرے سبز پتے توڑ کر میں اسے پینیاں بنا کر دیتا جو اس سے کبھی نہ بچتی تھیں۔ مینڈھ پر بیٹھے بیٹھے وہ سفید سفید تیزابی مولیاں اکھاڑ کر اپنی اوڑھنی سے پونچھتی اور چاکلیٹ کی طرح کھانے لگتی۔ جنھیں میں آج تک اس اطمینان سے نہیں کھا سکا۔"

اشفاق احمد نے مرکزی کردار کے ذریعے محبت اور ہمدردی کو ایک ایسے جذبے کے طور پر متعارف کرایا ہے جو کہ بلا تخصیص رنگ و جنس اور ملت و مذہب کے عمل پذیر ہوتا ہے۔ یہاں مرکزی کردار کسی مذہب و ملت اور جغرافیائی حدود کی پابندی کو آڑے نہیں آنے دیتا ہے۔ ورنہ ایک ہندو کے ساتھ محبت یا ہندو گھرانے سے تعلق واسطہ رکھنا محال تھا۔ مگر یہاں اشفاق احمد اپنے کرداروں کے ذریعے سے اس بات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانیت سب سے پہلے ہے۔ رنگ، نسل، طبقہ، پیشہ، مذہب اور ملک وغیرہ جیسی انسانی تقسیم بعد میں وجود میں آتی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار بھی اسی رویے کا حامل ہے جسے تراشنے میں اشفاق احمد نے بہت محنت کی ہے۔ گو کہ یہ موضوع اُن دنوں عام تھا۔ ہجرت، فسادات، قتل و غارت، نظریاتی اختلافات مگر اشفاق احمد نے اپنے کرداروں کے ذریعے سے اس موضوع میں

نیارنگ بھرا ہے کہ قاری کو آخر تک ساتھ لے کر چلتے ہیں اور کہیں بھی کرداروں کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیتے۔ دیکھا جائے تو کرداروں کی بدولت یہ افسانہ ایک خاص تاثر قارئین پہ چھوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

شکو (شب خون)

شکو "شب خون" کا مرکزی کردار ہے جو کہ ٹی بی کا مریض ہے اور سینی ٹوریم میں ٹی بی کی وارڈ میں دیگر مریضوں سپنورن سنگھ، کامریڈ اصغر، مسٹر بھومکا وغیرہ کے ساتھ زیر علاج ہے۔ شکو اسم بامسمیٰ کردار ہے اور وجہ تسمیہ شقی القلب ہونا ہے۔ ڈاکٹر شاہ، مس تھارپر، مس نورا، ڈورنن اور بیٹرس نرس مریضوں کی دیکھ بھال اور ادویات کے لیے تعینات اور موجود ہیں۔ افسانے میں مریضوں کی دلی کیفیات اور مکالموں کے ذریعے رنگ بھرا گیا ہے۔ تمام مریض اپنی زندگی کے آخری لمحات ہسپتال میں گزارنے آئے ہیں۔ ہر ہفتے کسی نہ کسی مریض کی لاش اس کے لواحقین کے حوالے کی جاتی ہے۔ مرکزی کردار شکو کے پاس اس کے ماموں نذر، بوٹی میاں، خالہ وغیرہ تیمارداری کے لیے آتے ہیں مگر شکو بدن گرتی صحت کی وجہ سے زندگی سے مایوس ہو چکا ہے۔ ایک نرس بیٹرس کو عشق تو کیپٹن عباس نامی شخص سے ہوتا ہے مگر سب سے زیادہ پیار مریض شکو پر آتا ہے۔ وہ اس کو زندگی کی طرف لوٹ آنے کو کہتی ہے، حوصلہ اور دلا سے دیتی ہے حتیٰ کہ محبت کے جذبے سے مغلوب ہو کر اپنا خون دینا شروع کر دیتی ہے۔ شکو بیٹرس سے حسد کرنے لگتا ہے۔ نفرت کی بنا پر وہ اس کی سرخ و سفید رنگت، صحت و شباب سے جلنے لگتا ہے۔ وہ اس کو بھی ٹی بی جیسا موزی اور لا علاج مرض لگانا چاہتا ہے۔ کبھی اپنی سانس کے ذریعے، کبھی رال اور لعاب کے ذریعے جراثیم منتقل کرتا ہے۔ اور حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کرنے لگتا ہے۔ کئی راتوں سے جاگتی نرس بیٹرس جب اس کے سر ہانے بازو پہ سر رکھ کر سو جاتی ہے تو شکو کو شب خون مارنے کا موقع مل جاتا ہے۔ وہ اپنے خون اور رال سے لتھڑے ہونٹ اس کے ہونٹوں پہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر شدید کمزوری کی وجہ سے وہیں لٹک جاتا ہے اور انتقال کر جاتا ہے۔ اشفاق احمد کے اس افسانے کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت کا حسی تصور بے حد لطیف اور کثیر الاضلاع ہے۔ ان کے افسانے

بظاہر محبت کے مرکزی نقطے پر گردش کرتے ہیں تاہم ان کے موضوعات متنوع ہیں اور وہ محبت کی

تقدیل سے زندگی کے بے شمار گوشوں کو منور کرتے چلے جاتے ہیں۔ اجلے پھول، شب خون،

امی، گڈریا اور گاتو وغیرہ افسانوں میں اشفاق احمد نے ارضی لطافتوں کو نیا آب و رنگ دیا ہے۔^{۱۲}

"شب خون" کا مرکزی کردار شکو معاشرے کا حقیقی اور جیتا جاگتا کردار ہے جس کے ذریعے اشفاق احمد نے مریضوں کی ذہنی کیفیات اور احساسات کو ظاہر کیا ہے۔ اس کردار کی ذہنی کیفیات، سوچ، لب و لہجہ، انداز اور برتاؤ بالکل زندگی سے مایوس ایک مریض جیسا ہے جو کہ زندگی کے آخری لمحات وارڈ میں گزار رہا ہے۔ ماں باپ، رشتے دار، عزیز واقارب اور

دوستوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ مریض تنہائی کی زندگی گزارنے پہ مجبور ہوتے ہیں کیونکہ اس مریض کو چھونے سے یا سانس کے ذریعے بھی مرض منتقل ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ لہذا شقو کے گھر سے یارشتہ دار جو بھی ملنے آتے ہیں وہ چند لمحات کے لیے ہی وارڈ میں آتے ہیں۔ صرف ایک ہی سانس میں بہت سے سوال جواب کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وارڈ میں سانس لینا بیماری کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے یا پھر وارڈ سے باہر نرسوں کو پیسے دے کر چلے جاتے ہیں کہ خیال رکھنا اور مریض کو کچھ لادینا۔ ایسے مریض جو مرض اور موت کے ساتھ لڑتے ہیں، صبح شام دوسرے مریضوں اور ڈاکٹروں سے اپنی موت کا پیغام سنتے رہتے ہیں تو بالآخر زندگی سے تنگ آ جاتے ہیں۔ اسی بے حسی اور نفرت کے شدید جذبے سے شقو بھی دوچار ہوتا ہے۔ وہ بیٹرس کی صحت، خوبصورت و دلکشی سے جلنے لگتا ہے۔ خون کی گرمی سے متمنا چہرہ اسے نہایت منحوس لگنے لگتا ہے۔ شقو کی ذہنی کیفیت اشفاق احمد اس طرح واضح کرتے ہیں۔

آخر بیٹرس کو کیا حق حاصل ہے کہ سرخ و سپید چہرہ لیے ہمارے درمیان گھومتی پھرے۔ خدا نے اسے کیوں صحت مند بنایا اور ہمیں بیمار۔! وہ اپنی جوانی، صحت اور تنو مندی کی نمائش کر کے ہمارا مذاق اڑاتی ہے۔ اس کے لاشعور میں کمزوریوں اور بیماریوں کے خلاف تمسخر ہے۔ آخر اسے ہی کیوں اتنا خون سونپا گیا ہے۔ کیوں ایسی زندگی عطا کی گئی ہے؟ کیوں۔۔؟ آخر کیوں۔؟^۳

مرکزی کردار شقو کے ذریعے افسانہ نگار نے غیر جانبدارانہ طور پر فطری انداز میں زندگی سے مایوس وارڈ میں داخل مریض کی دلی کیفیات، محسوسات کو پیش کیا ہے۔ موت کے قریب اپنوں کے رویوں سے تنگ آ کر شقو بے حس ہو جاتا ہے اور سب کو اپنے ساتھ موت کی طرف لے کر جانا چاہتا ہے۔ یہ تنہا اور اداس کردار ہے جو زندگی سے مایوس ہو چکا ہے اور جسمانی و بدنی درد اور تکالیف کے ساتھ ساتھ اپنوں کے رویوں کا کرب بھی جھیلنے پہ مجبور نظر آتا ہے۔ یہ رد عمل کے طور پر منفی انداز میں سامنے آتا ہے۔ اپنوں کی بے حسی، غیروں کی بے رحمی اور مسیحاؤں کے چبھتے جملے اسے مریضانہ اور منفی ذہنیت کا حامل بنادیتے ہیں۔ وہ جان بچانے والی مسیحا بیٹرس کو بھی اسی مرض اور کرب میں مبتلا دیکھنا چاہتا ہے۔ موت اور مایوسی میں مبتلا شقو آخری جملہ کرتے ہوئے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اشفاق احمد اس کردار کے ذریعے تنہائی اور مرض کا شکار ہو کر مایوس لوگوں کی ذہنیت اور سوچ کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں۔ شقو میں اس کی جھلک واضح طور پہ محسوس کی جاسکتی ہے۔

حامد (توتا کہانی)

حامد ایک رومانوی کردار ہے جو کہ لاہور میں کرائے کے مکان میں اپنے باورچی کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ اس کے پڑوس میں نجستہ نامی لڑکی کا کنبہ آباد ہے۔ والد کسی دفتر میں ملازم جبکہ سخت گیر والدہ کو دل کا مرض لاحق تھا۔ اس کی منگنی اس کے پھوپھی زاد سے ہو چکی تھی۔ مگر حامد اور نجستہ ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کپڑے اتارنے جب مکان کی چھت پہ نجستہ آتی ہے تو حامد بھی چھت پہ ہوتا ہے تو گفتگو اور رابطہ ہو جاتا ہے مگر ملاقات کی کوئی سبیل نہیں نکلتی۔ حیدر آباد سے نجستہ کی پھوپھی اس کی بات پکی کرنے جب لاہور آتی ہیں تو انہیں سیر کے لیے مقبرہ جہانگیر جانے کا پروگرام بنتا ہے۔ جو کہ حامد سن لیتا ہے اور وہاں پہنچ کر انتظار کرتا ہے۔ جب وہ پہنچ جاتی ہے تو حامد مینار پہ چڑھ جاتا ہے۔ جب نجستہ اوپر جاتی ہے تو حامد کو وہاں دیکھ کر حیران اور خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ پہچان نہیں پاتی ہے تو حامد اسے بتاتا ہے کہ میں وہ ہمسایہ ہوں جس کی محبت کا طوطا آپ نے دل میں پال رکھا ہے۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ اسی اثنا میں نجستہ کی والدہ اور پھوپھی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ نجستہ ڈر جاتی ہے مگر حامد اس کی عفت و عصمت کی خاطر مینار سے چھلانگ لگا دیتا ہے تاکہ نجستہ کی زندگی برباد نہ ہو۔ اس افسانے میں اشفاق احمد نے معاشرے میں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں میں پنپنے والے شدید محبت کے جذبات کی عکاسی اپنے کرداروں کے ذریعے کی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار حامد محبت کے لیے ایثار اور قربانی کی مثال بن جاتا ہے۔ حامد اپنا یہ کارنامہ افسانے کے آغاز میں اپنے دوستوں کو یوں بتا رہا ہوتا ہے۔

حامد نے کہا "تم نے میرا جو کارنامہ سننے کے لیے مجھے یہاں چائے کی دعوت دی ہے۔ وہ اپنی

نوعیت کا بالکل انوکھا ایثار ہے۔ جو میں ایک عفت مآب لڑکی کی خاطر کر سکا۔ شاید تم میں

اسے سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، لیکن اس کی برتری کے تم یقیناً قائل ہو جاؤ گے۔"

اس افسانے میں مرکزی کردار حامد محبت کی خاطر ایثار و قربانی دینے والا دکھایا گیا ہے۔ اشفاق احمد نے بہت سے افسانوں میں ماضی کی یاد کو تازہ کرنے کی تکنیک استعمال کی ہے۔ اس افسانے میں بھی مرکزی کردار حامد اپنی کہانی اور قربانی کا قصہ اپنے دوستوں کو سن رہا ہے۔ حال سے ماضی کی جانب سفر اشفاق احمد کے اکثر و بیشتر افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ان کے کردار ماضی کی یاد میں کھوئے رہتے ہیں اور مختلف واقعات کو یاد کر کے کہانی کو انجام تک لے آتے ہیں۔ مرکزی کردار حامد اگرچہ یاد ماضی میں کھویا ہوا ہے لیکن اس کا یہ عمل اکتاہٹ، افسردگی یا زندگی سے بے زاری کو نہیں بلکہ مسرت و خوشی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس افسانے میں دو محبت کرنے والے دل خوشی کے نغمے گاتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ مرکزی کردار حامد اپنی پڑوسن کے عشق میں مبتلا ہے جو اسے پسند بھی کرتی ہے مگر ملاقات نہیں ہو پاتی۔ کبھی کبھار وہ چھت پہ آ جاتی ہے تو کوئی

کپڑا، رومال وغیرہ حامد کے چھت پہ گرا کے اپنی آمد کا پیغام دیتی ہے مگر شومی قسمت کہ کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ اشفاق احمد نے اس کردار کے ذریعے مڈل کلاس گھرانوں میں پائے جانے والے لوگوں کی دلی کیفیات کو سامنے لایا ہے۔ کہ کس طرح دونوں طرف عزت، عصمت اور محبت کی پاکیزگی کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اس کی نمائش نہیں کی جاتی ہے اور نہ ہی اظہار میں سماجی پابندیوں کی جکڑن کو توڑا جاتا ہے۔ اس طرح یہ کردار ہمیں فطرت سے قریب تر لگتے ہیں اور مصنوعی نہیں قرار پاتے ہیں۔ اس میں مرکزی کردار کی محبوبہ سے ملاقات بھی مقبرہ جہانگیر پہ ہوتی ہے جو کہ مغلیہ سلطنت کا ایک مشہور بادشاہ گذرا ہے اور محبت کی علامت ہے۔ انارکلی سے اس کی محبت ایک نظیر اور مثال کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ افسانہ داستانوی رنگ اور انداز لیے ہوئے ہے۔ مرکزی کردار حامد نخستہ کو باور کراتا ہے کہ تم نے میری محبت کا طوطا اپنے دل میں پال رکھا ہے۔ جب نخستہ طوطے سے جان چھڑانا چاہتی ہے تو حامد کہتا ہے۔

میں نے کہا اس تو تے کو نہ مارنا۔ اس میں میری جان ہے۔ اگر میری جان نکل گئی تو تم مر جاؤ گی۔ اس نے کہا مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں۔ میں نے جواب دیا مجھے بھی اپنی زندگی کی پروا نہیں مگر مجھے تو تے کی زندگی عزیز ہے۔^{۱۵}

مرکزی کردار حامد بھی داستان گو کا کردار ادا کر رہا ہوتا ہے اور اپنے دوستوں کو داستان حیات سنارہا ہوتا ہے۔ آخر میں مرکزی کردار حامد اپنی محبت کی خاطر قربانی دے دیتا ہے اور بلند مینار سے چھلانگ لگا دیتا ہے۔ اشفاق احمد اپنے کرداروں کے ذریعے محبت جیسے جذبے کو امر کر دیتے ہیں اور مرکزی کردار حامد متاثر کن تاثر چھوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

نمدار (بندر ابن کی کُنج گلی میں)

افسانہ "بندر ابن کی کُنج گلی میں" کہانی سجادول چھیرے کے بیٹے نمدار اور کلثوم کی محبت کے گرد گھومتی ہے۔ طبقاتی امتیاز کا شکار نمدار اچھیرا حقیقت پسندانہ کردار نگاری کی مثال ہے جو کہ ایف اے کرنے کے بعد نوکری کی بجائے بی اے میں داخلہ لے لیتا ہے۔ گھر والے اسے کمیٹی میں نوکری کرنے کا کہتے ہیں مگر وہ انھیں بتاتا ہے کہ بی اے کرنے کے بعد نوکری کرنے سے بگلہ اور گاڑی ملے گی۔ وہ روزانہ شام کو والد کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے جاتا، دو آنے کمائی روزانہ تھی۔ اسی دوران پڑھائی کے لیے شہر کالج میں آ جاتا ہے۔ مالٹے کے باغ میں رات کو دوستوں کے ساتھ مالٹے چرانے جاتا ہے جو کہ سیٹھ کا تھا۔ پرنسپل کی جواب طلبی پہ سیٹھ کی لڑکی کلثوم شناخت کرنے سے انکاری ہو جاتی ہے تو اس کی جان چھوٹ جاتی ہے۔ لڑکی اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ مگر مادیت پرستی کے ماحول میں اردو ادب کی طالبہ ہونے کے باوجود اقتصادیات میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ بالآخر گریجویشن کا امتحان دیئے بغیر چلی جاتی ہے۔ نمدار پڑھائی کے ساتھ ساتھ شام کو کسی سیٹھ کے پاس خط و کتابت بھی کرتا تھا۔ نوکری نہ ملی تو تالپور خاندان کے نواب کے پاس منشی کی نوکری کرنے لگا۔ وہاں سے دل

اچاٹ ہوا تو حیدر آباد کے ہسپتال میں وارڈ بوائے کی نوکری کرنے لگا۔ نوکری کے آٹھویں سال ایک مریض ایمر جنسی میں آتی ہے۔ جسے اس کا سیٹھ والد چھوڑ کے اپنے ضروری کام پہ چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے ٹیکہ لگایا اور مریض کے ہوش میں آنے تک نمدار کو کہہ گیا کہ مجھے بتانا۔ نمدار دیکھتا ہے کہ یہ کلثوم تھی۔ یہ اس کو پکارتا ہے جو ایک دفعہ آنکھیں کھولتی ہے مگر پھر ہمیشہ کے لیے بند کر لیتی ہے۔ کردار نگاری کی رو سے دیکھا جائے تو نمدار کی صورت میں اشفاق احمد نے نہایت مہارت سے اس کردار کو ارتقائی مراحل سے گزار کر کہانی کا حصہ بنایا ہے۔ نمدار ایک غریب مچھیرے کا بیٹا تھا۔ اشفاق احمد نے اس کردار کے ذریعے جھوٹیلوں میں آباد مچھیروں کی نفسیات اور سوچ کو واضح کیا ہے۔ ان لوگوں کی عادات و اطوار اور ترجیحات کو اپنے اس کردار کے ذریعے سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مگر جب تعلیم کی بدولت وہ تبدیلی کو قبول کر لیتا ہے اور اسی سوچ کی بدولت وہ معاشرے میں نامدار صاحب کہلانے لگتا ہے تو پیسہ پیسہ جوڑ کر استعمال شدہ سوٹ، پتلون اور ٹائی وغیرہ خرید کر سماج کا حصہ بننے کی کوشش کرتا ہے۔ کلثوم سے محبت کے اظہار میں بھی یہ ہی چیز آڑے آتی ہے اور جب وہ اسے مچھیرا بستی کی عورتوں کے اوصاف گنواتی ہے، اپنی پسندیدگی ظاہر کرتی ہے تو نمدار اپنا پول کھل جانے کے ڈر سے موضوع تبدیل کر دیتا ہے۔ عبدالقادر سروری "کردار اور افسانے" میں ایسے کردار کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ارتقائے کردار کے اصلی معنی اشفاق قصہ کی ان فطری اور ابتدائی خصلتوں کا بتدریج اظہار ہے جو ان کے اسلاف، فطرت اور سرشت، قوت ارادی اور ان کے معاشرتی ماحول کے اثرات ان میں پیدا کر دیتے ہیں۔ ارتقائے کردار میں اعتدال عموماً نہ صرف روایات کے اثر، عادت اور معاشرتی جماعتوں کے خیالات سے رونما ہونے لگتا ہے بلکہ ایک فرد کے دوسرے کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے بھی۔^{۱۶}

اس کردار کو شناختی بحران کے مسئلے کا بھی سامنا ہے۔ وہ اپنی ذات، حقیقت اور اصلیت چھپانے کے لیے بناوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ ماضی سے خوفزدہ رہتا ہے۔ خواہشوں اور امنگوں کی تکمیل نہ ہونے کے باعث اپنے پیاروں کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔ ان کا سامنا نہیں کر پاتا اور گھر واپس نہیں لوٹ کر جاتا ہے۔ یہ کردار دورِ نئی شخصیت کا بوجھ اٹھائے کہانی میں محبت کی پناہیں تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مجموعی طور پر اس کردار میں قنوطیت اور مایوسی سی چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے جو کہ اس کو ایک مکمل انسان کا روپ دھارنے میں رکاوٹ ہے۔ غربت اسے کلثوم کی محبت میں آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ اس نوجوان میں تمام تر قابلیت کے باوجود اظہار محبت کی طاقت نہیں ہے اس لیے وہ صرف کلثوم کی بوسہ شدہ کتاب کو لا بھری میں

دیکھ لینا ہی محبت کی معراج سمجھتا ہے۔ اس کی محبت و عشق کا جنازہ اس وقت اٹھتا ہے جب اس کے حالات اس کے خلاف فیصلہ سنا دیتے ہیں۔

جب تحصیلداری، نائب تحصیلداری، ضلعدار، آبکاری اور خودکشی کے تمام دروازے بند ہو گئے تو میں بغیر کسی کو اطلاع دیئے سندھ چلا گیا اور تالپوروں کی نوکری کر لی۔ ان کی زمینوں کی آمدنی کا جمع خرچ کر کے ہر روز بڑے سائیں کو ایک پرچہ بھیجنا پڑتا۔ اس کے صلہ میں مجھے دس روپے ماہوار ملتے اور دو وقت کا کھانا۔^۷

الغرض اشفاق احمد کا یہ کردار پورے افسانے پہ چھائے ہونے کے باوجود اپنا ایک الگ تاثر اور شناخت قائم کرنے میں ناکام نظر آتا ہے جو کہ معاشرے کا المیہ اور تلخ حقیقت ہے کہ بندہ مزدور کس طرح شب و روز دال روٹی کے چکر میں اپنے باقی تمام معاملات بھول جاتا ہے۔ اپنی پڑھائی، محبت، والدین، رشتے دار حتیٰ کہ اپنی زمین اور گھر سے بھی دور چلا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے اشفاق احمد نے سماج میں غریب آدمی کی وقعت، معمولات اور گزربسر کی مشکلات کو اس کردار کے ذریعے بہت خوبی سے اجاگر کیا ہے۔

بابا (بابا)

بابا افسانے کا مرکزی کردار ایک بوڑھا شخص ہے۔ یہ ایک اصلاحی کردار ہے جس کا بیٹا وحید ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے ولایت سے واپس آتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی بیوی ایلن اور بیٹا مسعود بھی ہوتا ہے۔ ایلن مغربی عورت ہے اور مذہباً عیسائی ہے۔ دادا اپنے پوتے سے بہت پیار کرتا ہے اور ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ وحید اور ایلن کو جدید طریقے سے کاشت کاری اور مویشی پالنے کا شوق ہے۔ وہ اپنی آبائی زمینوں پر اسی کام کو کاروباری شکل دے کر وسعت دیتے ہیں۔ گھوڑے، فارمی گائے، مرغیاں اور بطنخیں وغیرہ پالتے ہیں اور جدید زرعی آلات سے کام کرتے ہیں۔ ایک دن مسٹر بٹر نامی انگریز کا وہاں سے گزر ہوتا ہے تو گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے رکنہ پڑ جاتا ہے۔ ان کے ساتھ تعارف ہونے پہ ایلن بتاتی ہے کہ وحید میڈیکل ڈاکٹر ہے مگر نوکری نہیں کرتا۔ مسٹر بٹر بتاتا ہے کہ انگریز سرکار کو ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔ وحید نوکری پہ چلا جاتا ہے۔ ایلن حاملہ تھی۔ ایک روز شدید بارش کی وجہ سے نہر ٹوٹ جاتی ہے اور سارا گاؤں بہہ جاتا ہے۔ یہ بلند ٹیلے پہ ہونے کی وجہ سے بچ جاتے ہیں مگر سارا مال اسباب مویشی یا تو مر گئے یا سارے گاؤں کی طرح بہہ گئے۔ ایلن گائے کو بچانے کے لیے پانی میں چھلانگ لگا دیتی ہے اور سردی لگ جانے کی وجہ سے بیمار پڑ جاتی ہے۔ بابا گھوڑے پہ ساتھ والے گاؤں جاتا ہے۔ اور واسطے دیتا ہے کہ بیمار بہو زندگی موت کی کشمکش میں ہے اسے بچا لو مگر کسی قیمت پہ کوئی نرس یا ڈاکٹر ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوتا۔ واپس آتا ہے تو بہو مر چکی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی فسادات شروع ہو جاتے ہیں اور یہ اپنے

پوتے مسعود کو اٹھا کر ساتھ ریلوے سٹیشن پہ دیگر لوگوں کے ساتھ پناہ لیتا ہے مگر بلوائیوں کے حملے میں دیگر لوگوں کے ساتھ مارا جاتا ہے۔ ننھا مسعود بچ جاتا ہے مگر اس کا دنیا میں اب کوئی نہیں رہا۔ یہ افسانہ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے وقت فسادات کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ اس دور کی درد بھری داستان ہے جو کہ اشفاق احمد نے اپنے دو تین کرداروں کے ذریعے پیش کی ہے۔ انوار احمد اپنے ایک مضمون میں اس افسانے کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات پر ہر طرح کے افسانے لکھے گئے ہیں۔ دکھ بڑھانے والے، زخموں

پہ پھاسے رکھنے والے، کچوکے دینے والے، آس بندھانے والے، کلبیت کا مظاہرہ کرنے

والے اور تاریخی بصیرت کو بروئے کار لانے والے۔۔۔۔۔ اشفاق احمد کے دو افسانے

گڈریا اور بابا تو درد کی انتہاؤں کو چھوتے دکھائی دیتے ہیں۔^{۱۸}

اشفاق احمد نے اس افسانے میں بابا کا کردار بہت نازک لفظوں میں پرویا ہے۔ شروع سے آخر تک یہ کردار ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چونکہ یہ ایک نہایت پرسوز معاشرتی و نفسیاتی المیے پر مبنی افسانہ ہے اس لیے اس میں کرداروں کو بہت احتیاط سے تراشا گیا ہے۔ بابا کی بیٹے سے محبت، بہو کے لیے قربانی و ایثار اور پوتے سے وارفستگی اور جذباتی وابستگی اس کردار کو فطری رنگ اور آہنگ دیتی ہے۔ افسانے کا اختتامیہ اس کردار میں رنگ بھر دیتا ہے۔ بابا کی صورت میں اشفاق احمد نے مکمل مشرقی بزرگ کی تصویر پیش کی ہے۔ وہ عیسائی والدہ سے بچے کو بچائے رکھتا ہے اور غیر محسوس طریقے سے مشرقی اقدار اور مذہبی تعلیمات ننھے مسعود میں منتقل کرنے کی کوشش میں لگا نظر آتا ہے۔ ایک ناصح کا کردار جو کہ اڑوس پڑوس میں بزرگی اور دانشمندی کی وجہ سے قابل عزت اور واجب التکریم ٹھہرتا ہے۔ اپنی بہو ایلین کی روک ٹوک کو زیادہ پسند نہیں کرتا ہے اور ننھے پوتے مسعود کو ساتھ ساتھ رکھتا ہے تاکہ وہ اس سے ہر وقت کچھ نہ کچھ سیکھتا رہے۔

بابا مسعود کو لے کر رہٹ پر گیا تھا۔ کچھ دنوں سے وہ اسے کلمہ سکھا رہا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے،

سوتے جاگتے، بابا مسعود سے لا الہ الا اللہ سنا کرتا اور جب وہ ایک مرتبہ بالکل ٹھیک سنا دیتا

تو وہ اسے میٹھی گولیاں اور بسکٹ دیتا۔ اب بھی دور رہٹ کی گدی پر بابا مسعود کو گود میں

لیے کمالو کو کلمہ سنوا رہا تھا۔^{۱۹}

یہاں بابا کی صورت میں ایک ایسے مشرقی بزرگ کا پیکر تراشا گیا ہے جس کی زندگی کا مقصد نسلوں کی بقا اور نسل کی اچھی تربیت کرنا ہے۔ بہو کی وفات کے بعد وہ پوتے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اور آخری دم تک اس کی حفاظت کرتا ہے۔ فسادات کے دوران بلوائیوں کے نیزے اور برچھیاں خود کھا لیتا ہے۔ مگر پوتے کو کچھ نہیں ہونے دیتا۔ اس کردار میں سادہ لوح دیہاتی کی تمام تر خصوصیات موجود ہیں۔ الغرض یہ کردار انسانیت، ہمدردی، اقدار اور انسانی محبت میں گندھا

ہوا نظر آتا ہے۔ رشتوں اور اقدار کا پاس رکھنے والا جس میں مذہبی تعصب نہیں پایا جاتا تھا۔ اشفاق احمد نے بابا کو رنگ، نسل اور مذہب کی تفریق ختم کر کے انسانی محبت کو پروان چڑھانے والے کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ کیونکہ ہر مذہب امن و سلامتی اور محبت و انسان دوستی کا درس دیتا ہے۔ بابا کا کردار بھی افسانے میں مذہبی و اخلاقی اقدار کا پرچار کرنے والا دکھایا گیا ہے۔ بیٹے کی تعلیم کے زمین بچ دینا، بیمار بہو کی تیمارداری، دیکھ بھال کے ساتھ رات کو گھوڑے پر ہسپتال کا سفر اور پوتے کی جان بچانے کے لیے سفر و دیگر اقدامات بابا کو ہر وقت قربانی دینے والے بزرگ کی صورت ثابت کرتے ہیں۔ بلوائیوں کے آخری حملے کے بعد ریلوے سٹیشن کی جانب پیش قدمی کا منظر کچھ اس طرح تھا۔

بابا مسعود کو پیچھے پر لادے جلدی جلدی قدم اٹھا رہا تھا۔ پسینہ کے قطرے اس کی سفید ڈاڑھی سے ٹپکنے لگے۔ مسعود کے لٹکتے ہوئے پاؤں اس کی چرچراتی ہڈیوں سے ٹکراتے تھے اور وہ بوڑھے اونٹ کی طرح تھل تھل کرتا بھاگ رہا تھا۔ دوڑ ختم نہ ہوتی تھی۔ راستہ کٹ نہیں رہا تھا اور اس کا سرخ و سپید پوتا ہولے ہولے رو رہا تھا۔^{۲۰}

اس منظر سے بھی واضح ہوتا ہے کہ بابا کا کردار شروع سے آخر تک قربانی و ایثار کی مثال بنا ہوا ہے۔ ہمدردی و خلوص اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ایک ایسا جیتا جاگتا حقیقی کردار جو ہمیں معاشرے کے مختلف گھرانوں میں آسانی سے مل جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اشفاق احمد نے اس پر فنی توانائیاں صرف کر کے اس کو اس قابل بنا دیا ہے کہ افسانے کے آخر تک ایک بھرپور تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہتا ہے۔

ب: ایک محبت سو افسانے کے ضمنی کردار

توبہ

"توبہ" اشفاق احمد کا لکھا گیا پہلا افسانہ ہے۔ جس کی کہانی سگریٹ نوشی کرنے والے جوان کی توبہ سے متعلق ہے۔ اس افسانے میں مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ ضمنی کرداروں کی تعداد بھی کافی ہے۔ ضمنی کردار افسانے میں ہر جگہ اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ابا جان، تھانیدار صاحب، لاؤڈ سپیکر کا مستری، ظہیر بھیا اور دیگیں پکانے والا باورچی اہم کردار ہیں۔ ان کا معاون کردار نہایت اہم ہے ایک توبہ کہانی کو مکمل کرنے میں مدد دیتے ہیں دوسرا انھی کے ذریعے اشفاق احمد افسانے کا ماحول تشکیل دینے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ والد کا کردار اس افسانے میں نوجوان اعجاز کو پدری شفقت کی وجہ سے ہر قیمت پر سگریٹ نوشی سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ جس سے اس کی صحت پر منفی

اثرات مرتب ہونے کا خدشہ تھا۔ وہ انعام کا لالچ دیتا ہے تاکہ وہ اپنے نوجوان بیٹے کو باز رکھ سکے۔ والد اس کو انعام کا لالچ دیتے ہوئے کہتا ہے۔

اباجی لفافے پر پتہ لکھ کر بولے " لے بھی ترے ساتھ ایک سودا کرتے ہیں اعجاز
 "-----! کیا۔ میں نے پھر کروٹ بدلی۔ تو یہ سگریٹ پینا چھوڑ اور اس کے عوض جو
 انعام چاہتا ہے ہم سے لے، مگر ہو ہماری بساط میں۔^{۲۱}

ہر والد کی طرح اس افسانے میں بھی والد اپنی اولاد کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ حالانکہ اعجاز کے پاس سائیکل پہلے سے موجود تھی مگر پھر بھی اس نے نئی سائیکل لینے کی فرمائش کر دی جسے پورا کیا گیا۔ یہی اس کردار کی خوبی ہے کہ والد کی حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جو کہ اپنی اولاد کی بہتری کے لیے کسی بھی وقت کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہتا ہے۔ ظہیر بھیا اس افسانے کا ایک اور رومانوی کردار ہے جو کہ اس کے ساتھ خالہ زاد کی شادی پہ وہاں گیا ہوا تھا جہاں لیکھا سے اعجاز کی ملاقات ہوئی۔ یہاں اشفاق احمد نے اس کردار کے ذریعے لڑکپن سے نوجوانی کی دہلیز پہ قدم رکھنے والے نوجوان کو پیش کیا ہے۔ جن کے اندر بہت سی ناآسودہ خواہشات معاشرتی گھٹن کے باعث جنم لینے کے بعد اظہار نہیں کر پاتیں۔ ٹین ایجر کی سوچ کو منکشف کیا ہے کہ کس طرح اس عمر میں ہر لڑکا لڑکی پیار محبت عشق کے چکر میں ہوتا ہے۔ چونکہ میلے ٹھیلے اور شادی بیاہ و دیگر تقریبات پہ ملن کے مواقع عموماً زیادہ ملتے ہیں لہذا نو عمر لڑکے ان مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی ظہیر بھیا مرکزی کردار اعجاز کو رومانس پہ اکساتے نظر آتے ہیں۔

ظہیر بھیا جعفری میں آئے۔ مجھے اس طرح بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ارے تم یہاں
 ہو۔ شادی میں یہ کیا رو نکھا چہرہ بنا رکھا ہے۔ انھوں نے میرے کندھے پہ ہاتھ مار کر
 کہا۔ یہاں آئے ہو تو رومانس لڑاؤ۔ ایسے موقعے ہر روز نہیں ملا کرتے۔۔۔۔۔ کچھ ہے
 پریکٹس؟^{۲۲}

یہ اشفاق احمد کا کمال ہے کہ کس خوبصورتی سے یہ مکالمے ضمنی کردار کے ذریعے کہلوا کر نوجوانوں کے اندر چھپے فطری جذبے کی عکاسی کی ہے۔ اس طرح بھیا کے اکسانے پر اور تحریک دینے پر اعجاز کو شہ ملتی ہے جو کہ آگے چل کر لیکھا سے محبت کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ایک اور کردار شادی کے موقع پر دیگیں پکانے والے باورچی کا ہے جو کہ شادی والے گھر دیگیں پکانے آیا ہوا ہے۔ اس کردار کے ذریعے اشفاق احمد نے مزدور طبقہ کی سوچ کی عکاسی کی ہے۔ یہ طبقہ اپنے کام میں ماہر ہونے کے علاوہ سیاست، مذہب، معاشرت، معاشیات اور فلسفہ جیسے موضوعات پر نہ صرف گفتگو کرنا بہت پسند کرتا ہے بلکہ اپنے آپ کو ماہر تسلیم کرنے پر بھی اصرار کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں پر بھی وہ مسلم لیگ کی سیاست

کاتن کرہ کرتا ہے اور مسلم لیگ کی فتح کی نوید سناتا ہے۔ یہ چونکہ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں لکھا گیا افسانہ ہے تو تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ اور آزادی کا پیغام گھر گھر پہنچ چکا تھا۔ وہ کہتا ہے۔

اس دفعہ مسلم لیگ جیتے گی " اس نے پھندنا پکڑ کر ٹوپی اپنے سر سے کھینچی اور اسے انگلی پر گھمانے لگا۔ کیا نام لیگ کا سب سے بڑا افسر آیا تھا۔ ہماری تو ساری کی ساری برادری کیا نام ادھر ہی وہ دے گی۔ اپنے باپ دادا تو سالے ساری عمر بکتے ہی رہے ہیں۔ پر ہم سے تو وہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے رتبہ کے آدمی کی نہ مانیں اور دُور پلے کر بھگت جائیں ادھر۔ ۲۳

دو تین چیزیں واضح ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ باورچی جس طبقے کی نمائندگی کر رہا ہے اس کی اشفاق احمد نے ہو بہو تصویر کھینچی ہے۔ دیگیں پکانے کے دوران جب وہ سستانے کے لیے بیٹھتا ہے تو سیاست کو لے بیٹھتا ہے۔ یہاں وہ مسلم لیگ کو نام لیگ کے نام سے پکارتا رہتا ہے کیونکہ ایسے لوگ ناخواندہ یا کم عمر پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں۔ دوسرا وہ مسلم لیگ کے کسی سرکردہ رہنمایاں اور کرکوافسر کہہ کے پکارتا ہے۔ اس کی نظر میں وہ بھی افسر کے ہی برابر تھا۔ تیسری بات یہ ہے کہ عموماً کم پڑھے لکھے، ناخواندہ لوگ خود کو ہی ہوشیار، عقل کل، چالاک اور باشعور سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ یہاں پر یہ باورچی بھی اپنے باپ دادا پر لعن طعن کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اشفاق احمد نے باورچی کی مختلف مسائل پر سوچ اور فکر کو اس کے اپنے لب و لہجے میں واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

نعیم، سلیم، نانا ابو (فہیم)

اس افسانے میں نانی اماں اپنے نواسے نواسیوں کو رات سونے سے قبل کہانی سنارہی ہیں۔ کہانی سننے والوں میں مرکزی کردار فہیم کے علاوہ اس کے دونوں بھائی نعیم اور سلیم بھی شامل ہیں۔ فہیم سب سے چھوٹا ہے۔ نعیم اور سلیم بھی ایک چارپائی پہ سوتے ہوئے کہانی سننے میں محو ہیں مگر بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ ایک تو تجسس کی وجہ سے سوال بہت کرتے ہیں اور دوسری عادت یہ ہوتی ہے کہ آرام سے نہیں بیٹھتے۔ ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں اور لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ اشفاق احمد نے انھی عادتوں کو ان ضمنی کرداروں کے ذریعے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ضمنی کردار کہانی کو آگے بڑھانے میں اور اس میں دلچسپی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جب کہانی میں جمود اور ٹھہراؤ آ جاتا ہے تو یہ ضمنی کردار سامنے آ جاتے ہیں۔ ان کے مکالمے بہت زبردست اور الفاظ کا چناؤ بہترین ہے۔ کہانی سننے ہوئے نعیم اور سلیم لڑ پڑتے ہیں۔

یار نعیم، ذرا پرے رہ۔ سلیم نے درخواست کی۔ تجھ سے تو بھینس کے کٹرے کی سی بو آتی ہے۔ اور گلاب کا عطر تو میرے خیال میں تیرے پسینے کو شیشی میں بند کرنے سے بن جاتا

ہے نا۔ نعیم بھٹا کر بولا۔ بے شک۔ اور جب نعیم کو کوئی جواب نہ سوچا تو وہ اور نزدیک ہو گیا۔ لے میں تو ایسے ہی سوؤں گا۔ کر لے جو کچھ کرنا ہے۔^{۲۴}

یہاں اشفاق احمد بچوں کی عادات ظاہر کرنا چاہتے ہیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ضد کرتے ہیں۔ طعنے دینا اور طنز کرنا بھی بچوں کا محبوب مشغلہ ٹھہرا مگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود کہیں بھی گفتگو کا معیار گرا ہوا نہیں ہے۔ عامیانہ لب و لہجہ اور انداز گفتگو اپنانے سے گریز کیا گیا ہے۔ اشفاق احمد کے کردار نپنی تلی گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ بچوں کے کردار کو بھی تمیز، سلیقے اور سبھاؤ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بچوں کی عادات و انداز کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا ہے اور ان کی عکاسی منفرد انداز میں کی ہے۔ بچوں کی معصوم حرکتوں اور بچکانہ شرارتوں کا ذکر بھی کیا ہے جو کہ بچوں کا خاصا ہے۔ نانا اس افسانے کا ایک اور ضمنی کردار ہے جن کی زندگی کے واقعات نانی اماں بچوں کو سنار ہی ہوتی ہیں۔ ان کا تعارف ان الفاظ میں کراتی ہیں۔

طبیعت کے بادشاہ تھے تمہارے نانا۔ دل میں کسی چیز کی ٹھان لی تو پھر اسے پورا کر کے ہی دم لیا۔ ہم لاکھ سرماریں، منتیں خوشامدیں کریں، طعنے اُسنے دیں مگر وہی کچھ کرتے جو انھیں پسند ہوتا۔ گڑھ شکر میں تحصیلدار تھے۔ اتنی بڑی حویلی، دو بھینسیں، ایک گھوڑی اور چار کتے۔^{۲۵}

یہاں نانی اماں جہاں نانا کی طبیعت اور مزاج کو بیان کر رہی ہیں وہیں پر ان کے سرکاری عہدیدار ہونے کا بھی بتا رہی ہیں۔ پھر اسی حساب سے ان کی حویلی اور اس میں بندھے ہوئے مویشی اور جانور ان کے متمول ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ سرکاری افسروں اور اعلیٰ عہدیداروں کے مزاج میں درشتگی اور سختی پائی جاتی ہے مگر اشفاق احمد کے کردار سراپا محبت ہی محبت نظر آتے ہیں۔ وہ انسانوں کے علاوہ جانوروں تک سے محبت کرتے ہیں۔ نانا کی وفات کا سبب بھی ان کا ایک پیارا کتا تھا جس کی دیکھ بھال نہ ہونے سبب اور لا پرواہی کی وجہ سے سردیوں کی ایک رات باہر بارش میں ہلاکت ہو جاتی ہے۔ جو کہ ان کو عزیز از جان تھا۔ بچوں پر ذرا سختی نہ کرتے تھے۔ اس حوالے سے نانی اماں بتاتی ہیں۔

میرے اتنے بچے ہوئے۔ نانی اماں نے پھر کہنا شروع کیا۔ مگر تمہارے نانا نے کبھی

ان کو پھول کی چھڑی تک نہ ماری۔ کہا کرتے تھے۔ بچے تو فرشتے ہوتے ہیں۔^{۲۶}

یہاں نانا کے خیالات بچوں کے بارے میں واضح ہوتے ہیں۔ وہ مار پیٹ کی بجائے پیار محبت اور شفقت سے سمجھانے کے قائل نظر آتے ہیں اور تشدد کو گناہ تصور کرتے ہیں۔ کیونکہ بچوں پر جسمانی تشدد ان کی عادتیں بگاڑنے کا سبب بنتا ہے۔ اور بچوں میں منفی عادات پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ بغاوت جیسا جذبہ بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ بچے نارمل اور صحت

مندانہ زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہتے ہیں۔ باغیانہ رویہ ابھرنے کے باعث وہ عدم اعتمادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اشفاق احمد اس کردار کو خدا ترس اور رحمدل انسان کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ایک جگہ نانی اماں بتاتی ہیں۔

جب بھی تمہارے نانا باہر سے آتے کوئی تحفہ ضرور لاتے۔ نانی اماں کو اچانک پھر خیال آیا۔
 کبھی کسی فقیر کو ساتھ لے آتے۔ کبھی کوئی خوبصورت کتا اٹھائے چلے آتے۔ کبھی کسی غریب عورت کو بال بچوں سمیت گھر میں بٹھایا کہ ان کی خدمت کرو۔ میں کما کر لاؤں گا۔^{۲۷}

یہاں نانا کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ وہ غریب پرور انسان تھے۔ فقیروں، محتاجوں اور بے آسرا لوگوں کو کھانا کپڑے اور چھت تک فراہم کرتے تھے۔ جانوروں سے ان کی محبت بھی دکھائی دیتی ہے۔ ہر چھوٹے بڑے عمل سے انسان دوستی اور غریب پروری کا جذبہ چھلکتا ہے۔ معاشرے کے ناپسندیدہ افراد اور طبقات جنہیں کوئی منہ نہیں لگاتا ہے۔ اشفاق احمد اس کردار کے ذریعے ان سے محبت کا درس دیتے ہیں۔

پیٹر (رات بیت رہی ہے)

"رات بیت رہی ہے" افسانے کا اہم ضمنی کردار پیٹر بھی رومانوی کردار ہے۔ یہ نوجوان ہوا باز امریکہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا والد کسی یونیورسٹی میں جغرافیہ کا پروفیسر ہے۔ جس کی جغرافیہ دانی نے پیٹر کو وطن و وطن کی سیر کرنے پہ مجبور کر دیا۔ وہ امریکی فوج میں ہوا باز کے طور پر بھرتی ہوا اور محاذ پہ چلا آیا۔ پائلٹ بننا اس کی محبوبہ مارگریٹ کی خواہش تھی۔ جسے پورا کرنے کے لیے پیٹر یہاں موجود ہوتا ہے۔ مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ پیٹر بھی اس افسانے میں رنگ بھرنے کے لیے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ نوجوان محاذ پر اپنی محبوبہ مارگریٹ کو یاد کرتا رہتا ہے اور دوستوں کو مارگریٹ کی تصویر دکھاتا رہتا ہے۔ محاذ پر ہوا باز پیٹر موت اور زندگی کے بارے میں غیر یقینی کیفیت سے گزر رہا ہے اس لیے اس کی ذہنی کیفیت اور کشمکش کی اشفاق احمد نے بھرپور ترجمانی کی ہے۔ اہل دل کی ایک نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ محبوب کا تذکرہ ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔ یہ کردار بھی اسی طرح پیش کیا گیا ہے۔ جو کہ محبوبہ کی یادوں کا اسیر ہے۔ یہاں اشفاق احمد نے اس کردار کی شخصیت کا صرف ایک پہلو ہی سامنے لایا ہے۔ جو یہ کہ جنگی مصروفیات کے باوجود مارگریٹ کو یاد کرتا رہتا ہے۔ جس سے اس کی مکمل شخصیت واضح نہیں ہوتی۔ ہندوستانی نوجوان خط لکھتے ہوئے اپنی محبوبہ کو پیٹر اور مارگریٹ کے بارے میں بتاتا ہے۔

پھر پرنسٹن یونیورسٹی کی ہلکی سی تمہید کے بعد وہ تیرنے کے اس تالاب کا ذکر ضرور کرتا
 جہاں پہلے پہل ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے کئی ہزار مرتبہ یہ بتانے کے بعد بھی وہ ہر

دفعہ اس بات کا تذکرہ ضرور کرتا کہ اس دن مار گریٹ نے سرخ رنگ کی سکرٹ پہنی ہوئی تھی اور وہ لالے کا پھول دکھائی دیتی تھی۔ جو آسمان سے شبنم کے ساتھ اتر اہو۔^{۲۸}

یہاں پیٹر ایک جذباتی نوجوان کے طور پر سامنے آتا ہے جو کہ اپنی محبوبہ کے بار بار تذکرے سے سیر نہیں ہوتا اور ہمیشہ اپنی پہلی ملاقات کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اسے مار گریٹ کا سرخ رنگ کا لباس تک یاد ہے جسے وہ آسمان سے شبنم کے ساتھ اترے ہوئے خوبصورت پھول سے تشبیہ دیتا ہے۔ محاذ پر پیٹر دفاع وطن میں مصروف عمل ہے مگر اشفاق احمد نے اس کے اندر موجود محبت کے جذبے کو نمایاں کیا ہے۔ گو کہ محاذ پر دیگر مشکلات و مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ غیر یقینی صورت حال بھی ہے مگر وہ اپنی محبت اور محبوبہ کے تذکرے سے خود کو تحریک دیتا ہے اور خود کو رسی چارج کر لیتا ہے۔ فرض کی ادائیگی اور حب الوطنی کو اولیت حاصل ہے مگر بطور انسان وہ اپنے جذبات دوسرے ساتھیوں سے چھپا نہیں سکتا ہے۔ خود اعتمادی اور مستقل مزاجی کے ساتھ دیئے گئے کردار کو بخوبی نبھاتا ہے اور اس کردار میں جان ڈال دیتا ہے۔ گو کہ اس کی المناک موت بے چارگی اور مجبوری کو ظاہر کرتی ہے۔ مگر وہ ایک ہوائی جانباز ہے جس کے نزدیک ملکی سرحدوں کی حفاظت ہی اس کی زندگی کا نصب العین ٹھہرتا ہے۔ جب دوران پرواز پیٹر کے جہاز کی ڈم میں آگ لگ جاتی ہے اور بحری جہاز کے عرشے پر آگرتا ہے تو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا پیٹر مار گریٹ کی تصویر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ جب سٹر پیٹر کو ڈالا جاتا ہے تو وہ دھندلائی آنکھوں سے کہتا ہے۔

پیٹر نے اپنے ناتواں ہاتھوں میں میرا ہاتھ لے کر کہا "ذرا میرا لم تولاؤ" ہارلو میرے پاس کھڑا تھا۔ میں نے اسے کہا اور جب وہ لے آیا تو پیٹر نے کہا آخری تصویر نکالو۔ میں نے مار گریٹ کی وہی تصویر نکالی۔ پیٹر نے اسے اپنی دھندلی نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔ اسے میرے قریب تو کرو اور جب میں نے اسے قریب کیا تو بولا اور نزدیک۔^{۲۹}

اس مکالمے سے واضح ہوتا ہے کہ پیٹر جان سے جاتے ہوئے آخری خواہش کے طور پر مار گریٹ کی تصویر دیکھنا چاہتا ہے۔ محبت کے جذبے میں بھیگے، محبت کی تکمیل کے لیے اپنی جان دے دیتا ہے۔ یہاں اشفاق احمد اس کردار کے ذریعے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جغرافیائی حدود و قیود کے باوجود محبت کرنے والوں کا دل ایک ہی انداز سے دھڑکتا ہے اور محبت کہیں بھی ہو، اسی ایک ہی رنگ میں پائی جاتی ہے۔ ماحول، معاشرے اور مذہب کی قید سے آزاد محبت ایک کلی صداقت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یہاں اشفاق احمد اس کردار کی رومانوی اور داخلی کیفیات کو جزئیات کے ساتھ سامنے لاتے ہیں جو اس افسانے کی خوبصورتی اور دلچسپی میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

خان، جیکی، توقیر بھائی (تلاش)

افسانہ "تلاش" ننھے احسان کے پالتو کتے کی تلاش پر مبنی ہے۔ یہ بھی فسادات اور تقسیم ہند کے تناظر میں رقم کی گئی کہانی ہے۔ خان اور توقیر بھائی اس کے ضمنی کردار ہیں۔ جیکی اس کے پالتو کتے کا نام ہے۔ جیکی کی تلاش کے گرد ہی یہ ساری کہانی گھومتی ہے۔ جس میں ننھے احسان کے ساتھ دیگر گھر والے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ کہانی کا آغاز ہی ان فقروں سے ہوتا ہے جس میں ننھا احسان اس بات کا اعتراف کرتا دکھائی دیتا ہے کہ خان کے بغیر جیکی ہندوستان میں ہی رہ جاتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب لٹے پٹے مہاجرین کے قافلے ہندوستان سے پاکستان کی جانب آرہے تھے۔ انتہائی ضروری ساز و سامان کے علاوہ بہت سی عزیز اور پیاری چیزوں کی قربانی دی گئی اور جدائی کا صدمہ سہنا پڑا تھا۔ احسان اعتراف کرتا ہے کہ۔

ویسے تو یہ دانہ پانی کے اختیار کی بات ہے لیکن اگر خان کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو جیکی

ہندوستان میں ہی رہ جاتا۔ اس بھگدڑ میں لوگ مال و اسباب تو کیا خویش و اقارب تک کو

بھول گئے۔^{۳۰}

خان ایک اہم ضمنی کردار ہے جو کہ جیکی کتے کی وجہ سے احسان کے قریب ہے۔ احسان اس کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کرتا ہے۔ ان حالات میں کہ جب لوگوں کے عزیز و اقارب اور رشتہ دار فسادات کے ہنگاموں کی نذر ہو گئے اور پاکستان کی سرحد پار نہ کر سکے۔ خان ایک کتا احسان کی خاطر ضد کر کے سامان والے ٹرک میں لاد لیتا ہے۔ حالانکہ اس وقت بہت سختی تھی اور گاڑی پر فوجی زیادہ ساز و سامان اور سواریاں لادنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ کیونکہ سفر دشوار ہو جاتا تھا۔ مگر خان نے فوجیوں کے انچارج کیپٹن سے ضد کی اور دھمکی دے ڈالی۔ "خان نے کیپٹن حق نواز سے ہاتھ باندھ کر کہا کہ یہ اس چھوٹے پلے کے لیے جان دے دے گا مگر اسے اپنے ساتھ ضرور لے کے جائے گا۔" فوجی ٹرک پر سامان لادتے وقت جبکہ احسان کی والدہ، والد، بھائی بہنیں اپنی اپنی فکر میں تھیں تو اس وقت خان ہی تھا جس کو احسان کے چھوٹے سے کتے جیکی کی فکر تھی۔ اسی وجہ سے احسان کی نظر میں خان کا قد کاٹھ بڑھ گیا تھا۔ وہ خان کو تشکر آمیز لہجے میں یاد کرتا تھا۔ خان کے کردار کو اشفاق احمد نے بہت احتیاط اور عمدگی سے تراشا ہے۔ وہ اسے ایک رحمدل اور ہمدرد انسان کے روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ ایک ایسا ترس کھانے والا شخص جو کہ کسی ننھے منے بچے کی خواہش پوری کرنے کے لیے جان کی بازی لگانے کو تیار بیٹھا ہوا ہے۔ وہ فرمائش چاہے انسان کے لیے ہو یا ایک پلے کے لیے۔ یہ اس کردار کی خوبی ہے کہ وہ انسان تو انسان دیگر پالتو جانوروں کے لیے بھی پیار اور محبت کا جذبہ اپنے دل میں رکھتا ہے۔ اس کا اظہار زبانی اور عملی طور پر وقتاً فوقتاً کرتا رہتا ہے۔ خان کا کردار ماضی کے واقعات کو یاد کرتا رہتا ہے اور جیکی کی وجہ سے کیا گیا احسان ننھے بچے کو یاد دلاتا

نہیں جینے دیتے۔ دوسرے گھر بھی عذاب بن گیا ہے۔۔۔۔۔ آخر۔۔۔۔۔ آخر
۔۔۔۔۔! وہ پھر خود ہی رک گیا۔^{۳۳}

جیکى کو ہندوستان سے لانے والا خان اسے کہیں دور پھینک آیا تھا۔ اشفاق احمد اس کردار کے ذریعے پختون بھائیوں کے غصے کی تیزی اور شدت کی طرف لطیف سا اشارہ کرتے ہیں۔ پس منظر میں وہ خود بتاتے ہیں کہ خان پختون ہونے کی بنا پر زیادہ باتیں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لہذا اس نے جیکى سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر لیا اور جیکى کو سائیکل پہ باندھ کر کراچی کے کسی دوسرے کونے میں چھوڑ آیا۔ الغرض خان کا کردار ضمنی ہونے کے باوجود اپنی جاندار سی شناخت اور موجودگی کو یقینی بنائے رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

جیکى اس افسانے کا ایک اور اہم کردار ہے جو بظاہر ایک کتا ہے مگر یہاں اشفاق احمد اس کے ذریعے سے انسانوں کے علاوہ جانوروں اور پرندوں سے بھی محبت کا درس دینا چاہتے ہیں۔ داستانوی انداز میں یہاں مرکزی کردار احسان کی جان اس کتے میں اٹکی ہوئی ہوتی ہے۔ احسان کی زندگی جیکى سے جڑی نظر آتی ہے۔ جیکى سے لگاؤ جہاں احسان کی اصلیت کو ظاہر کرنے میں مدد دیتا ہے وہیں پر اس افسانے کو انجام تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ جیکى کا نقشہ اشفاق احمد احسان کی زبانی اس طرح کھینچتے ہیں کہ قاری کو جیکى اپنے ساتھ چلتا پھرتا اور دوڑتا نظر آنے لگتا ہے۔ اچھلتا کودتا جیکى قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ جب ہندوستان سے چلتے وقت جیکى کو گاڑی میں سوار کر لیا جاتا ہے تو کیپٹن حق نواز بھی کتے کے ساتھ احسان کے لگاؤ سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ وہ بھی وقت گزارنے کے لیے اس بچے کی معصوم اداؤں سے لطف اندوز ہونے کے لیے سوال جواب کرتا ہے۔ جب کیپٹن کے پوچھنے پر احسان یہ بتاتا ہے کہ جیکى کی صفت یہ ہے کہ یہ بھونکتا ہے تو کیپٹن کو ہنسی آ جاتی ہے کہ بھونکتے تو سارے کتے ہی ہیں۔ جیکى میں کیا خاص خوبی ہے تو احسان بتاتا ہے۔

اس کے بیس ناخن ہیں۔ دوسرے کتوں کے صرف اٹھارہ ہوتے ہیں۔ پانچ پانچ آگے اور

چار پیچھے۔ وہ اتنے طاقتور نہیں ہوتے۔ جیکى بہت طاقتور ہے۔ اس کا سر دیکھیے۔

نور دین کہتا تھا جب یہ بڑا ہو جائے گا تو ریچھ کا شکار کرے گا۔ بیس ناخنوں والے کتے اپنے

پنچے ریچھ کی آنکھوں میں گاڑ کر اس کی تھو تھنی چبا جاتے ہیں۔^{۳۴}

بطور کردار اس کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اشفاق احمد نے اس کو بھی پوری جزئیات کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اگر احسان جیکى سے انس رکھتا ہے تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جیکى ہے ہی اس قابل کہ اس سے پیار کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ جیکى بھونکتا رہتا تھا اور جاگ کر رکھوالی کرتا تھا۔ ایک دفعہ دو بھکاریں لمبے لمبے کرتے پہنے ان کے گھر کے

سامنے سے گزرتے ہوئے احسان کی چھوٹی بہن ٹینم کافراک لے کر بھاگنے لگیں تو جیکی زور زور سے بھونکا۔ امی آواز سن کر باہر نکلیں تو وہ فراک چھوڑ کر بھاگ گئیں۔ امی اس واقعے کی وجہ سے جیکی کی تعریف کرتی تھیں۔

امی نے جیکی کا یہ کارنامہ سب کو سنایا۔ احسان کا چہرہ خوشی سے تہمتا اٹھا۔ اس کا

دل چاہا کہ وہ جیکی کو گود میں اٹھا کر ایک بار تو بس چوم لے۔^{۳۵}

جبکی کی تعریف و توصیف اور عزت افزائی سے احسان کو خوشی ملتی تھی۔ مگر امی کا خیال تھا کہ یہ کتنا کمزور ہے اور دیکھ بھال مناسب نہ ہونے کی بنا پر اور خوراک وغیرہ وقت پر نہ ملنے کی وجہ سے کمزور سا ہے۔ اگر اسے مناسب خوراک ملے تو یہ شیر کی طرح بن جائے۔ یہ باتیں احسان کے دل کو لگیں اور اسے احساس ہوا کہ وہ کتے کی خوراک میں احتیاط نہیں کرتا۔ اس لیے جب امی اس کی چھوٹی بہن کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئیں تو احسان نے منصوبہ بنایا کہ اگلی پچھلی کسر نکال دی جائے۔

ان کی غیر موجودگی میں جیکی کو مکھن لگے نوالے کھلانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ پر ڈاکٹر بھی پتہ

نہیں کتنا بے حس آدمی نکلا کہ بغیر نشتر زنی کے مرہم لگا کر لوٹا دیا۔ احسان ابھی تک گلی میں کھڑا

اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا کہ امی جان واپس آ گئیں اور جیکی کی ضیافت منسوخ ہو گئی۔^{۳۶}

جبکی کی صورت میں اشفاق احمد نے ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جس کے ذریعے بچوں کے دلوں میں اپنے کھلونوں اور پالتو جانوروں کے لیے بھرپور محبت اور اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ بلکہ جیکی کی گمشدگی ہی احسان کے لیے ایسا صدمہ ہے جس کی بنا پر وہ اس کو تلاش کرتے کرتے گھر والوں سے ہمیشہ کے لیے کھو جاتا ہے۔

سنگ دل

برصغیر کی تاریخ میں ۱۹۴۷ء کے سال جو واقعہ وقوع پذیر ہوا اس نے پاک و ہند کے باشندوں کو کس بری طرح متاثر کیا، اُس کا اندازہ آنے والے سالوں میں لگایا جاتا رہا ہے۔ آنے والی نسل نے دیکھا کہ تقسیم اور آزادی کی کتنی قیمت آباؤ اجداد نے چکانی۔ یہ افسانہ بھی تقسیم برصغیر کے دوران اغوا ہونے والی لڑکیوں کی برآمدگی پر مبنی ہے۔ ایک فوجی کیپٹن اور اس کی محبوبہ بچی کے گرد یہ کہانی تشکیل دی گئی ہے۔ مگر چند ایک ضمنی کردار ایسے ضرور ہیں جنہوں نے کہانی میں اپنے ہونے کا احساس ضرور دلایا ہے۔ پتاجی، محمد خان، دین محمد، امر اور سجن سنگھ ایسے مردانہ کردار ہیں جو افسانے میں موجود ہیں۔ نوجوان کے والد اسٹنٹ سرجن جبکہ بچی کے پتاجی سب انسپٹر پولیس تھے۔ دونوں کی دوستی کی ابتدا کیسے ہوئی۔ نوجوان بتاتا ہے۔

جس دن ابا جان سب اسٹنٹ سر جن لگ کر یہاں آئے تھے، اسی دن پتاجی سب انسپکٹر پولیس تعینات ہوئے۔ دونوں کی ملاقات ریل گاڑی میں ہوئی اور یہ واقفیت بڑھتے بڑھتے گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔^{۳۷}

یہ دونوں مذہبی کردار بزرگوں کے روپ میں افسانے کا حصہ ہیں۔ ان دونوں کرداروں کو اشفاق احمد نے مذہبی رواداری کی مثال کے طور پر پیش کیا ہے کہ ہندوستان کے دیہاتوں میں لوگ بلا تفریق مذہب ایک دوسرے کے دکھ سکھ کا حصہ بنتے تھے۔ ایک دوسرے کو اپنا سمجھتے تھے۔ تھانہ اور ہسپتال قریب ہونے کی بنا پر یہ دونوں کردار اپنا فارغ وقت زیادہ تر اکٹھے گزارا کرتے تھے۔ دونوں کی طبیعت سخت گیر تھی۔ تبادلوں کے بعد خط و کتابت اور تحائف کا سلسلہ جاری رہا۔ مشترکہ شغل دونوں حضرات کا سگریٹ نوشی تھا۔ اسی دوران فسادات شروع ہو گئے اور ان لوگوں کو مشرقی پنجاب سے پاکستان ہجرت کرنا پڑی۔ خدادا، محمد خان دوزیلی کردار ہیں جو کہ فوجی ہیں اور کیپٹن کے ساتھ ڈیوٹی پر ہیں۔ ڈاک کی آمد و رفت، فوجی ٹرک کی ڈرائیونگ، کھانا پکانا وغیرہ ان کے ذمے تھا۔ دونوں فوجی ماحول کے کردار ہیں جن کی افسانے میں موجودگی فوجی ماحول، دفتری خط و کتابت و دیگر معاملات کو ظاہر کرتی ہے۔ ہجرت، فسادات، لٹے پٹے مہاجر قافلوں کی آمد، عورتوں کا اغوا و بازیابی کوئی خاص دلکش موضوع نہیں تھا مگر ان کرداروں کی بنا پر اشفاق احمد نے اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے۔ خداداد ہنڈیا پکانے پہ مامور تھا۔ پالک آلو پکانے کی منظر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک ہنڈیا ہمیشہ چار حصوں میں پکایا کرتا ہے۔ خداداد نے ایک دپیگی میں آلو اہال رکھے تھے۔ دوسری میں پالک اہال رہا تھا۔ اس کے بعد وہ ان دونوں کو ایک بڑی دپیگی میں ڈال کر ہلانے والا تھا۔ مصالحہ بھون کر تیسری دپیگی کا مواد وہ اس میں انڈیلنے لگا۔ لیجیے صاحب سالن تیار ہے۔^{۳۸}

اشفاق احمد خداداد نامی فوجی کو ایک پیشہ ور باورچی کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ وہ اپنے فن میں ماہر تھا اور کھانا پکانے کی تراکیب اور طریقوں سے واقف تھا۔ یہ چیز فوجی طرز زندگی کے ایک اور وصف کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ دیس پر دیس رہنے کی بنا پر وہ بہت سا کام اپنے ہاتھوں سے کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں پر کوئی اور ایسا نہیں ہوتا ہے۔ دوسرا وہ اس کام کو بطریق احسن سرانجام دیتے ہیں نہ کہ سرسری طور پر کچھ بھی کر لیا۔ ان میں یہ پیشہ ورانہ صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہیں۔ امر پچی کا چھوٹا بھائی ہے۔ جس کے اندر بچپنا، معصومیت اور بھولا پن موجود ہے۔ بچوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ

سوال جواب اور باتیں زیادہ کرتے ہیں۔ ہر بات منہ پر صاف صاف کہہ دیتے ہیں۔ امر بھی اس افسانے میں بچوں کی سی ضد کرتا ہے۔ کیپٹن سے ٹافیاں منگوانے کی فرمائش کرتا ہے۔ پچی اس بارے میں بتاتی ہے۔

جب سے بی بی کا انتقال ہو گیا ہے۔ امر بہت ضدی ہو گیا ہے۔ پتاجی اس سے بہت لاڈ کرنے لگے ہیں اور یہ بگڑتا جاتا ہے۔ سارا دن نانی کو تنگ کرتا ہے۔ نوکروں سے جھگڑتا ہے۔ گندے لڑکوں سے کھیلتا ہے اور حد درجے کا چٹورا بن گیا ہے۔^{۳۹}

یہ تمام عادتیں بچوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کردار بچوں کی نمائندگی درست طور پر کر رہا ہے۔ بچے ویسے بھی لاڈلے ہوتے ہیں مگر والدین میں سے کسی ایک کی وفات ان پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ خصوصاً ماں کی مامتا سے محرومی بچوں کی نفسیات اور جذباتی نشوونما کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ کیونکہ ماں ایک ایسی ہستی ہے جو بچوں کو ان کے نفسیاتی تقاضوں اور ذہنی صلاحیتوں کے مطابق پرورش کرتی ہے۔ اس کام کے لیے ماں کا ماہر نفسیات ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ لاشعوری طور پر مامتا کے جذبے سے مجبور ہو کر یہ سب کچھ کرتی ہے اور یہی جذبہ ہم انسانوں کے علاوہ چرند، پرند، جانوروں حتیٰ کہ درندوں میں بھی دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں۔ بچے من کے سچے ہونے کی وجہ سے بات صاف اور کھلے انداز میں کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اسی عادت کو اشفاق احمد نے امر کے کردار کے ذریعے یوں ظاہر کیا ہے۔

شام کو ہم و لگن میں گئے تو امر نے بتایا کہ اب یہ علاقہ مسلوں سے بالکل صاف ہو چکا ہے۔ مٹلے بہت برے ہوتے ہیں۔ اس نے ہوا میں گھونسا گھما کر کہا! سب کو مارتے ہیں۔^{۴۰}

سجن سنگھ ایک خالصہ ہے جسے ظالم اور بے رحم انسان دکھایا گیا ہے۔ اس نے ایک مسلمان لڑکی حسنا کو اغواء کر کے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ جب وہ چٹھی پچی کے ہاتھ لگتی ہے تو وہ پڑھ کر کہانی کی تہہ تک پہنچ جاتی ہے۔ پچی سجن سنگھ کا تعارف کچھ اس طرح کرتی ہے۔ "سجن سنگھ بہت برا آدمی ہے۔ میں نے عرضی میں آج اس کا نام پڑھ کر ہی حسنا کی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ گو وہ پتاجی کا دوست ہے اور میں اسے چاچا جی کہتی ہوں۔ پر وہ چاچا کہلانے کا مستحق نہیں۔" "اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سجن سنگھ کتنا ظالم اور سخت دل آدمی ہوگا۔ اشفاق احمد کے کردار جہاں زیادہ تر عشق و محبت کے داعی نظر آتے ہیں۔ وہیں اشفاق احمد نے معاشرے میں موجود منفی عناصر کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ اور اس کی حقیقی تصویر پیش کرنے کے لیے سجن سنگھ نامی کردار تراشا ہے۔ کیونکہ خیر اور شر کی دونوں قوتیں موجود ہیں۔ جہاں مثبت انداز فکر والے لوگ موجود ہیں۔ وہیں معاشرے میں اس طرح کے کردار بھی بکثرت ملتے ہیں۔ سجن سنگھ ظالم اور جابر ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر اور دلیر بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ جب پچی رات کے اندھیرے میں حسنا نامی لڑکی کو دیوار پھلانگ کر نکال کر لے آتی ہے تو وہ بھی سجن سنگھ

سے ڈر رہی ہوتی ہے۔ وہ اپنے ڈر اور خوف کا اظہار دیگر فوجیوں سے یوں کرتی ہے۔ ”جب حسنا بیٹھ گئی تو پچھی نے خداداد اور محمد خان سے کہا۔ اپنی سٹین گن میں میگنیزین چڑھا لو۔ سجن سنگھ بہت کڑا آدمی ہے۔“^{۴۲}

یہ منظر حسنا کو ٹرک میں سوار کرانے کا تھا اور یہ مکالمہ وہیں دہرایا گیا تھا۔ سجن سنگھ اگر بد قماش اور بد طبیعت آدمی نہ ہوتا تو وہ لڑکی کو اغواء ہی کیوں کرتا اور نہ ہی لوگوں کو اس کی غیر موجودگی میں ڈرنے اور خوف کھانے کی ضرورت تھی۔ یہ سماج کے اندر چھپے منفی سوچ کے حامل لوگوں کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اس کو افسانے میں جو کردار دیا گیا تھا۔ فن کی رو سے وہ اپنے معیارات پر پورا اترتا ہے اور بد معاشی و شر پسندی کا آئینہ دار ہے۔

مسٹر بھومکا، سپورن سنگھ، کامریڈ اصغر اور نذر ماموں (شب خون)

"شب خون" ٹی بی کے مریضوں کے حالات و واقعات پر مبنی ایک افسانہ ہے جس میں ساری کہانی ٹی بی کے مریضوں کے گرد گھومتی ہے جو ہسپتال کے ایک وارڈ میں زندگی کے آخری لمحات گزار رہے ہوتے ہیں۔ ضمنی کرداروں میں مسٹر بھومکا، سپورن سنگھ، صوفی ابراہیم، نذر ماموں، بوٹی میاں اور کامریڈ اصغر کے علاوہ ننھا خالد شامل ہے۔ یہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اور مذہبی کردار ہیں۔ یہ وہ مریض ہیں جو اعتدال پسند اور صلح جو طبیعت کے مالک ہیں اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور باتیں ایک دوسرے کو بتاتے ہوئے موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ حالات سے سمجھوتا کیے ہوئے یہ کردار آنسو نہیں بہا رہے ہیں بلکہ اپنے حال میں مست ہیں۔ خود فریبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خوش رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ الجھتے نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ زندگی کے اس رنگ کو بھی قبول کیے ہوئے ہیں۔ داخلی سکون اور طمانیت کا واضح احساس اور جھلک نظر آتی ہے۔ مسٹر بھومکا ایک ہندو مریض ہے جو زندگی کے آخری حصے میں بھی عورتوں پہ نظر رکھتا ہے اور اپنی چھپی ہوئی نا آسودہ خواہشات بیان کرتا ہے۔ بیٹرس نامی خوبصورت نرس شوق کے پاس سے دوائی دے کر جب اٹھ کے جاتی ہے تو مسٹر بھومکا ان الفاظ میں خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

اس کی باڈی کا کٹ دیکھا۔ مسٹر بھومکا نے اسے پھر متوجہ کیا۔ میری منجھلی سالی سے بہت ملتی

ہے۔ ویسی بیک، وہی سینہ اور رانیں تو ایک دم وہی۔ یہ اگر ہمارے مدر اس میں ہوتی تو میں ضرور

اس سے شادی کرتا۔^{۴۳}

مدر اس کا رہنے والا ہندو مسٹر بھومکا بھی ٹی بی کا مریض تھا مگر وارڈ میں اس کے تبصرے سننے کے لائق ہوتے تھے۔ عام سماجی زندگی کے معیارات کو وہ ایک خاص انداز فکر سے دیکھتا تھا۔ اس کی باتیں سننے کے لیے ٹی بی وارڈ کے مریض بے چین رہتے تھے۔ اس کردار کے ذریعے اشفاق احمد جہاں مختلف طبع اور مزاج کے لوگوں کی نفسیات اور سوچ سے آگاہی دینا چاہتے ہیں وہیں پر وہ افسانے میں تنوع اور رنگارنگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر بھومکا کا کردار دلچسپ تھا جو کہ افسانے کو

بوریت سے بچائے رکھتا ہے۔ کامریڈ اصغر بھی دق کا مریض ہے۔ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص مکتب فکر کا حامل اور پیروکار شخص ہے۔ یہ خدا کی ذات سے انکار کرنے والا سیکولر شخص ہے۔ جو دیگر مریضوں کے خدا کے بارے میں تصورات اور اعتقادات کو غیر سنجیدگی سے لیتا ہے اور ان کا مذاق اڑاتا رہتا ہے۔ مسٹر بھومکا جب تمام مریضوں کو یہ یقین دلاتا ہے کہ اگر یہ گرمیاں آپ لوگ نکال جاتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ اگلی گرمیوں تک سائنسی ترقی کی بدولت ٹی بی کا علاج ایجاد ہو جائے مگر کامریڈ اصغر کہتا ہے۔ "ٹی بی کا علاج تو خدا کے پاس بھی نہیں۔ کامریڈ اصغر کے پہلو سے آواز آئی۔" "مسلمانوں کے مذہبی عقیدے کو دیکھا جائے تو مایوسی کفر کے مترادف ہے مگر دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کا بھی اعتقاد ہے کہ خدا قدرت رکھتا ہے مگر کامریڈ اس بات سے انکاری ہے اور اسے انسانوں کا واہمہ قرار دیتا ہے۔ نیکی و بدی اور موت و پیدائش کے بارے میں آزاد خیال فلسفے کا حامل ہے۔ بہر حال اس کے خیالات اور نظریات جو بھی ہوں۔ افسانے میں اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے بھرپور طریقے سے اپنے فلسفے کی تشہیر اور تشریح و توضیح کرتا ہے۔ سپورن سنگھ ایک ریٹائرڈ فوجی سکھ ہے۔ خاصا ہنس مکھ اور خوش مزاج ہے اور تمام مریضوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے بہت سے تصورات، خواب اور خواہشات دیگر مریضوں کی طرح ہی ہیں۔ عام زندگی کے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر اپنے خاندان، بہن بھائیوں اور برادری کی تعریف کرتا ہے اور انھیں زندگی کا اثاثہ قرار دیتا ہے۔ جب سارے مریض اس بات پر اتفاق کر لیتے ہیں کہ جب ہمیں ہسپتال میں دیکھنے کوئی نہیں آتا ہے تو ہماری موت پہ کون روئے گا تو سپورن سنگھ بتاتا ہے کہ میرے سارے روئیں گے مجھے۔ ڈاکٹر سے بھی اپنی فیملی اور بھائیوں کی تعریفیں کرتا رہتا ہے۔ اسے اپنے رشتوں پر بہت مان ہے۔ وہ بھائیوں پر اپنا حق جتاتا ہے۔ جب سپورن سنگھ اپنے پہلوان بھائی کا ذکر کرتا ہے تو ڈاکٹر کہتا ہے کہ۔

بہت خوب۔۔۔ اچھا وہ تمہیں خون دے گا؟ کیوں نہیں جناب۔۔۔! وہ اپنا خون جو

ہوا۔ سسٹر اسے لکھ دو۔ یہ پروگریس کرے گا۔ ممکن ہے ری کور کر جائے۔ ویل ڈاکٹر

کہہ کر سسٹر نے اس کا چارٹ اتار لیا۔^{۴۵}

نذر ماموں ایک مالدار کاروباری شخص ہے جو کہ حقیقت پسند کردار ہے۔ ہر وقت اپنے کاروبار کی فکر میں گم رہتا ہے۔ اس کی اپنے قبیلے اور برادری میں بہت عزت ہے۔ وہ شقومیوں کی عیادت کو جب ہسپتال آتا ہے تو وارڈ والے اور عملہ اس سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ وہ رکھ کھاؤ اور وضع قطع سے بہت زیادہ دولت مند لگ رہا تھا۔ تیماردار اور دیگر لوگ ٹی بی کی وارڈ میں عام طور پر سانس نہیں لیتے ہیں کہ یہ مرض لاحق نہ ہو جائے۔ نذر ماموں بھی ایک ہی سانس میں بہت سی معلومات دے کر رخصت ہو جاتا ہے۔ وہ شقومیوں سے کہتا ہے۔

کچھ پیسوں کی ضرورت ہو تو لے لو۔ نذر ماموں نے بٹوا جیب سے نکال کر کہا۔ اب تو میرے پاس ہیں پھر شاید ختم ہو جائیں۔ یہاں آئل انجن خریدنے آیا تھا۔ لکڑی کا بیوپار تو اب ختم ہی سمجھو۔ جنگ رک گئی۔ ٹھیکیداری ختم ہو گئی۔ ملتان میں برف خانہ لگانے کا ارادہ ہے۔ ہر روز ہزار من برف بنے گی۔ دوسرے کارخانوں میں تو یہی چار پانسو من برف بنتی ہے۔ غفور بھائی کو میسر بنایا ہے۔ دیکھیں کیا کرتے ہیں۔^{۴۶}

اس کے علاوہ وہ برآمدات درآمدات مری بنگلہ، لاہور، حیدر آباد گاڑیوں کا پرمٹ، راولپنڈی میں جائیداد کی خریداری کے ساتھ ساتھ نئی کمپنیاں بنانے کا بھی بتا کر جاتا ہے۔ آخر میں کہہ جاتا ہے کہ ممائی کو ضرور بتانا کہ میں آیا تھا۔ یہ کردار کاروباری طبقے کی سوچ اور فکر کی عکاسی کرتا ہے۔ جنہیں ہر وقت اپنے کاروبار کی فکر ہوتی ہے۔ وہ اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوتے ہیں۔ حالانکہ جس کام کے لیے وہ آیا تھا یعنی مریض کی عیادت تو وہ تو رہی ایک طرف۔ اس نے حال احوال تک نہ پوچھا۔ بس ایک سانس میں جتنی باتیں کر سکتا تھا، کر کے چلا گیا۔ ایک اور بات کہ کاروباری بندہ کبھی اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا یا اس بندے کو منہ نہیں لگاتا جس میں اسے کوئی فائدہ نظر نہ آ رہا ہو۔ یہاں پر بھی وہ ممائی کے کہنے پر چلا آیا اور اپنی کہانی سنا کر چلا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کردار بھی دیگر کرداروں کی طرح اپنے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔

وحید، بٹر، مسعود (بابا)

اس افسانے کے مرکزی کردار ایک بزرگ بابا اور انگریز عورت ایلن ہیں۔ ایلن وحید کی بیوی اور بابا کی بہو ہے۔ وحید بابا کی اکلوتی اولاد ہے جسے بابا میڈیکل کی تعلیم کے لیے ولایت بھیجتا ہے۔ وہ وہاں سے ایلن نامی خاتون سے شادی کر کے واپس لوٹتا ہے۔ دونوں کا ایک بچہ مسعود بھی ہے جو بمشکل چار پانچ سال کا ہو گا۔ اشفاق احمد فسادات کے تناظر میں لکھے گئے اس افسانے میں اخلاقی و اصلاحی مقصد کے ساتھ ساتھ محبت کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ کہانی کا مرکز و محور ایک عام کاشت کار گھرانہ ہے جس میں وحید کو ایک فرمانبردار مرد کے طور پر کردار دیا گیا ہے۔ جسے کاشت کاری کے جدید طریقے اپنانے کا بہت شوق ہے۔ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود وہ واپس آ کر جدید مشینری کے ذریعے کاشتکاری کے ساتھ ساتھ اعلیٰ نسل کے گھوڑے، گائیں، بٹخیں اور مرغیاں پالتا ہے۔ ایلن اس شوق کے حق میں نہیں ہے بلکہ وہ کہتی ہے کہ وحید کو نوکری کرنی چاہیے اور بیرون ملک مشکل سے حاصل کی گئی مہنگی تعلیم سے مخلوق کو فائدہ دینا چاہیے۔ ان کے علاقے میں انگریز ایکس ای این بٹر کی گاڑی خراب ہو جاتی ہے۔ تو وحید اور ایلن اس کی مدد کرتے ہیں۔ اس کی گاڑی ٹھیک کراتے ہیں۔ اس دوران وہ ان کی مہمان نوازی اور گفتگو سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ایلن اپنے آبائی علاقے کا تعارف مسٹر بٹر کو کراتی ہے۔ وہ بھی اس کے خاندان کو جانتا ہوتا ہے۔ ایلن خواہش کا اظہار کرتی ہے کہ اگر وحید ڈاکٹر کی نوکری کرے تو

بہت اچھا ہے۔ کیونکہ یہ اپنا آپ کھیتی باڑی میں ضائع کر رہا ہے۔ ایلن کی باتوں سے بڑا اتفاق کرتا ہے اور وحید کو اپنی بیوی کی خواہش کا احترام کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

بڑنے کہا بیویوں کے دل میں جو پیاری پیاری تمنائیں کروٹیں لیتی رہتی ہیں انھیں پورا ہی کرنا چاہیے۔ بابا کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھے خود اپنے باپ سے دلچسپی نہیں۔ لیکن آپ کی مسز کے بارے میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ انھیں سنہری سپنے بننے کے لیے دھاگے اور مقیش لاہی دیجیے۔^{۴۷}

مسٹر بڑ کے خیالات مغربی معاشرے کے پروردہ شخص کے ہیں جس کی نظر میں بیوی، گرل فرینڈ کی بہت زیادہ عزت اور احترام ہے جبکہ والدین کی طرف سے وہ بے نیاز ہے۔ وحید کو وہ مشورہ دیتا ہے کہ اسے اپنی بیوی کی خواہش پوری کرنی چاہیے۔ وحید اس سے پہلے ایلن کو بتا چکا تھا کہ جنگ بند ہونے والی ہے (جنگ عظیم دوم کی طرف اشارہ ہے) فوجی بھرتی پر پابندی لگی ہوئی ہے تو میں نوکری کیسے حاصل کر سکتا ہوں۔ بڑ ان کی یہ باتیں سن رہا ہے۔ وہ وحید کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ "اگر آپ کو نوکری مل جائے مسٹر وحید۔۔۔۔۔ تو آپ کریں گے۔۔۔؟ وحید نے وثوق سے کہا۔ کیوں نہیں؟ لیکن وہ ایلن کی مرضی کے مطابق ہو۔ ۴۸" وحید کا کردار ایک ایسے نوجوان شوہر کا ہے جسے رشتوں کا احساس ہے۔ وہ ایک محبت کرنے والا شوہر ہے۔ اپنی زندگی سے جڑے لوگوں اور رشتوں کے جذبات و احساسات کی قدر کرنے والا اور رشتوں کو نبھانے والا مخلص نوجوان ہے۔ یہ اس کی خالص محبت ہی تھی کہ دیار غیر میں اپنے ہم جماعت جوزف کی بہن ایلن اس سے متاثر ہوئی، شادی کر لی اور وحید کی خاطر اپنا گھر بار اور ملک تک چھوڑ دیا۔ یہ نکتہ بھی وحید کی سوچ اور طرز عمل کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ ابھی بھی جب ایلن بڑ سے کہتی ہے کہ یہ نوکری نہیں کرتا تو وہ اس کی خواہش کے مطابق نوکری کرنے کی ہامی بھر لیتا ہے اور بعد ازاں فوج میں میجر کا عہدہ قبول کرتے ہوئے نوکری پر چلا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے وحید کا کردار متاثر کرنے والا ہے۔ ان دونوں کا ایک بیٹا مسعود ہے جس میں دادا کی جان ہوتی ہے۔ بابا اپنے پوتے مسعود سے بہت زیادہ پیار کرتا ہے جو کہ مغربی معاشرے کی خاتون ایلن کے لیے نئی بات ہے۔ وہاں مشرقی معاشرے کی نسبت رشتوں میں دوریاں پیدا ہو چکی ہیں مگر مسعود کے ساتھ انس اور محبت کرتے ہوئے جب ایلن دیکھتی ہے تو کہتی ہے۔ "ایلن نے متنا بھری نظروں سے اُدھر دیکھا اور پلٹ کر وحید سے پوچھا۔ تمہارے دیس میں سارے دادے اپنے پوتوں سے کیا ایسا ہی پیار کرتے ہیں؟ ۴۹" ایلن کے لیے مسعود کو دادا کا پیار ایک خوش گوار تجربہ ہوتا ہے جو اسے حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ مسعود کا کردار ایک عام نارمل سے بچے جیسا ہے۔ بچوں میں جستجو، تجسس کا جذبہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے اور بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ سوالات بہت کرتے ہیں اور اسی طرح سیکھتے بھی ہیں۔ ہر دکھائی دینے والی چیز ان کے

لیے نئی ہوتی ہے اور اس کے بارے میں معلومات لینا ان کا مشغلہ ہوتا ہے۔ مسعود کے معصوم ذہن میں بھی ہر وقت سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں جو وہ اپنے بابا سے پوچھتا رہتا ہے۔ رات کو جب بابا اسے سنانے کے لیے اپنے پاس لٹاتا ہے تو وہ سوال کرتا ہے۔

بابا! تارے رات کو کیوں نکلتے ہیں۔ دن کو کیوں نہیں نکلتے؟ دن کو نہیں نکلتے بیٹا۔ بابا نے سمجھا کر کہا۔ مسعود نے کہا۔ اچھا۔۔۔! بابا ہماری بیری کے پتے ہرے کیوں ہیں؟ پتے ہرے ہی ہوتے ہیں بیٹا۔ بابا نے نباتات کا کلیہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ مسعود نے پھر پوچھا بابا گھوڑے ہرے کیوں نہیں ہوتے۔^{۵۰}

فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ننھے مسعود کے معصوم دماغ میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ بچوں کی فطرت اور خصلت بتائی گئی ہے کہ جس چیز پر بھی نظر پڑتی ہے، اس کے بارے میں سوال داغ دیتے ہیں۔ خواہ ان میں کوئی ربط یا تعلق ہو یا نہ ہو۔ لیکن بچہ سوال ضرور کرتا ہے۔ اسی طرح کی عادت مسعود میں بھی پائی جاتی ہے۔ مسعود نے بچے کے کردار کو خوب نبھایا ہے۔ بچوں کی اس عادت سے چڑنا نہیں چاہیے اور اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس عمل کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ درست انداز میں ذہنی نشوونما ہو سکے۔

ج۔ اُجلے پھول کے مرکزی مردانہ کردار

اشفاق احمد کا دوسرا افسانوی مجموعہ ۱۹۵۷ء میں "اُجلے پھول" کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں نو افسانے شامل ہیں۔ جن میں اُجلے پھول، گڈریا، صفدر ٹھیلا، ایل ویرا، برکھا اور گل ٹریا قابل ذکر ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ مشہور زمانہ افسانہ "گڈریا" ہے جس نے اشفاق احمد کو خاص پہچان بنانے میں مدد کی۔

داؤجی (گڈریا)

"گڈریا" اشفاق احمد کا لکھا ہوا وہ افسانہ ہے جس نے اوائل عمری میں ہی اشفاق احمد کی ایک الگ پہچان بنا دی۔ ناقدین، معاصرین اور قارئین کی پسندیدگی نے ان کو شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ یہ افسانہ ان کے دوسرے مجموعے "اُجلے پھول" میں شامل ہے۔ لاجواب کہانی پر مشتمل یہ افسانہ ان کی پہچان بن گیا حتیٰ کہ لوگوں نے ان کی وفات پر کہا کہ آج گڈریا چل بسا۔ یہ اس افسانے اور اس میں شامل داؤجی کے کردار کے امر ہو جانے کی دلیل ہے۔ داؤجی ایک مدور اور متحرک کردار ہے جو کہ اشفاق احمد نے فن کردار نگاری کے تمام اصولوں اور لوازمات کو مد نظر رکھتے ہوئے تراشا ہے۔ نفسیاتی، سماجی اور لسانی کیفیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے داؤجی کے کردار کی نفسیاتی و کیفیاتی جھلکیاں بہت اہتمام اور

احتیاط کے ساتھ پیش کی ہیں۔ گڈریا کا مرکزی کردار داؤجی ایک محنتی استاد، شفیق والد، شریف النفس انسان، عاجز شوہر، علم دوست شخص اور مذہبی رواداری کا حامل ایک ایسا ہمہ جہت کردار ہے جس کی شخصیت کے کسی پہلو میں افسانہ نگار نے کمی نہیں چھوڑی ہے۔ اس حوالے سے "لاہور میں اردو افسانے کی روایت" میں مصنف ڈاکٹر طیب طاہر لکھتے ہیں۔

اشفاق احمد کے ہاں سب سے نمایاں کردار گڈریا کا داؤجی ہے جو کہ آفاقی محبت اور مذاہب اور نسلوں سے ماوراء محبت کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ کردار جہاں متصوفانہ رنگ لیے ہوئے ہے وہیں بھگتی تحریک سے متاثر ہونے کا نتیجہ بھی لگتا ہے۔ داؤجی کا کردار اسلام کی حقیقی روح کی نمائندگی بشری تقاضوں کے مطابق کرتا ہے۔^{۵۲}

اشفاق احمد کے افسانہ "گڈریا" کے اصلاحی و مقصدی پہلو کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے جو کہ اتنا آسان نہیں ہے تو بھی فنی و فکری اور اسلوبی حوالے سے یہ ایک منفرد ادبی شاہکار ضرور قرار دیا جاتا ہے جسے لکھنے کے لیے مصنف کے گہرے مشاہدے کی داد ضرور دینا پڑتی ہے۔ معاشرے کے تضادات کو بے نقاب کرتا ہوا یہ افسانہ سماجی مساوات اور مذہبی رواداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ انور سدید "گڈریا" کے بارے میں لکھتے ہیں۔

غیر تبلیغی انداز میں حسن عمل کی تبلیغ کرتے اور نفی اور اثبات سے کردار کو مستحکم کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ گڈریا نقوش کے افسانہ نمبر میں شائع ہوتے ہی کلاسیکی درجہ حاصل کر چکا تھا۔^{۵۳}

ایسا معاشرہ جس میں نیک و بد کی تمیز ختم ہو چکی ہو اور شر و فساد پھیلانے والی طاقتوں کا غلبہ ہو چکا ہو۔ سماجی اقدار و روایات دم توڑتی نظر آرہی ہوں۔ ان حالات میں عوام الناس کے مجموعی رویے اور سماجی شعور کی عکاسی اتنی عمدگی سے کرنا کہ مفکرین، معاصرین اور قارئین کے ساتھ ساتھ نقاد بھی تعریف و توصیف پہ مجبور ہو جائیں، یہ اشفاق احمد کا کمال تھا۔ آغا ناصر اس افسانے کے بارے میں رائے دیتے ہیں۔

ادب کے نقاد کہتے ہیں کہ اشفاق احمد اگر کچھ بھی نہ لکھتے تو ان کا افسانہ گڈریا ان کو ادبی دنیا میں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔^{۵۴}

گڈریا کی کہانی ایک بچے کے ذریعے سامنے آتی ہے۔ وہ بچہ جب پانچویں جماعت میں تھا تو اپنے ہم جماعت امی چند کے ساتھ اس کے گھر گیا تو داؤجی سے ملاقات ہوئی۔ ذات کا کھتری داؤجی قصبے کی منصفی (عدالت/کچہری) میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے۔ یہ لڑکا جب ہائی سکول پہنچتا ہے تو کہانیاں پڑھنا و دیگر مشاغل کی وجہ سے پڑھائی پہ توجہ نہیں دے پاتا تو فیل ہو جاتا ہے۔ گھر سے والد ڈاکٹر صاحب سے پٹائی کے بعد داؤجی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہیں ان کے گھر رہنے لگتا ہے۔ داؤجی کا نام چنتو تھا جس کا کام بکریاں چرانا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں حضرت اسماعیل چشتی جو کہ گاؤں میں

بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، نے ان کو تعلیم دی۔ یہ اس دور میں منشی ہوئے اور اس بچے کو عربی، حساب، فارسی، انگریزی بہت محنت اور لگن سے پڑھانے لگے۔ دن رات، صبح شام، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت گولو کو پڑھاتے رہے۔ منشی چنت رام کی بیوی بے بے سخت مزاج جبکہ بیٹی قراۃ العین ایک عام گھریلو لڑکی تھی۔ قراۃ العین کی شادی پہ منشی چنت رام دکھی دل کے ساتھ بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا حالانکہ فارسی کی کتب کریم، بوستان، گلستان وغیرہ پڑھا چکے تھے۔ محلے کا ایک نوجوان رانو مویشی پال تھا۔ وہ منشی کو تنگ کرتا رہتا تھا مگر منشی جی کوئی رد عمل نہ دیا۔ ان ہی دنوں میں تقسیم برصغیر کا اعلان ہو جاتا ہے اور گلی گلی محلے محلے فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے محلے میں آباد داؤجی کی ہندو ہونے کے ناطے شامت آ جاتی ہے۔ داؤجی کے گھر بپھرا ہوا مشتعل ہجوم حملہ کر دیتا ہے۔ وہ توڑ پھوڑ کرتے آرہے تھے۔ ان میں ایک نوجوان رانو آگے بڑھ کر داؤجی کو کلمہ پڑھنے کو کہتا ہے۔ وہ ان کی چٹیا بے دردی سے کاٹ دیتا ہے۔ ہجوم داؤجی کو جان سے مار دینا چاہتا ہے مگر رانو کہتا ہے کہ اس پنڈت کو نہ مارو۔ یہ میری بکریاں چرایا کرے گا اور داؤجی دوبارہ گڈریا کاروپ دھار لیتا ہے۔ صبر و ایثار، انسان دوستی، مذہبی رواداری کو اشفاق احمد نے داؤجی کی شخصیت میں اس طرح سمویا ہے کہ پڑھتے ہوئے قاری ششدر رہ جاتا ہے۔ گڈریا افسانہ بھی ڈرامائی انداز میں شروع ہوتا ہے کیونکہ کسی بھی کہانی اور قصے کی دلچسپی اور عمدگی کے لیے تجسس اور جستجو انتہائی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ گڈریا کا کردار بذات خود تجسس کا سرچشمہ ہے۔ افسانے کے عنوان سے ہی دل و دماغ میں بہت سے سوالات گڈریا سے متعلق ابھرنے لگتے ہیں۔ گڈریا کے مرکزی کردار منشی چنت رام کو داؤجی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وقت اور افسانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ داؤجی کا کردار تہہ در تہہ کھلتا ہوا ہمارے سامنے آتا ہے اور تجسس کی نئی کروٹ لیتا ہے۔ داؤجی کا تعارف افسانہ نگاران الفاظ میں کرتا ہے جب یہ گولو مولو کو گلی میں ملتے ہیں۔ گولو مولو اپنے بھائی آفتاب کے ساتھ ملاں جی سے پارہ پڑھ کے واپس آتا تھا تو کبھی کبھی راستے میں اسے ایک مسحور کن شخصیت دکھائی دیتی۔ گولو داؤجی کا سراپا اور حلیہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید مونچھوں والا لمبا سا آدمی بھی ہوتا۔ جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی، ذرا سی خمیدہ کمر پر خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ، کھدر کا تنگ پانچامہ اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ۔^{۵۵}

داؤجی کا سراپا اور حلیہ جو ہمارے سامنے آتا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ بے وضع لنگوٹ، کرتا اور خاکی رنگ کا کوٹ پہنے وہ شخص فقیر منش انسان نظر آتا ہے۔ ایک بے شعور چرواہا جو جہالت کی زندگی گزار رہا تھا مگر اپنے گاؤں میں موجود ایک علمی شخصیت حضرت اسماعیل چشتی، جنہیں درس و تدریس کا بہت شوق تھا اور گاؤں کے بچوں کو فی سبیل اللہ پڑھاتے

تھے۔ گاؤں کے لوگ ان کے پاس بچوں کو بھیج دیتے تھے اور یہ اس دور میں کہ جب باقاعدہ سکول گاؤں میں نہیں کھلے تھے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے دور دراز کا سفر کرنا پڑتا تھا، حضرت اسماعیل چشتی لوگوں کے بچوں کو اردو، ریاضی، فارسی اور عربی کے ابتدائی اسباق پڑھا دیا کرتے تھے۔ جو بہت بڑے عالم تھے اور علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ چنتو نامی ہندو گڈریا ان کے پاس سے بکریاں چرانے کے لیے روز گذرتا اور یہ درخت کے نیچے لڑکوں کو پڑھا رہے ہوتے۔ ایک دن یہی چنتو نامی گڈریا درخت کے نیچے ان کی جماعت کے پاس کھڑا درس و تدریس کو دیکھ رہا ہوتا ہے تو یہ اس کو اپنے پاس بلا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بکریاں چرانے کے لیے چھوڑ کر میرے پاس آ جایا کر اور کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لے۔ حضرت اسماعیل چشتی اسے ماہ و سال کی محنت سے منشی چنت رام بنا دیتے ہیں۔ اس بات کا اعتراف داؤجی یوں کرتے ہیں۔ "میں نے بات کاٹ کر پوچھا" آپ بکریاں چرایا کرتے تھے داؤجی؟ "ہاں ہاں۔ فخر سے بولے۔ میں گڈریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں۔" ۵۱ بکریاں چرانا انبیائے کرام علیہم السلام کا پیشہ رہا ہے۔ بیشتر انبیاء کرام علیہم السلام نے بکریاں چرائی ہیں۔ گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس میں چھپی ہوئی مصلحت سامنے آتی ہے کہ معاشرے میں بکھرے ہوئے اور بگڑے ہوئے لوگوں کو کنٹرول کرنا، ان کو منظم کرنا اور انسانی رواداری کو انتہائی قریب سے سمجھنے کے لیے بھیڑ بکریاں چرانے کا کام انبیاء کرام علیہم السلام کو تفویض کیا گیا۔ مختلف قسم کے لوگوں کو ایک نہج پہ اکٹھا کرنا، ان کی تربیت کرنا اور ان سے مرضی کے کام لینے کی تربیت کرنا مقصود ہوتا تھا۔ یہ ایک تربیت تھی جو نبیوں کے لیے مخصوص کی گئی۔ اس افسانے میں بھی داؤجی کو اس عمل سے گذار گیا ہے۔ وہ پہلے ایک چرواہا اور بے نام گڈریا تھا جسے حضرت اسماعیل چشتی جیسی بے لوث، مخلص علمی ہستی مل جاتی ہے۔ جو اس کے اندر علم کی تڑپ اور لگن پیدا کر دیتی ہے۔ ایسی پیاس پیدا کر دیتی ہے جو علم حساب، اردو، فارسی، عربی، انگریزی، فلسفہ، جغرافیہ، جبر و مقابلہ اور علم ہندسہ جیسے علوم حاصل کرنے کے باوجود نہیں بجھتی ہے بلکہ اس کی طلب بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ جب داؤجی نے حضرت اسماعیل چشتی سے تمام مروجہ علوم پڑھ لیے۔ تو ایک ریاضی کے مسئلہ پر الجھن پیدا ہو گئی۔ حل نہ نکلا تو استاد سے رجوع کیا مگر متساوی الساقین کے اس مسئلہ پر استاد گرامی کو بھی الجھن پیدا ہو گئی تو حضرت اسماعیل چشتی نے فرمایا کہ اب استاد شاگرد کا علم برابر ہو چکا ہے اب کسی اور معلم سے رجوع کرنا چاہیے۔ حضرت اسماعیل چشتی نے دلی میں موجود اپنے نابینا استاد علم ہندسہ کے ماہر حکیم ناصر علی سیستانی کی خدمت میں جانے کا مشورہ دیا کہ رقعہ میں لکھ دوں گا مگر والدہ سے اجازت لے کر بتانا۔ داؤجی کو اجازت نہ ملی تو ایک رات والدہ کے پلو سے دو روپے چرا کر دلی روانہ ہوئے۔ سفر کا احوال داؤجی یوں بتاتے ہیں۔

ان دنوں جا کھل جیئند سرسہ حصار والی ریل کی پٹری بن رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دلی کو

جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دو دن چلتا۔ ۵۷

یہ تھی وہ علم کی تڑپ اور پیاس جو ایک صاحب نظر بے لوث استاد نے داؤجی میں پیدا کر دی جو اسے حصول علم کے لیے پیدل دلی تک لے جاتی ہے۔ راستے میں کٹھن مراحل اور وہاں پہنچ کر بھی حکیم جی کا پتہ نہ ملنے پر جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا وہ بھی داؤجی جیسے باہمت اور حوصلہ مند آدمی کا کام تھا۔ انگریزوں کی کوٹھیوں کے تعمیراتی کام میں مزدوری کرنا اور شام کو رات گئے تک دلی میں حکیم جی کو تلاش کرنا، رات کو دھرم شالہ میں کمبل اوڑھ کر سو جانا، ان تمام دشواریوں میں مراحل سے گزر کر جب بصارت سے محروم صاحب بصیرت حکیم ناصر علی سیتانی کو تلاش کر لیا تو انھوں نے ننگی پیٹھ کو بطور کتاب پیش کر دیا۔ داؤجی سوال، اعداد اور ہند سے لکھتے جاتے اور حکیم جی مسئلوں کا حل بتاتے جاتے۔ ایک سال دلی میں رہ کر حصول علم اور فیض پانے کے بعد واپسی ہوتی ہے تو حضرت اسماعیل چشتی فراق کی سختیوں کا ذکر کرتے ہیں کہ تمہارے دور چلے جانے سے اور بہت عرصہ بعد واپس آنے سے مجھے بہت تکلیف پہنچی۔ استاد کی محبت و شفقت کا بھی کیا انداز تھا جو ایک گڈ ریا کو ان کا بے دام غلام بنا دیتا ہے۔ ایسا غلام جو عقیدت کی حد تک ادب و احترام کی انتہائی حدوں کو چھو رہا ہے۔ کبھی بھی اپنے استاد کا نام نہ لیا بلکہ القاب و آداب سے ہی ذکر کیا کرتے۔ داؤجی عجز و انکسار کی انتہا کرتے ہوئے اپنے استاد گرامی اور ان کے احسانات کا تذکرہ کچھ یوں کرتے۔

میں ذات کا گڈ ریا، میرا باپ منڈا اسی کا گوالا، میں جہالت کا فرزند، میرا خاندان ابو جہل کا خانوادہ

اور آقا کی ایک نظر کرم، حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے چنتو کو منشی چنت رام بنا دیا۔ لوگ

کہتے ہیں منشی جی۔ میں کہتا ہوں رحمۃ اللہ علیہ کا کفش بردار۔^{۵۸}

داؤجی گہری عقیدت مندی کا مظاہرہ کیا کرتے۔ وہ اپنے معذور استاد کو جو چلنے پھرنے سے قاصر تھے۔ اپنے کندھوں پر اٹھا کر سارے گاؤں کا چکر لگواتے۔ کبھی حویلی سے باغ کی طرف۔ کبھی مسجد لے جانا۔ کبھی رہٹ پہ لے جانا۔ یہ سب کچھ داؤجی نے اپنے اوپر لازم کیا ہوا تھا۔ وہ اس سعادت مندی پر فخر کیا کرتے کہ استاد گرامی کی خدمت کا موقع مل رہا ہے۔ استاد گرامی بھی داؤجی کو انتہائی شفقت سے نوازتے۔ چونکہ حضرت ایک بے لوث استاد تھا۔ درس و تدریس ان کا پیشہ نہ تھا بلکہ ان کا شوق اور جنون تھا۔ وہ اپنے اس جذبے کی تسکین کے لیے اپنی حویلی میں مکتب چلایا کرتے تھے۔ اہل علاقہ کے بچوں کو مفت تعلیم اور تربیت کی سہولت فراہم کر رہے تھے۔ یہ تمام خصوصیات اپنے کردار و عمل سے وہ اپنے شاگردوں اور تلامذہ میں بھی دیکھنے کے خواہاں رہتے۔ ان کی تربیت کا اثر تھا کہ داؤجی سکول کی نوکری سے ریٹائرمنٹ کے بعد جہاں قصبے کی کچہری میں عرضی نویسی کا کام کیا کرتے وہیں پر اپنا فارغ وقت درس و تدریس کو دیتے۔ مگر غیر روایتی انداز میں۔ کوئی باقاعدہ مکتب یا جگہ مختص نہ تھی۔ بلکہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، آتے جاتے اگر کوئی بچہ یا طالب علم مل جاتا تو کوشش کرتے کہ کچھ نہ کچھ اسے سکھایا جائے۔ اسی لیے جب گولود سبوس کے امتحان میں فیل ہو جاتا ہے تو ڈاکٹر صاحب

اس کو داؤجی کے ہاں بھیج دیتے ہیں جو ان کے ہمسائے تھے۔ چونکہ نویں جماعت میں گولو کو جنوں، پریوں کی کہانیاں پڑھنے کا شوق لگ گیا تھا جو طلسم ہو شر با سے ہوتا ہوا صندلی نامہ، سند باد جہازی اور فسانہ عجائب پڑھنے تک آپہنچا۔ ساتھ ہی دسویں جماعت کا نتیجہ حسب توقع فیل ہونے کی صورت میں نکلا تو والد گرامی نے پٹائی کی اور داؤجی کے حوالے کر دیا۔ گولو کو ڈاکٹر صاحب نے کلینک طلب کیا۔ دیکھا تو وہاں داؤجی بھی بیٹھے تھے۔ داؤجی نے پہلے اس کے بھائی آفتاب کو بھی پڑھایا تھا اور فرسٹ ڈویژن دلوائی تھی۔ اب یہ بھی ان کے حوالے کر دیا گیا۔ داؤجی نے شام کو ساتھ سیر پہ چلنے کو کہا اور ساتھ لے جا کر بتایا کہ

آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اول نہ لاسکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوا دوں گا۔ میرے ہر ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا۔^{۵۹}

داؤجی کا کردار یہاں ایک ایسے استاد کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتا ہے جو کہ اعتماد اور یقین کی دولت سے سرشار ہے اور اسے خدا تعالیٰ کی ذات پر اپنی محنت و ریاضت کے صلے کا پورا پورا یقین ہے۔ استاد جب خود بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہو گا تو وہ اپنے تلامذہ میں یقین کا جذبہ نہیں پیدا کر سکے گا۔ استاد کے کردار کے طور پہ داؤجی کا پہلا بیان اور جملہ ان کی سمت کا تعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ وہ شمع جو حضرت نے داؤجی کے اندر جلائی تھی۔ اسی شمع سے داؤجی اب جہالت کی تاریکی دور کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس علم اور نور کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھنا چاہتے ہیں بلکہ صدق دل اور خلوص سے اس دولت کو لٹانے پہ آمادہ نظر آتے ہیں۔ آفتاب کے بھائی گولو کو انتہائی محنت اور لگن سے پڑھانا شروع کر دیا۔ تمام علوم کو ایک ہی شخص پڑھا رہا ہے۔ فلسفہ، حساب، کلام، صرف و نحو، جغرافیہ، انگریزی الغرض ہر مضمون میں مہارت کے ساتھ داؤجی اپنے شاگرد کو پڑھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر بات میں سے سوال نکالنا اور ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف نکل جانا اور ان دونوں کا آپس میں ربط اور تعلق تلاش کر کے مفہوم واضح کر دینا داؤجی کا خاصہ تھا۔ داؤجی اپنے شاگرد کو ہمیشہ جان پدر کہہ کر پکارتے جو کہ ننھے ذہن میں الجھن پیدا کرنے کا باعث تھا۔ وہ داؤجی سے پوچھتا ہے۔

آپ مجھے جان پدر کیوں کہتے ہیں۔ جانِ داؤ کیوں نہیں کہتے؟ شاہاش، وہ خوش ہو کر کہنے لگے۔ ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ بھاشا کا۔ ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بدن لکھتے یا بولتے ہیں۔ سخت غلطی کرتے ہیں۔

اور روز بروز کہو یا دن پردن۔^{۶۰}

داؤجی ایک بہترین استاد کی طرح مثالوں سے اپنے جواب کو مزین کر کے رکھتے ہیں تاکہ اس کا تصور واضح اور پختہ ہو جائے۔ نیز طلبہ کی طرف سے پیدا ہونے والے سوالات کی حوصلہ افزائی انھیں مزید تجسس اور سوالات پر ابھارتی ہے۔ یہ بھی داؤجی کا بہترین انداز تھا کہ گولو کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کی علمی تشریح کر کے اس کی تشفی کرتے نہ کہ سوالات کی حوصلہ شکنی کرتے۔ داؤجی کا ایک اور روپ شوہر اور والد کی حیثیت سے بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ داؤجی کی منشی گیری گھر سے باہر تک تھی۔ گھر میں ان کی کماؤ بیوی بے بے کاراج تھا جو کہ منہ پھٹ، جاہل اور گنوار عورت تھی۔ ہر وقت داؤجی کو کوسنے دیتی رہتی مگر داؤجی ہمیشہ ہنس کر اس کی باتوں کو ٹال جاتے تھے اور کبھی غصہ نہ ہوتے تھے۔ اپنے گھر بار کو بچانے اور سلامت رکھنے کے لیے شوہر کا کردار داؤجی نے خوب نبھایا ہے اور کردار و عمل سے ثابت کیا ہے کہ بد زبان لوگوں کی باتوں پرانہ منانا اور صبر کرنا کسے کہتے ہیں؟ داؤجی کو گرٹ کی چائے پسند تھی لیکن بے بے کو یہ فضول خرچی اور عیاشی سخت ناپسند تھی۔ وہ انھیں اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ایک دن جب بے بے گھر نہ تھی تو گولو گھر سے دودھ لایا اور داؤجی نے گھر پہ چائے بنانے کا پروگرام بنایا۔ داؤجی دکان سے گرٹ لے آئے اور بچوں کو کام پہ لگا کر خود چائے بنانے لگ گئے۔ چائے ابھی تیار نہ ہوئی تھی کہ بے بے خلاف توقع جلدی واپس آگئی۔ داؤجی کے چہرے سے رنگ اڑ گیا۔ داؤجی کی شامت آگئی۔ بچے تو اندر پڑھ رہے تھے۔ بے بے نے غصے میں چائے داؤجی پہ گرا دی۔

کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولہے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپکے داؤجی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر پڑے اور وہ "اوہ تیرا بھلا ہو جائے! اوہ تیرا بھلا ہو جائے! کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بیٹھک میں گھس گئے۔"

اس المیے اور حادثے پر بھی جو داؤجی پہ بنتی۔ انھوں نے سخت رد عمل نہیں دیا بلکہ بیٹھک میں جا چھپے۔ یہ بھی نرم مزاجی اور صبر و ضبط کی اعلیٰ مثال ہے۔ ورنہ اس سماج میں جہاں عورتوں کو کوئی حقوق حاصل نہ ہوں، ذہنی و جسمانی تشدد کی مثالیں عام ہوں، سسرالی معاشرے میں عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہو، اس اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنا داؤجی کا خاصہ تھا۔ جب گولو انھیں اس حالت میں دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے تو داؤجی اُسے نبی کریم ﷺ پر کوڑا پھینکنے والی بڑھیا کے گھناؤنے عمل پہ صبر کی مثال دیتا ہے کہ ہمیں ان عظیم ہستیوں کا طرز عمل سامنے رکھنا چاہیے کہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کر کے رہتی دنیا تک مثال قائم کر گئے ہیں۔ ایک باپ کی حیثیت سے داؤجی قراۃ العین کو مروجہ علوم گھر پر ہی پڑھاتے ہیں کیونکہ عورتوں کے مدارس اور تعلیمی ادارے ابھی قائم نہ ہوئے تھے۔ قراۃ العین کو انھوں نے فارسی کے ابتدائی قاعدے اور کتب کریم، گلستان و بوستان پڑھادی تھیں۔ انھوں نے قراۃ العین کی شادی ایسے گھرانے میں طے کی جس کی پہچان تعلیم و

تدریس تھی۔ داؤجی کے سمدھی فارسی کے استاد اور ہم مذہب تھے۔ داؤجی قراۃ العین کو اس کی رخصتی کے موقع پر ان الفاظ کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔

بی بی اسی طرح دھاڑیں مارتے ہوئے داؤجی سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ قراۃ العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھانہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جینہ نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاہد بر خوردار رام پر تاب بھی لیکن میں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں گا۔^{۳۲}

حالانکہ بی بی کڑھائی سلائی و امور خانہ داری میں مہارت رکھتی تھی اور تربیت یافتہ لڑکی تھی مگر داؤجی کے الفاظ جہاں علم و ادب کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں اور ایک باپ کے ارمانوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہیں پر داؤجی تعلیم نسواں کے علمبردار کی حیثیت سے بھی قارئین سے متعارف ہوتے ہیں کہ وہ اس دور میں بھی عورتوں کی تعلیم کے نہ صرف حق میں تھے بلکہ اپنے حصے کا کم یا زیادہ کردار بھی ادا رہے تھے۔ ان حالات میں داؤجی کے سمدھی ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ آپ نے گلستان تو ختم کرادی، میں تو خود ختم نہ کر سکا۔ مکمل نہ پڑھ سکا کیونکہ جہاں عربی آتی تھی وہاں چھوڑ کر آگے نکل جاتا تھا۔ ایک والد کی حیثیت سے بھی داؤجی نے کردار کو بہت خوبی سے نبھایا ہے۔ اسی دوران فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔ مہاجرین کی آمد و رفت شروع ہو جاتے ہیں۔ داؤجی کے ساتھ کیا گیا سلوک آخر میں افسانے کو نہایت دردناک اور المناک اختتام دیتا ہے۔ جو لٹے پٹے مہاجرین پاکستان پہنچے۔ وہ غم و غصہ کی حالت میں تھے اور خود پریتی ہوئی ظلم کی داستانیں سننا کر یہاں کے نوجوانوں کے ساتھ مل کر ہندوؤں و دیگر غیر مذہب لوگوں سے بدلہ لینا شروع کر دیا۔ ان نوجوانوں میں محلے کا بدنام کردار رانو بھی شامل تھا۔ رانو کو خدا واسطے کا داؤجی سے بیر تھا۔ جب خونخوار مجھے نے داؤجی کے گھر پہ ہلہ بول دیا تو داؤجی کو رانو کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا گیا کہ وہ جو چاہے سلوک کرے۔ وہ لوگوں کو قتل کرتے آئے تھے مگر رانو نے اس موقع پر کچھ اور فیصلہ کیا۔

رانو نے کہا۔ جانے دو بڑھا ہے میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا۔ پھر اس نے داؤجی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ کلمہ پڑھ پنڈتا اور داؤجی آہستہ سے بولے۔ کون سا۔۔؟ رانو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں۔! جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا، چل بکریاں تیرا انتظار کرتی ہیں۔^{۳۳}

یہ دردناک انجام معاشرے کے اس کمزور پہلو کو عیاں کرتا ہے کہ وہ شخص جو معاشرے میں بچوں کو سدھارنے اور حیوان سے انسان بنانے کا کام ساری زندگی کرتا رہا ہو، یہ وحشیانہ سلوک معاشرے میں درندہ صفت لوگوں کی فطرت کو ظاہر کرتا ہے کہ مسیحا کے روپ میں ساری زندگی گزارنے والے شخص کو مذہبی منافرت، سیاسی مصلحت اور سماجی تعصب کی آگ

جلاڈالتی ہے۔ ساری زندگی محبتیں تقسیم کرنے اور پھیلانے والا شخص خود نفرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ چرواہے کو دوبارہ بکریاں چرانے کے لیے منتخب کر لیا جاتا ہے۔ اس کردار کے حوالے سے خالد مسعود خان اپنے مضمون گڈریا کا داؤجی میں لکھتے ہیں۔

گڈریا کے داؤجی کی طرح، جب تک اردو ادب میں کہانی زندہ رہے گی۔ گڈریا اپنے کردار داؤجی سمیت زندہ رہے گا اور جس شخص کا لکھا ہو کردار زندہ رہے۔ بھلا وہ خود کیسے مر سکتا ہے۔^{۶۳}

اگر دیکھا جائے تو گڈریا کا داؤجی ایسا کردار ہے جو نہ صرف قارئین کو بہت متاثر کرتا ہے بلکہ نقادوں اور تخلیق کاروں سے بھی داد وصول کر کے امر ہو جاتا ہے۔ داؤجی کا کردار نہایت مہارت سے تراشا گیا ہے اور ایک مثالی باپ، استاد، شاگرد، شوہر کے طور پر افسانے میں چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ الغرض اخلاقی، معاشرتی و تہذیبی اقدار کا نچوڑ داؤجی کی شخصیت میں سمو کر قارئین کے سامنے رکھ دیا گیا ہے جو کہ انمٹ نقوش اور اثرات چھوڑ جاتا ہے۔

ٹی ٹی (گل ٹریا)

افسانہ "گل ٹریا" میں کہانی ایک ننھے بچے اور اس کے کتے گل ٹریا کے گرد گھومتی ہے۔ یہ معصوم بچہ جسے کتار کھنے کا شوق اپنے چچا امان سے کہانیاں سن سن کر ہو جاتا ہے۔ چچا امان اس کے لیے کوہاٹ سے بذریعہ ریل کتا بھیج دیتے ہیں۔ یہ دونوں بھائی اس کو شام گھمانے لے جاتے۔ دوسرے تیسرے روز کتا بڑے بھیا سے شام کو گھماتے ہوئے کھو جاتا ہے۔ اس کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں بھائی دن کو سکول آتے جاتے ہر جگہ دیکھتے جاتے۔ سکول پہنچ کے بستہ رکھ کے نکل جاتے اور آس پاس کے تمام گاؤں چھان ڈالے۔ ایک گاؤں میں ایک نوجوان انھیں ملتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے پاس کالا ڈبو ہے وہ لے جاؤ۔ ان کو اس پہ شک پڑ جاتا ہے۔ یہ گاؤں کے نمبردار سے ملتے ہیں۔ نمبردار کہتا ہے کہ یہ گاؤں کوئی چوروں کا ہے جو آپ الزام لگاتے ہو؟ اگر شک ہے تو تھانے رپورٹ لکھواؤ۔ یہ مایوس لوٹتے ہیں۔ تلاش بسیار کے باوجود کتا نہیں ملتا۔ ایک دن محلے میں بارات آتی ہے۔ یہ اور بھیا چپکے چپکے دلہن کو دیکھتے ہیں جو اس کے بھیا کی محبوبہ تھی مگر اب کسی اور کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی۔ اس کو دولہا بھی کالا ڈبو لگتا ہے جو اس کے بھیا کی محبوبہ گل ٹریا کو لے جاتا ہے۔ اشفاق احمد اس افسانے کے ذریعے سبق دینا چاہتے ہیں کہ گل ٹریا کتا جو کھو گیا تھا۔ وہ ضرور کسی دباؤ یا لالچ میں بہک کے کسی کے ہاتھ لگ گیا تھا اور اصلی مالک کی جانب واپس پلٹ کر نہیں آتا۔ بھیا کی محبوبہ بہک کر کسی کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو جاتی ہے تو اشرف المخلوقات ایک وفادار پالتو شے کی طرح بہک جاتا ہے۔ اشفاق احمد اسے المیہ قرار دیتے ہیں۔ سماجی حیوان تمام حیوانوں سے بالاتر ہے تو پھر جانور وفاداری کے استعارہ کے طور پر اس سے آگے یا اس جیسا کیوں ہے؟ معاشرے میں آج کل جتنی بھی برائیاں نظر آرہی ہیں۔ وہ ایک دن میں پیدا نہیں ہوئیں بلکہ آہستہ آہستہ اپنی جڑیں مضبوط کرتی ہیں۔

انسان کے اندر لالچ، ہوس بھی ایک ایسا جذبہ اور برائی ہے جس کے اثرات معاشرے پر بہت زیادہ مرتب ہوتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی کہانی انسانی ہوس اور لالچ کی ہے جسے اشفاق احمد نے کتے کی وفاداری کی مثال کے ذریعے واضح کیا ہے۔ افسانے میں گل ٹریا کتے کو ہی مرکزیت حاصل ہے۔ افسانے کا آغاز معصوم بچے کو بھیا کے جگانے سے ہوتا ہے۔ وہ اسے گل ٹریا کتے کی آمد کی خوش خبری سناتے ہیں۔ وہ سحری کے وقت ہی کتے کو دیکھنے کی ضد کرنے لگتا ہے۔ اس سے صبح کا انتظار نہیں ہو پاتا۔ بھیا اس کو کتا دکھانے اندھیرے میں ہی بھوسے والی کو ٹھٹھی میں لے جاتے ہیں جہاں کتا تھا۔

بھیانے لالٹین اٹھا کے ہولے سے سیٹی بجائی اور دروازے کی اوٹ سے سفید رنگ کا ایک موٹا سا تازہ کتا برآمد ہوا۔ اس کی آنکھیں کنچوں کی طرح چمک رہی تھیں اور اس کے کان اٹھاسی کا ہندسہ بنے کھڑے تھے۔ اس نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور دم ہلانے لگا۔^{۶۵}

کتے کا نام ٹی ٹی تھا جسے بہت شوق سے کوہاٹ سے چچا کی منٹیں کر کے منگوایا گیا تھا۔ اب اس کی خاطر مدارت شروع ہو گئی۔ معصوم بچہ اپنے بھیا سے کتے کے بارے میں منصوبے بناتا ہے کہ کس طرح ہم اس کو شام کے وقت بیلے میں گھمانے لے جایا کریں گے۔ وہ وہاں سے ہمارے لیے خرگوش پکڑ کر لایا کرے گا۔ اسی طرح کی دیگر منصوبہ بندی بھی۔ یہاں اشفاق احمد ننھے بچوں کے معصوم ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ کس طرح تجسس کی بنا پر وہ اپنے بڑے بھیا سے ضد کرتا ہے اور صبح ہونے کا انتظار نہیں کر پاتا بلکہ سحری کے وقت ہی کتا دیکھنے چلا جاتا ہے۔ معصوم بچے کا کتے کے ساتھ لگاؤ دیدنی تھا۔ وہ شام کو اسے گھمانے پھرانے لے جاتے ہیں۔ زنجیر کھول کر کتے کو آزاد کر دیتے ہیں۔ سیٹی بجانے پر وہ واپس آ جاتا ہے۔ کبھی وہ اس کا نام پکارتے ہیں تو وہ ان کی ٹانگوں سے آکر لپٹ جاتا ہے۔ اسی دوران ننھے ذہن میں خیال آتا ہے کہ یہ کہیں بھاگ نہ جائے اور بھاگ کر واپس نہ ہی آیا تو؟ یہ اس خدشے کا اظہار جب بھیا سے کرتا ہے تو وہ کیا کہتے ہیں۔

میں نے خوفزدہ ہو کر کہا بھیا اگر یہ ہم کو چھوڑ کر بھاگ گیا تو؟ بھیا مسکرائے اور زمین پر زنجیر کی کنڈلی بٹھاتے ہوئے بولے، کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ اپنے مالک کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ نہیں جاتا اور اگر

کوئی زبردستی لے جانا چاہے تو اس کو پھاڑ کھاتا ہے۔^{۶۶}

بچے کے معصومانہ سوال کے جواب میں کتے کے بارے میں کہلوائے گئے الفاظ اس افسانے کا مرکزی خیال ہیں کہ کتے کی وفاداری کو بیان کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ آگے چل کر افسانہ نگار محبت کی ناکامی اور ایک انسان کی بے وفائی کو آپس میں جوڑنا چاہتے ہیں۔ یہاں بھیا بتاتے ہیں کہ کتا اپنے مالک کا وفادار رہتا ہے۔ جس گھریا شخص کے ساتھ اس کی وابستگی ہو جاتی ہے تو وہ اس کو کبھی چھوڑ کر نہیں جاتا۔ اسی کا ہو کر رہتا ہے۔ یہ علامتی کردار وفاداری کے وصف کو نمایاں کرتا ہے۔ اسی طرح

افسانہ نگار اس کردار کے ذریعے انسانی ہوس، لالچ، بے وفائی پر عمدہ طنز کیا ہے کہ انسان موقع ملنے پر خود غرض ہو جاتا ہے اور اپنے سے وابستہ لوگوں کو بھول جاتا ہے یا ان کو گہرے زخم دے جاتا ہے۔ جنہیں مندمل ہونے میں بہت ساعرصہ لگ جاتا ہے۔ جہاں ہمیں ٹی ٹی سے ہمدردی ہو جاتی ہے وہیں اس افسانے میں موجود ایک بے وفا کردار کے طرز و روش پر شدید غصہ بھی آتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے نہایت خوبصورت و دلکش انداز میں دونوں مخلوقات کا تقابل کیا ہے۔ اگلے دن شام کو بھیا کیلے کتے کو گھمانے لے گئے۔ یہ دوکان پہ گیا ہوا تھا۔ بھیا سے کتا گم ہو گیا اور وہ بھاگے بھاگے اس کو بتانے آئے۔

بھیا ٹی ٹی کی زنجیر ہاتھ میں لٹکائے دوکان پر آگئے۔ اس کے بال دھول میں اٹے ہوئے

تھے اور چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انھوں نے میری کلائی پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

ٹی ٹی بھاگ گیا۔ میں نے نیلے میں جا کر زنجیر کھولی تو وہ ہوا ہو گیا۔^{۶۷}

کتے کی گمشدگی افسانے میں ایک نیا موڑ لے آتی ہے۔ کتے کی تلاش کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ دونوں بھائی ڈھونڈنے نکل جاتے ہیں، سیٹیاں بجاتے ہیں، ٹی ٹی کا نام لے کر پکارتے ہیں، ہر راہ گیر سے پوچھتے پھرتے ہیں مگر تھک ہار کر واپس آ جاتے ہیں۔ سکول جاتے ہیں تو بستہ دوستوں کے حوالے کر کے خود چوری چھپے ایک ایک گاؤں روزانہ جاتے۔ ہر دروازے میں جھانک کر دیکھتے کہ کسی طرح کتا مل جائے۔ ایک گاؤں میں نمبردار سے بھی ملے مگر ٹی ٹی نہ ملا۔ کتے کے ملنے میں ناکامی کو افسانہ نگار نے انسانی محبت میں ناکامی کے ساتھ ملایا ہے۔ چونکہ اشفاق احمد کا من پسند موضوع محبت ہی ہے اور وہ محبت کا مفہوم وسیع تر معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی کتے کے ساتھ ایک بچے کی محبت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ محبت کی خوشی اور دکھ درد کی تصویر کشی کی ہے۔

سرور (تتکہ)

افسانہ "تتکہ" صوبیدار ریتے خان کے بیٹے سرور اور پیر زادہ صاحب کی بھتیجی عطیہ بانو پیرزادی کے ناکام عشق کی کہانی ہے جس کا طبقاتی تفریق کی وجہ سے دردناک انجام قاری کو دکھی اور افسردہ کر دیتا ہے۔ رومانوی کردار سرور بی اے کر کے فارغ ہوا تھا کہ پیر زادہ صاحب نے بلایا اور کہا کہ کالج میں پڑھتی عطیہ بانو پیرزادی کو گرمیوں کی چھٹیوں میں کچھ پڑھادیا کرے۔ پڑھائی شروع ہوئی جو کہ بڑھتے بڑھتے محبت میں تبدیل ہو گئی۔ چھٹیوں کے بعد عطیہ کالج چلی جاتی ہے۔ یہ بیرون ملک جانے کا ارادہ ترک کر کے اس کے عشق و محبت میں ڈوبا رہتا ہے۔ کالج اُسے ملنے جاتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کے والد صاحب نے اس کی منگنی ایک امیر لڑکے عزیز الدین سے کر دی ہے لیکن وہ ابھی ایک دو سال شادی نہیں کرے گی۔ سرور اپنی محبت کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ میرے والد نے عزیز الدین کی پاس بک دیکھی تھی جس کے مطابق اس کے پاس انیس ہزار بیلنس موجود ہے۔ تم بھی کوئی نوکری کر دو دولت دھن اکٹھا کرو اور گاڑی میں بیٹھ کر گاؤں آؤ تاکہ

والد صاحب سے میں تمہارے لیے بات کر سکوں۔ یہ غریب آدمی ڈاک خانے میں نوکری کر لیتا ہے جہاں تنخواہ بمشکل بیس تیس روپے تھی۔ اور ٹائم لگاتا ایک ٹکے خرچانہ کرتا۔ ہر وقت پیسے کو گنتا رہتا، کوئی چھٹی نہ کرتا مگر دو تین سال میں پانچ سو روپے بھی جمع نہ کر سکا اور دفتر میں کنجوس مشہور ہو گیا۔ ایک رات کو ریلوے سٹیشن پہ گاڑی کا انتظار کر رہا تھا کہ پان کھانے کو جی چاہا۔ کئی دنوں سے محفوظ ایک روپیہ پان فروش کو دیا۔ جس نے بقایا واپس کیا تو ایک اٹھنی ریل کی پٹری پہ گر جاتی ہے جسے اٹھانے یہ پٹری پہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اوپر سے ریل گزر جاتی ہے مگر اسے لوگوں کی چیخیں، شور شرابہ نہیں سنائی دیتا کیونکہ اٹھنی کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ ریل گزرنے کے ساتھ ہی یہ بھی زندگی سے گزر جاتا ہے۔ دردناک انجام پہ مشتمل یہ افسانہ محبت پانے کے لیے قربانی اور جان سے گزر جانے کے واقعہ کو بیان کرتا ہے۔ سرور گاؤں میں پہلا پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ جو صرف اس وجہ سے پڑھ لکھ گیا تھا کیونکہ اس کا والد صوبیدار تھا۔ گاؤں کے وڈیرے پیر زادہ صاحب کی بھتیجی لاہور کالج سے گرمیوں کی چھٹیوں میں آئی تو انھیں فکر لاحق ہوئی کہ اس کی پڑھائی کا حرج نہ ہو تو اسے ایک نوجوان سرور کے ذمہ کر دیا جو اسے پڑھانے آتا۔ چوبارے کی تیسری منزل پہ دونوں کے درمیان پردہ لٹکا ہوا تھا مگر وقت کے ساتھ پردہ سرکتا گیا اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے عہد و پیمان باندھنے لگے۔

سرور کو طبقاتی فرق کا اچھی طرح پتہ تھا اور وہ اس کا ذکر عطیہ بانو سے کرتا رہتا تھا۔ جیسا کہ اس مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے۔

سرور عطیہ کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو ایک ہاتھ میں اور دو کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر کہتا "میں بھی تمہارے ایسا امیر ہوتا تو کتنی اچھی بات تھی" اور عطیہ اپنا ہاتھ چھڑا کر پوچھتی "بس یہی سوچ رہے تھے" ہاں۔ تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے ایسی باتیں نہ سوچا کرو۔^{۸۸}

عطیہ بانو اسے حوصلہ اور دلاسا دیتی ہے کہ طبقاتی فرق، غریبی امیری خدا کے ہاتھ ہے اور وہ بندوں کے ساتھ رحم والا معاملہ کرتا ہے۔ اسے بھی اللہ کی ذات پہ بھروسہ رکھنا چاہیے کہ وہ بہتری کے اسباب پیدا کر دے گا۔ سرور کا کردار معاشرے کا وہ کردار ہے جو معاشرتی اونچ نیچ اور طبقاتی نظام کی تلخ سچائی کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ انسانی خواہشات کو پسپا کر کے عظیم مقصد میں کامیابی اور ہدف حاصل کرنے کی امید جگاتا ہے۔ سرور کا کردار اس بات کا آئینہ دار ہے کہ کسی بھی انسان کے ذہنی و قلبی سکون اور خوشی و مسرت کا دار و مدار اس کی معاشی حالت پر ہے۔ اگر معاشی حالات اچھے ہیں تو دنیاوی آسائشات اور خواہشات پوری ہو سکتی ہیں لیکن اگر غربت و مفلسی ہے تو محرومی اور نامرادی انسان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ یہاں پر بھی عطیہ بانو سرور کو روپے پیسے، دھن دولت کی اہمیت بتاتی ہے کہ تم کچھ کام کاج کرو، نوکری وغیرہ کر کے پیسہ اکٹھا کرو تب ہی کام ہو سکے گا۔ وہ کہتی ہے۔

جب تک تمہارے پاس کافی پیسے جمع ہو جائیں گے۔ تم ایک ایک پائی جمع کرتے رہنا اور دو

سال بعد اپنی کار میں آنا۔ اس وقت تو باجی انکار نہ کر سکیں گے۔^{۱۹}

سرور اس جھانسنے میں آجاتا ہے اور طبقاتی فرق اور امیری غریبی کی وسیع خلیج کو پاٹنے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ڈاک خانے میں ملازمت کر لیتا ہے۔ روپیہ پیسہ جمع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ اپنا محبوب مشغلہ شکار بھی چھوڑ دیتا ہے اور بندوق کو فروخت کر دیتا ہے تاکہ کچھ رقم بینک میں جمع ہو سکے۔ سیونگ بینک میں رقم جمع ہونے کی رفتار بہت سست تھی۔ یہ اوور ٹائم لگانے کے لیے رات گئے تک تار کے انتظار میں کرسی پہ بیٹھا رہتا۔ خوراک کی کمی، مسلسل محنت، تھکاوٹ، فاقہ کشی وغیرہ سے اس کی صحت گرنے لگتی ہے اور وہ بیمار رہنے لگتا ہے۔ مگر اپنے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے ثابت قدمی اور مستعدی سے لگا ہوا ہے۔ وہ اپنے دفتر میں کنجوس کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے۔ اس کے ماتحت اس کو دل سے برا جانتے ہیں کہ ایسا کنجوس اور بخیل شخص ہے جو صرف مال اور دولت جمع کرنے کے لیے ملازمت کر رہا ہے۔ کچھ بھی اپنے اوپر یادوستوں کے اوپر خرچ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا ہے۔ ایک رات وہ ریلوے سٹیشن اپنے ماتحت کے ساتھ ڈاک کا تھیلہ جمع کرانے جاتا ہے تو دو پیسے کا پان کھانے کو آرڈر دیتا ہے۔ پان فروش اس کو روپے میں سے بقایا واپس کر رہا ہوتا ہے کہ اسی اثنا میں ریل گاڑی آ جاتی ہے۔ وہ دونوں آئی ہوئی گاڑی کو دیکھنے میں محو ہوتے ہیں کہ بقایا میں سے ایک اٹھنی گر کے ریل کی پٹری پہ چلی جاتی ہے۔ وہ اُسے اٹھانے کو لپکا مگر ریل نے مہلت نہ دی۔ آخری منظر کچھ یوں تھا۔

گاڑی بڑھتی چلی آرہی تھی۔ اٹھنی پتھروں میں جا چھپی تھی۔ لوگ پلیٹ فارم پر شور مچا رہے تھے۔ انجن فلک شکاف و سل دے رہا تھا اور سرور پتھروں کو بڑی تیزی سے ہٹائے جا رہا تھا۔ ایک دم و کیوم لگ جانے سے گاڑی کے پہیوں سے بڑی خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ گاڑی روکے سے رک نہیں رہی تھی۔ ساری دھرتی کانپنے لگی۔ سرور پسینے میں نہا گیا۔ انجن کا بخار اسے اپنی پلیٹ میں لے رہا تھا۔^{۲۰}

سرور منافقت اور مادیت پر مبنی معاشرے کی ہوس کا شکار ہو چکا تھا۔ سرور جس طبقے کی نمائندگی کر رہا ہے اور جس طبقے کی باتوں میں آکر زندگی کا ہدف طے کر کے اس کی جانب ایک مشکل اور کٹھن راستے کا انتخاب کیا ہے۔ وہ اس افسانے کا قابل افسوس عمل بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اور تدریس کے وقت جب وہ عطیہ بانو سے تعلقات کو بڑھا رہا ہوتا ہے تو اس حقیقت سے آگاہ ضرور ہوتا ہے اور حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا اور سوچتا رہتا ہے۔ لیکن معاشرے کے لگے بندھے اصول ضوابط اور سماجی رکاوٹیں حائل ہونے کی بنا پر منزل تک پہنچنے میں ناکام رہتا ہے۔ اور اپنی جاں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ سرور معاشرتی اونچ نیچ کو ذہنوں کا فرق سمجھ رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ مضبوط دیوار اور

فصیل کی مانند ہے جس سے ٹکرانے والا اپنی جان سے بھی جاتا ہے۔ افسانے کا درد بھر انجام قارئین کی ہمدردیاں سرور کے ساتھ کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

صفدر ٹھیلا (صفدر ٹھیلا)

صفدر ٹھیلا نامی نوجوان طالب علم اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ یہ ایک باغی کردار ہے جو اپنے دوستوں حبیب ٹینی، پھپھی پریتم، برکت مہاشا، انور طوطا اور مدن بگھی کے ساتھ ہائی سکول میں زیر تعلیم ہے۔ مدرسے کے ہیڈ ماسٹر پنڈت امر ناتھ سمیت اساتذہ و طلبہ صفدر ٹھیلا سے ڈرتے تھے۔ یہ میٹرک میں تین مرتبہ فیل ہو چکا تھا۔ قد کاٹھ اور جسامت میں بڑا ہونے کی بنا پر لڑائی جھگڑا، شرارتوں، کھیلوں اور دیگر ممنوعہ سرگرمیوں میں حصہ لیتا تھا اور کوئی اسے ہاتھ نہ ڈالتا تھا۔ سکول میں عربی و فارسی کے استاد مولوی ابوالحسن سے یہ ڈرتا تھا اور وہ اسے سزا دے دیتے تھے یا جب ساری پارٹی کسی شرارت کی پیشی بھگتے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس دفتر جاتی تو مولوی صاحب صفدر ٹھیلا کو بھی پنڈت صاحب سے معافی مانگنے کا کہتے اور مسئلہ حل ہو جاتا۔ ایک دفعہ سکول کے چپڑا سی دیوان چند کو جبکہ وہ سرکاری ڈاک لے کے ڈاک خانے جا رہا تھا۔ اپنا ایک خط پوسٹ کرنے کا کہا، جب وہ نہ مانا تو خوب پٹائی کی۔ مدن بگھی، مولوی و دیگر دوستوں نے اس بے چارے کو چھڑوایا۔ وہ پھٹے کپڑوں اور خون آلود چہرے کے ساتھ دفتر گیا اور شکایت کی۔ پنڈت صاحب ہیڈ ماسٹر نے کیس مولوی صاحب کی طرف بھیج دیا۔ جنھوں نے میدان میں شہوت کی چھڑی سے صفدر ٹھیلا کو پہلے تو خوب مارا، پھر ناک سے لکیریں نکلوانے کے بعد دفتر لے جا کر ہیڈ ماسٹر صاحب سے معافی مانگنے کو کہا۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ایک دن پھپھی پریتم کو جب ہیڈ ماسٹر صاحب ممنوعہ گراس پلاٹ سے پھول توڑنے پر سزا دے رہے تھے تو صفدر ٹھیلا نے ان کا بید پکڑ لیا اور پھپھی پریتم کو سکول سے لے کر باہر چلا گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے دفتر چلے گئے۔ اب صفدر ٹھیلا ان کو دیکھ کر لڑکوں سے کہتا تھا کہ ان کی موت میرے ہاتھوں ہوگی۔ ایک دن شام کو منصوبہ بندی کر کے پنڈت جی سے بدلہ لینے کھجوروں کے جھنڈ کے پاس پہنچے۔ جہاں سے پنڈت جی بگھی پر سوار شام کو سیر پہ نکلتے۔ یہ تمام دوست واپسی پہ انتظار کر رہے تھے۔ گھوڑی بدحواس ہو کر بے قابو ہو گئی۔ صفدر ٹھیلا اس کو روکنے سڑک پہ آگیا کہ روک کر پنڈت جی سے بدلہ لیا جائے مگر تیز رفتار بے قابو گھوڑی بگھی سمیت صفدر ٹھیلا سے ٹکرائی اور اس کی موت واقع ہو گئی۔ یہ افسانہ نوجوان طالب علموں کی شرارتوں کے مختلف واقعات پر مبنی ہے۔ نوجوان لڑکے کس طرح کی حرکتیں کر کے اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہی اس افسانے کا مرکزی موضوع ہے۔ صفدر ٹھیلا کا معمول اور دہشت اس اقتباس سے واضح ہوتی ہے۔

سارا سکول اس سے خوف کھاتا تھا۔ لڑکے باری باری تفریح کے گھنٹے میں اس کے گھر سے کھانا لاتے، اس کے لیے مسواکیں بنا کر لاتے اور چھٹی کے وقت جب وہ سیدھا اکھاڑے جاتا تو لڑکے ہی اس کا بستہ چھوڑنے گھر جاتے۔^{۴۱}

معاشرے کا منفی کردار صفدر ٹھیلا سکول میں غنڈہ گردی کے لیے مشہور ہے۔ تمام اساتذہ بشمول ہیڈ ماسٹر اس سے شرافت اور عزت بچانے کے لیے دب کر رہتے ہیں۔ اپنے دوستوں کے لیے سردھڑکی بازی لگانے کے لیے ہر وقت تیار نظر آتا ہے۔ معاشرے میں پائے جانے والے کند ذہن بچوں اور طالب علموں کو اس کردار کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ ذہنی کمزوری اور نفسیاتی الجھنوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ سماجی و اخلاقی قدروں سے گریز کرتا یہ کردار شرکی قوتوں کا مظہر اور منفی طاقتوں کا نمائندہ ہے۔ ایک دفعہ جب ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس کے دوست پھپھی پر یتیم کو ممنوعہ گراس پلاٹ سے پھول توڑنے پہ سزا دی تو یہ سخت طیش میں آگیا۔ وہ ہر وقت بدلہ لینے کا سوچنے لگتا ہے۔ وہ اس معاملے میں بہت جذباتی ہو جاتا ہے اور جب بھی ہیڈ ماسٹر صاحب کو دیکھتا تو غم و غصہ سے لال پیلا ہو جاتا۔

صفدر ٹھیلا نل پر بیٹھا دانت صاف کر رہا ہوتا اور پنڈت جی ادھر آنکلتے تو وہ کسی نہ کسی کو مخاطب کر کے کہتا "اس کی موت میرے ہاتھوں آئے گی۔ پھانسی لگ جاؤں گا پر اس کا خون کر کے رہوں گا۔ بھلا اس نے پھپھی کو کیا سمجھ کے مارا۔"^{۴۲}

پنڈت جی اس طرح کے فقرے سن سن کر بہت محتاط ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے یہ صورت حال مولوی ابوالحسن کو بتائی تو انھوں نے سخت غصے میں صفدر ٹھیلا کو طلب کیا۔ منہ پر طمانچہ مارے مگر یہ قسمیں کھاتا تھا کہ اس نے اس قسم کا کچھ بھی نہیں سوچا۔ لیکن درپردہ وہ پنڈت جی کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے ایک شام تمام دوستوں کو اکٹھا کیا اور گاؤں سے دو میل دور کھجوروں کے جھنڈ کے پاس پنڈت جی کی بگھی کا انتظار کرنے لگے۔ ہر دوست کو اس کی صلاحیت اور مہارت کے مطابق کام سونپا گیا۔ ٹھیلے نے خود بجلی کی تار اٹھائی ہوئی تھی۔ ایک دوست کے ہاتھ میں شہتوت کی چھڑی، ایک کو ہاکی، ایک کے ہاتھ میں لوہے کا پائپ تھا۔ طے یہ پایا کہ صفدر ٹھیلا خود آگے بڑھ کر گھوڑی کو روکے گا۔ ایک دوست گھوڑی کی ٹانگوں پر ہاکی کے وار کرے گا۔ پھر باقی تمام لوگ جو چھپے ہوئے ہوں گے۔ وہ باہر نکل کر پنڈت جی پہ ٹوٹ پڑیں گے اور پھپھی پر یتیم کا بدلہ لیا جائے گا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جب پنڈت جی شام کو فیملی کے ہمراہ سیر سے واپس آ رہے تھے کہ گھوڑی بے قابو ہو گئی۔ وہ تیز تیز دوڑنے لگی۔ بگھی پر سوار خواتین کے چیخنے چلانے سے گھوڑی مزید بدحواس ہو گئی اور سرپٹ بھاگنے لگی۔ جو نہی وہ قریب پہنچی تو صفدر ٹھیلا اسے روکنے آگے بڑھا مگر وہ اسے روندتی ہوئی ذرا آگے جا رکی۔ صفدر ٹھیلے کا خون سڑک پہ بہنے لگا۔ یہ خونی منظر کچھ یوں تھا۔

ٹھیلا کے ماتھے پر خون تھا۔ گٹھے ہوئے سر پر خون تھا اور گھوڑی کے سموں پر خون تھا۔

پنڈت جی گاڑی کے پہلو میں کھڑے اپنی بیوی اور لڑکیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر چلا رہے تھے

"میرا سٹوڈنٹ ہے صفدر۔ میرا سٹوڈنٹ۔ صفدر میرا سٹوڈنٹ" اور صفدر گھبرائی ہوئی

گھوڑی کے قدموں میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔^{۴۳}

صفدر ٹھیلے کی موت پر ہیڈ ماسٹر پنڈت جی یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ ان کے شاگرد نے ان کی بے قابو گھوڑی کو روک کر اچھا کام کیا ہے۔ حالانکہ اس کے ارادے کچھ اور تھے۔ صفدر ٹھیلا اپنے کیے کی سزا پا چکا تھا اور بے شک ہر برے کام کا انجام برا ہوتا ہے۔ اس افسانے کا انجام افسردہ ضرور کر دیتا ہے مگر اشفاق احمد نے اصلاحی پہلو سے جس طرح طالب علموں کی نفسیات اور حرکتوں کے انجام سے باخبر کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ صفدر ٹھیلا کا گھناؤنا طرز عمل اور بے رحم کردار اس کو اس انجام سے دوچار کر دیتا ہے۔

انجم بھائی (اجلے پھول)

"اجلے پھول" انجم بھائی اور طلعت آپی کی محبت کی ادھوری کہانی ہے۔ جس میں المیہ اور درد کا پہلو نمایاں ہے۔ رومانوی کردار انجم بھائی اس افسانے کا مرکزی کردار ہے اور طلوع آپی مرکزی نسوانی کردار ہے۔ اس افسانے میں اشفاق احمد نے کرداروں کے گرد محبت کا دلکش اور خوبصورت دائرہ بنایا ہے جس میں وہ بھرپور انداز میں زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ محبت کرنے والے کردار دنیا و مافیاء سے بے نیاز ہو کر صرف محبت کی لذت اور درد کے سہارے زندہ رہنے کے خواہش مند دکھائی دیئے گئے ہیں۔ کرداروں کا مثبت پہلو ابھارا گیا ہے اور منفی پہلو کو دبایا گیا ہے۔ بقول مرزا حامد بیگ

اشفاق احمد کے ہاں جذبے کا تنوع خصوصاً حسیاتی سطح پر اس جذبہ کی متنوع صورتیں

(گڈریا، اجلے پھول، قصہ نل و نشی) اہمیت کے حامل ہیں۔^{۴۴}

انجم ایک نوجوان ہے جو ایم اے کرنے کے بعد سنٹرل ایکسائز میں تمباکو انسپٹر کی نوکری کر رہا ہوتا ہے۔ وہ رہنے کے لیے اپنے چچا کے گھر منتقل ہو جاتا ہے جہاں آپی، آلاجی، والد وغیرہ کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ آپی سے اس کی ذہنی ہم آہنگی آہستہ آہستہ محبت کا روپ دھار لیتی ہے۔ آپی نے میڈیکل میں داخلہ نہ لیا اور ادب کو پڑھنے لگتی ہے۔ وہ ہر وقت پیار و محبت کے الفاظ اور جذبات میں رہتی ہے۔ گھر میں شام کو اردو، انگریزی، پنجابی ادب کو زیر بحث لایا جاتا تھا جس کے لیے مجلس اہل قلم بنائی گئی۔ چار پانچ ارکان شام کو کچھ نہ کچھ پیش کرتے اور اس پر تبصرہ کیا جاتا۔ کاروائی بھی لکھی جاتی تھی۔ والد، والدہ، بھائی، آپی، انجم بھائی، لالاماموں سب اس میں شریک ہوتے۔ اسی دوران انجم بھائی کو فوج میں کمیشن مل جاتا ہے۔ وہ برما چلے جاتے ہیں۔ اس کی منگنی آپی سے کر دی جاتی ہے۔ پہلی چھٹی پہ جب دو سال بعد انجم بھائی نے آنا

تھا۔ سارے لوگ لینے ریلوے سٹیشن گئے۔ وہ نہ آئے اور ان کا سامان پہنچ گیا اور ساتھ ہی دوسرے دن ان کی لاش گھر پہنچ جاتی ہے کہ دہلی سے وہ دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پہ گھر آنا چاہتے تھے۔ راستے میں ٹرک کے ساتھ حادثہ کی صورت میں جانبر نہ ہو سکے۔ آپنی کی شادی کسی اور سے کر دی جاتی ہے۔ افسانے کا درد بھرا انجام قاری کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ ایک پڑھے لکھے ادب دوست گھرانے کی کہانی ہے۔ جہاں تمام لوگ ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ ان کے ہاں ان کے چچا زاد کی آمد ہوتی ہے جن کا سارا خاندان بسلسلہ ملازمت بیرون ملک مقیم تھا۔ انھیں رہنے کے لیے عزیزوں کے ہاں جگہ چاہیے تھی۔ انجم بھائی نے ایم اے کے فوراً بعد سنٹرل ایکسائز میں نوکری حاصل کر لی اور تمباکو انسپکٹر ہو کر ہمارے یہاں آ گئے وہ کہانی سنانے میں اپنا کوئی ثانی نہ رکھتے تھے۔ ان کو جس صورت حال یا جملے سے کہا جائے کہانی سنانا شروع کر دیتے تھے اور جیسا مرضی ہو نتیجہ نکالنے میں کامیاب ہو جاتے۔ یہ ان کا کمال تھا۔ حس مزاح بہت زبردست تھی اور بات بات میں مذاق کرنے کی عادت تھی۔ گھر میں شام کو لان میں کرسیاں ڈال دی جاتیں اور گپ شپ کے انداز میں بحث مباحثہ چلتا رہتا۔ گھر کے سارے افراد اس میں حصہ لیتے تھے۔ تمام لوگ اپنی اپنی سوچ اور فہم کے مطابق اپنے موقف کا دفاع کرتے اور حوالے دیتے۔ گھر میں بھائی کے ساتھ لڈو کھیلی جاتی اور شرطیں لگائی جاتی تھیں۔ والدہ کو تمام لوگ آلا جی کہتے تھے۔ وہ انگریزی ادب کی دلدادہ تھیں۔ آپنی نے میڈیکل یونیورسٹی میں داخلہ نہ لیا اور پنجابی ادب کو وقت دینا شروع کیا۔ پنجابی قصے کہانیاں، گیت، بولیاں، محاورے گفتگو میں بکثرت استعمال میں لائے جاتے تھے۔ زندگی کے شب و روز بیت رہے تھے۔ ایک دفعہ لڈو کھیلنے ہوئے شرط لگی جو انجم بھائی ہار جاتے ہیں اور سارے لوگ چپکے سے رات کو فلم دیکھنے اور آئس کریم کھانے چلے جاتے ہیں۔ والدہ نے بیٹیوں کو بڑے آرام سے سمجھایا کہ مشرقی عورتوں کی طرح رہیں۔ اور رازدارانہ انداز میں آپنی کو بتایا کہ انجم بھائی کے والد اور گھر سے ہمارے تعلقات سرد مہری کا شکار ہیں۔ تعلقات میں گرم جوشی نہ ہونے کی بنا پر انجم بھائی سے رشتہ داری گانٹھنا ممکن نہ ہو گا لہذا کسی بھی پیش قدمی کی صورت میں ممکنہ نتائج کو بہر حال مد نظر رکھا جانا چاہیے تاکہ بعد میں مایوسی نہ ہو۔ لیکن یہ دونوں پیار و محبت میں دور نکل جاتے ہیں۔ دونوں گھرانوں میں سرد مہری برقرار ہی رہتی مگر حالات نے پلٹا کھایا۔ انجم بھائی کو فوج میں نوکری مل جاتی ہے۔

تمباکو انسپکٹری تو خیر تفریحی نوکری تھی۔ اسے چھوڑ چھاڑ کر انجم بھائی نے فوج میں کمیشن لے لیا۔ اس کی خبر نہ ہم کو ملی، نہ ان کے گھر والوں کو۔ پورے پندرہ دن بیس دن بعد ملٹری اکیڈمی سے ان کا خط آپنی کے نام آیا تو پتہ چلا کہ صاحبزادے کے بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ ٹریننگ کے بعد ابھی لیفٹیننٹ کے عہدے پر ہیں۔ کسی چھاؤنی میں تھے کہ آفیسروں سے کہہ سن کر برافرٹ پر جانے کا حکم حاصل کر لیا۔^{۴۵}

فوج میں چلے جانے کے بعد جب انجم بھائی کو محاذ پر فرائض سرانجام دینے پڑے تو ہر وقت جان ہتھیلی پہ رکھی ہوتی۔ ان حالات میں جب وہ گھرا باجان کو خط لکھا کرتے تو چچا جان، آلا جی اور آپنی کے بارے میں پوچھتے رہتے۔ کچھ عرصہ کی محنت کے بعد وہ اپنے والد کو آپنی کے رشتہ مانگنے جانے کے لیے آمادہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ محاذ پہ ہونے کی بنا پر وہ گھر والوں کی ہمدردیاں سمیٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور من پسند شادی کے لیے گھر والوں کو راضی کر لیا جاتا ہے۔ گھر والے رشتہ لے کر جب آپنی کے گھر پہنچتے ہیں تو وہ بہت حیران ہوتے ہیں اور بخوشی آمادگی ظاہر کر دیتے ہیں۔ انجم بھائی کو خود پہ بہت اعتماد تھا اس لیے وہ اپنا ہدف حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ حالات بہتری کی جانب گامزن تھے کہ کہانی میں وہ موڑ آ جاتا ہے جو دو دلوں میں جدائی کا سبب بنتا ہے اور سارے ماحول کو افسردہ کر جاتا ہے۔ محاذ پہ دو سال پورے ہونے کے بعد انجم بھائی کو چھٹی ملتی ہے۔ سارے لوگ ان کو لینے کے لیے ریلوے اسٹیشن پہ جاتے ہیں مگر انجم بھائی نہ پہنچے بلکہ ان کا سامان وصول کر کے گھر والے واپس آ جاتے ہیں۔ لیکن سامان کے بعد وہ خود نہ پہنچ سکے بلکہ "اسی شام خون سے لت پت انجم بھائی کی لاش ان کے گھر پہنچ گئی۔ تایاجی کانو کر ہمیں اطلاع کرنے آیا تھا۔" جوان لاش گھر پہنچتے ہی کہرام مچ جاتا ہے۔ بنگلے کے تمام لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے ہیں۔ یہ حادثہ انجم بھائی کی موت کے ساتھ افسانے کے اختتام کا بھی باعث بنتا ہے۔ آپنی کی شادی بعد میں کسی دوسرے سے کر دی جاتی ہے۔ مگر وہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ قبرستان جا کر قبر پہ اجلے پھول ڈالنا نہیں بھولتی۔ کہانی کا دکھ بھرا انجام انجم بھائی کے کردار کو امر کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ ایک نیک دل انسان جو دو گھرانوں کو جوڑنے کا سبب بنا تھا، لقمہ اجل بن جاتا ہے۔ اس کی موت سے دو گھرانے آپس میں مل جاتے ہیں۔ انجم بھائی کے کردار کے ذریعے اشفاق احمد محبت کا وسیع تر مفہوم پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ صرف دو دل یا جسم ملنا ہی محبت کی تکمیل نہیں بلکہ سماجی و معاشرتی تقاضوں کو مد نظر رکھا جائے تو دو محبت کرنے والے دراصل دو گھرانوں اور بچھڑے ہوؤں کو ملانے کا باعث بنتے ہیں جو بلاشبہ محبت کی معراج ہے۔

برکھا

یہ افسانہ ثریا نامی کی میٹرک کی طالبہ کی کہانی پر مبنی ہے جو دسویں جماعت کے امتحانات کے بعد گھر پر فراغت کا وقت گزار رہی ہے۔ اس کے ہمسائے میں لطیف صاحب کے گھر ایک دن ایک ٹانگہ آکر رکتا ہے اور کچھ مہمانوں کی آمد ہوتی ہے۔ انسانی فطرت سے مجبور ثریا کو بھی اپنے سے زیادہ ہمسایوں کے مہمانوں میں دلچسپی تھی۔ لطیف صاحب کے بھانجے کی آمد ہوتی ہے۔ جوان کے ہاں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔ وہ شرافت اور سنجیدگی کا پیکر تھا۔ مگر ثریا اپنی عمر کے مطابق جذباتی کیفیت کا مظاہرہ کرتی ہے اور یک طرفہ محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ لڑکے کو اس کی محبت کا علم ہی نہیں۔ وہ سارا دن کچھ لکھتا رہتا۔ گرمی کی وجہ سے برآمدے یا چھت پہ ڈیرے ڈالے رکھتا اور سگریٹ پیئے جاتا۔ کبھی کبھی

شام کو محلے کے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے جاتا۔ اسی دوران وہ ایک دن چپکے سے واپس اپنے گھر چلا جاتا ہے اور ثریا کی ایک طرفہ محبت ادھوری رہ جاتی ہے۔ ثریا کو ہمسایوں کے مہمانوں کے بارے میں بہت تجسس تھا کہ پتہ تو چلے کہ کون آیا ہے؟ تو اس راز سے پردہ کچھ اس طرح اٹھتا ہے۔

شام کو کھانے کی میز پر اباجی نے بتایا کہ لطیف صاحب کا بھانجا امتحان دے کر چند مہینوں کے لیے ماموں کے پاس آیا ہے تو ثریا کو یاد آیا کہ واقعی امتحان دینے کے فوراً بعد لوگ اپنے رشتہ داروں کے یہاں جا کر کئی مہینے گزارا کرتے تھے۔^{۷۷}

اس لڑکے کی آمد ہی سے ثریا سے اپنے خوابوں کا شہزادہ سمجھنے لگتی ہے لیکن یہ لڑکا اس تمام تر عمل سے بے خبر ہے۔ اسے کچھ علم نہیں کہ کوئی اس کے بارے میں کیا کچھ سوچے جا رہا ہے۔ اسے کسی کے بھی خیالات سے آگاہی نہیں ہے۔ اشفاق احمد نے اس کردار کو باوقار اور سنجیدہ طبیعت پختہ مزاج کے لڑکے کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ بھی اپنے امتحانات سے فارغ ہو کر اپنے ننھیال آیا تھا مگر وہ ذہنی طور پر پختہ مزاج ہونے کے ناطے معیار سے گریبا نہیں چاہتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام رکھنے والا لڑکا تھا۔ لیکن ثریا اس کے بارے میں دن کو بھی خواب دیکھنے لگی تھی۔ اشفاق احمد کے ہاں انسان کا مقام اور مرتبہ بہت بلند ہے۔ انسانیت ان کا پسندیدہ موضوع ہے اور انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہوئے وہ اپنے کرداروں کو بھی اسی مقام و مرتبہ کا حامل سمجھتے ہیں اور اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں کیونکہ اشفاق احمد کے ہاں انسان کا ایک پختہ تر تصور موجود ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جس مرتبے پر فائز کیا اور جو بلند مقام بخشا ہے وہ اس کو پہچانے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا نائب ثابت کرے۔ اور یہ اسی صورت ممکن ہے جب وہ کردار کی پاکیزگی اور بلندی کو یقینی بنائے گا تا کہ خلیفۃ الارض کا منصب سنبھالنے کے قابل اور اہل ہو سکے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار بھی انہی خوبیوں سے متصف ہے جن کا تصور اشفاق احمد کے ہاں پایا جاتا ہے۔ ثریا خود اس لڑکے کے بارے میں بتاتی ہے کہ

اکثر وہ لڑکا بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا مگر دو انگ کے بعد اسے ایک باری ملتی تھی اور باؤلنگ کی اجازت نہ تھی۔ ثریا ہر روز ٹیسٹ میچ دیکھا کرتی مگر اس لڑکے کی حرکات سے کبھی

یہ ظاہر نہ ہوا کہ اسے جعفری کے پیچھے کسی کی موجودگی کا پورا پورا احساس ہے۔^{۷۸}

یہاں پر بھی واضح ہوتا ہے کہ لڑکے کو ثریا کے احساسات و جذبات کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اور وہ صرف اور صرف اپنے کام سے کام رکھے ہوئے ہے۔ اگر وہ گلی میں شام کو محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلتا بھی ہے تو صرف کھیل پر ہی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے اور ارد گرد ہونے والی حرکات و سکنات و دیگر عوامل کے اثرات سے بے خبر اور محفوظ ہے۔ چونکہ اشفاق احمد کا یہ افسانہ اصلاحی پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھا گیا ہے لہذا اس میں افسانہ نگار کرداروں کے ذریعے اصلاح کا ہدف

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کرداروں کو اس صورت پیش کرتے ہیں کہ دوسروں کے لیے سبق آموز ہوں۔ اس افسانے میں لڑکے کا کردار بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ وہ خیالات کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کی بدولت افسانے میں خاص مقام حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اوائل نوجوانی اور بلوغت کے ابتدائی مرحلے پر بھی اپنے آپ کو آلائشوں اور برے اثرات سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد واضح کرتے ہیں کہ عمر کے اس حصے میں بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے اور رکھا جانا بھی از حد ضروری ہے تاکہ جذباتی و جسمانی طور پر بگاڑ اور عدم توازن کا شکار ہونے سے بچا جاسکے اور معمول کے مطابق زندگی گزارنے میں سہولت اور آسانی ہو۔

پروفیسر (ایل ویرا)

"اُجلے پھول" مجموعے کا افسانہ "ایل ویرا" ہے۔ جو کہ ایک پروفیسر کی کہانی ہے جو کہ اطالیہ (اٹلی) قیام کے دوران لکھی۔ پروفیسر علمی و ادبی کردار ہے جو کہ دانش گاہ روم کے شعبہ شریقات میں اردو پڑھانے پہ مامور تھا۔ یہ پروفیسر کی محبت کی داستان ہے جو ایل ویرا اور ماریانا نامی عورتوں کے تعلقات اور واقعات پر مبنی ہے۔ ایک دن پروفیسر اور اس کا دوست ٹھا کر مغربی طرز زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لیے لانگ ڈرائیو پہ نکلتے ہیں۔ راستے میں دو طوائف لڑکیوں کو ساتھ بٹھا لیتے ہیں جن کا ریٹ دو ہزار لیرے تھا۔ مناسب جگہ کی تلاش میں روما کی سرحد کراس کر کے دوئے پونتی کے علاقے میں داخل ہونے لگے تھے کہ طوائف لڑکیوں نے کہا کہ ہم آگے نہیں جائیں گی۔ یہ لوگ کچھ کیے بغیر واپس آگئے اور گاڑی سے اترتے ہوئے جسم فروش لڑکیوں کو پوری پوری رقم ادا کر دی۔ وہ بہت متاثر ہوئیں۔ ایک خوبصورت دوشیزہ ایل ویرا پروفیسر کے پاس یونیورسٹی آنے جانے لگی۔ اس کے کام کر دیتی مگر یہ اسے طوائف جان کر اس کے قریب نہ جاتا کہ بدنامی ہوگی۔ یونیورسٹی کی سالانہ تقریب میں ستاتالی کے نواب خاندان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مشرقی علوم اور ثقافت میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور محل آنے کی دعوت دی۔ یہ ان کی بیٹی سینورینیا کو دل دے بیٹھا۔ ان کے ہاں آتا جاتا رہا۔ سینورینیا بھی اس میں دلچسپی لینے لگی۔ یہ اس کو متاثر کرنے کے لیے گفتگو اور تحائف کا سہارا لیتا ہے اور محبت کرنے والی ایل ویرا کو نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ اسی دوران ڈیڑھ سال مکمل ہونے پر اس کا یونیورسٹی میں کنٹریکٹ ختم ہو گیا۔ اسے واپس آنا تھا۔ الوداعی پارٹیاں اور ملاقاتیں ہوئیں اور روانگی کا دن آپہنچا۔ ایل ویرا نے کہا کہ مجھے نیپلز کے ساحل تک ساتھ چلنے کی اجازت دو تاکہ تمہیں الوداع کہہ سکوں مگر پروفیسر نے کہا کہ وہاں ماریانا اور نواب خاندان رخصت کرنے آئے گا۔ ایک طوائف کا وہاں کیا کام؟؟ یہ نیپلز کے ساحل پہ بحری جہاز روانہ ہونے تک انتظار کرتا رہا مگر نواب خاندان نہ آیا۔ ایل ویرا اپنی گاڑی پہ رخصت کرنے ساحل پہ کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ یونیورسٹی کی ایک تقریب میں پروفیسر کو ریکٹر

صاحب نے بتایا کہ اطالیہ کا مشہور نواب خاندان آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ جہاں ان کی ایک لڑکی سے پروفیسر کے تعلقات کا آغاز ہوتا ہے۔ شروعات کچھ اس طرح ہوتی ہیں۔

ریکٹر صاحب نے ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اور فیراکوئی کو بازوؤں سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ذرا میرے ساتھ چلیے۔ ستاتالی کا نوابی خاندان آپ سے ملنے کا متمنی ہے۔ میرے بھاگ جاگ اٹھے۔ قراقلی کو پھونک مار کر اور ٹائی کی گرہ ایک مرتبہ پھر جھاڑ کر میں نے کہا "چلیے"۔^{۷۹}

پروفیسر کو ریکٹر صاحب نے نواب ستاتالی خاندان سے ملوایا۔ تعارف کے بعد چھوڑ کر وہ اجازت لے کر چلے جاتے ہیں اور پروفیسر درباری آداب کے مطابق سلام دعا کر کے بیٹھ جاتا ہے اور گفتگو کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ان کو مشرقی ممالک اور علوم سے گہری دلچسپی تھی۔ نواب صاحب کی بیگم اور ان کی تین بیٹیاں شامل گفتگو تھیں۔ وہ پروفیسر کی باتوں میں گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ پروفیسر کو ان کی بیٹی سینور نیامار یا خاصہ اچھی لگی اور پروفیسر بار بار اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ انھوں نے اس کے اٹلی میں قیام کی مدت کی بابت پوچھا اور اسی دوران پروفیسر کی دل کی بات اس کی دل پسند خوب رو لڑکی کے منہ سے نکلی۔

سینور نیامار نیانے کہا "کے۔ ٹو کی چوٹی فتح ہو جانے پر ہم نے آپ کے ملک کی بابت بہت کچھ پڑھا ہے۔ کبھی ہمارے محل آکر ہمیں کچھ اور بتائیے"۔ جی ضرور۔ میں نے آنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ تو میری عین خوش قسمتی ہے۔^{۸۰}

اس طرح پروفیسر کو محل کی دہلیز پار کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور سینور نیامار نیانے ملاقات کی سبیل نکل آتی ہے۔ مگر دوسری طرف ایک طوائف جسے اُس نے ازراہ ہمدردی پوری رقم ادا کر دی تھی۔ وہ یونیورسٹی پہنچ جاتی ہے اور اس کا خیال رکھنے لگ جاتی ہے۔ یہ اس سے بہت جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے لیکن چونکہ پروفیسر کی رہائش اس طوائف کے علاقے میں ہی ہوتی ہے تو وہ اس کے گھریلو چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتی ہے۔ ایل ویرا نامی یہ لڑکی اس سے حقیقی محبت کرنے لگتی ہے اور اس کی چھوٹی موٹی ضروریات کے بارے میں اس کا خیال رکھتی ہے۔ بارش میں چھتری مہیا کرنا، کپڑے کوٹ استری کر دینا وغیرہ مگر پروفیسر کا رویہ اس سے کچھ کچھسا ہوتا ہے۔ پروفیسر کو طوائف کے سماجی مرتبے کا خیال آتے ہی شرمندگی ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ گھر سے اس کے جو خطوط آتے ہیں۔ وہ بھی ہماری معاشرتی سوچ کی عکاسی کر رہے ہوتے ہیں کہ اس کو بڑے بڑے لوگوں سے میل ملاپ اور تعلقات استوار کرنے کو کہا جاتا ہے نیز گھریلو ماحول میں بھی مادیت پرستی پائی جاتی ہے۔ کہ واپس آؤ گے تو اعلیٰ سے اعلیٰ گھرانے شادی کے منتظر ہیں۔ گھر والوں کی اس سوچ سے اسے محل میں رہنے والی سینور نیامار نیانے زیادہ اچھی لگنے لگتی ہے۔ جبکہ ایل ویرا اس کی نظر میں اپنا مقام کھودیتی ہے۔ ایل ویرا

مقامی ہونے کے ناطے پروفیسر کے لیے زیادہ سودمند تھی۔ یہ اس سے مقامی زبان اور بولی سیکھتا۔ پروفیسر کے خیالات ایل ویرا کے بارے میں کچھ ایسے تھے۔

میری اور اس کی ملاقاتیں بس میرے کمرے تک ہی محدود تھیں۔ باہر اس کے ساتھ نکلنا میں

گوارانہ کرتا تھا اور کبھی سرِ اسے اچانک ملاقات ہو جانے پر وہ خود کئی کاٹ جایا کرتی تھی۔^۸

ایل ویرا کو ایک طوائف جان کر اور محل میں رہنے والی سینورنیا مارنیا کو مقام دینا ہمارے معاشرے کی مجموعی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ جسے بہت خوبی سے اشفاق احمد نے اس کردار کے ذریعے سامنے لایا ہے۔ کردار کو چلتی پھرتی شکل میں دکھایا گیا ہے اور اشفاق احمد کی اصلاحی سوچ اور گہرے سماجی طنز کو ہم دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں کہ انسانی قول و فعل میں تضاد کا یہ عالم ہے کہ انسان طوائف سے ہوس اور خواہش تو پوری کرنا چاہتا ہے مگر دنیا کی نظروں سے اوجھل رہ کر اور دنیا کے سامنے ہمیشہ اپنا مثبت چہرہ لے کر آنا چاہتا ہے۔ اس سے معاشرے کے کھوکھلے پن کا اظہار ہوتا ہے جو کہ اشفاق احمد نے اس کردار کو عہدگی کے ساتھ پیش کر کے واضح کیا ہے۔

د۔ اجلے پھول کے ضمنی مردانہ کردار

آفتاب، آفتاب کا بھائی، ڈاکٹر صاحب، امی چند، رانو (گڈ ریا)

افسانہ "گڈ ریا" کی کہانی داؤجی کے گرد گھومتی ہے مگر ساتھ ہی چند ضمنی کردار ضرور ایسے ہیں جو افسانے کا اہم حصہ ہیں بلکہ گہرے اور انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ داؤجی ایک مخلص، بے لوث اور شریف النفس آدمی ہے۔ جس کے پاس پڑھنے کے لیے اس کے ہمسایوں کے دولڑکے آفتاب اور اس کا بھائی آتے ہیں۔ ان کا والد ڈاکٹر صاحب پیشے کے لحاظ سے مسیحا ہے مگر اولاد کی تربیت کے حوالے سے خاصا سخت واقع ہوا ہے۔ داؤجی کا ایک بیٹا امی چند، آفتاب کے بھائی، جسے داؤجی پیار سے گولو کہتے ہیں، کا ہم جماعت ہے۔ جب کہ رانو محلے کا ایک نوجوان منفی کردار ہے۔ وہ ایک بد معاش اور غنڈہ طبیعت کا مویشی پال ہے جو کہ داؤجی سے خدا واسطے کا بیر رکھتا ہے مگر داؤجی اس کو ہمیشہ معاف اور نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔ امی چند داؤجی کا اکلوتا بیٹا ہے۔ گولو کو داؤجی کی پراسرار شخصیت کے بارے میں جاننے کا بہت اشتیاق تھا۔ وہ ان کو ملاں جی سے پارہ پڑھتے ہوئے واپسی پہ دیکھا کرتا تھا۔ اس کا بھائی آفتاب ان کو سلام کیا کرتا۔ جس کے جواب میں وہ علیکم السلام کی بجائے جیتے رہو جیتے رہو کہا کرتے۔ سر پہ پگڑی، لمبا کرتا، چٹیا باندھنا وغیرہ ایک بچے کے لیے خاصے تجسس کی چیز تھی مگر وہ کوشش کے باوجود داؤجی کے بارے میں کچھ جان نہ پایا۔ داؤجی کے بارے میں تجسس کچھ زیادہ دیر تک نہ رہا۔ اس بارے میں گولو خود بتاتا ہے۔

اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم بی ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا تو داؤجی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤجی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے۔ لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے ہوشیار تھا۔^{۸۲}

امی چند ایک مذہبی کردار ہے جس کو ایک ہوشیار، محنتی اور لائق لڑکے کے روپ میں دکھایا گیا ہے۔ وہ مذہبی تعلیمات کے پیش نظر چونکہ سر پہ پگڑی باندھتا تھا اور بچگانہ شکل و صورت ہونے کی بنا پر پگڑی سر سے بڑی لگتی تھی اور منہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے بچے اس کو شرارتیو لایا بلی کہتے تھے مگر گولو اس کو ایسا نہ کہتا جس کے پیچھے داؤجی کی شخصیت کا پراسرار ہونا اور ان سے ان دیکھی سی محبت و عقیدت تھی۔ اس وجہ سے امی چند بھی گولو کا بہترین دوست بن جاتا ہے۔ امی چند کی وجہ سے ہی گولو کی رسائی داؤجی تک ہو جاتی ہے۔ امی چند کو ایک لڑکے کے روپ میں دکھایا گیا ہے کیونکہ داؤجی سارے گاؤں کے لڑکوں کو ہر وقت پڑھنے کی نہ صرف تلقین کرتے رہتے بلکہ باتوں باتوں میں، سوال و جواب کے ذریعے تعلیم و تدریس کا فرض نبھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ داؤجی امی چند کو بھی ہر وقت پڑھاتے رہتے۔ گفتگو کے دوران استعمال ہونے والے الفاظ

کے جملے بنواتے، نحوی تراکیب پوچھتے، ملتے جلتے الفاظ انگریزی، عربی، فارسی میں پوچھتے نیز ریاضی و سائنس کے معاملات بھی زیر بحث آتے رہتے۔ اس بنا پر امی چند کی ذہنی سطح بلند ہو چکی تھی۔ وہ سکول میں اچھی تعلیمی کارکردگی دکھاتا تھا۔ میٹرک کا نتیجہ کچھ یوں نکلا۔

بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی ہائی سکول پہنچی۔ امی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اول آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔^{۸۳}

امی چند حقیقت میں ایسا ہونہار بیٹا ثابت ہوتا ہے جو داؤجی کی عزت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ اس وجہ سے داؤجی کا نام قصبے اور سکول میں مشہور ہو جاتا ہے۔ گو کہ اس افسانے میں امی چند کا کردار انتہائی محدود ہے مگر داؤجی کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے اور افسانے میں اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر صاحب گولو کے والد ہیں۔ آفتاب ان کا بڑا بیٹا تھا جسے داؤجی نے محنت سے پڑھایا تھا اور وہ فرسٹ ڈویژن سے پاس ہو کر اب شہر کے کالج میں پڑھتا تھا اور وہیں رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی اولاد کے معاملے میں ایک شفیق باپ کی حیثیت سے متعارف کروایا گیا ہے جو تعلیم و تربیت کے سلسلے میں سختی کا قائل ہے۔ جب گولو کا نتیجہ نکلا تو وہ میٹرک میں فیل قرار پایا تھا۔ شام کو بید سے والد صاحب نے پٹائی کی اور گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ یہ نو عمر لڑکا شدید غم و غصے کی حالت میں گھر سے چلا جاتا ہے اور دو روز رہٹ کے پاس وقت گزارنے لگتا ہے۔ شام کو والدہ پیار سے سمجھا بچھا کر گھر واپس لے آتی ہیں اور اباجی سے معافی دلاتی ہیں مگر ڈاکٹر صاحب سخت ناراض تھے۔ دوسرے دن کلینک پہ ڈاکٹر صاحب بلواتے ہیں جہاں داؤجی بھی موجود تھے۔ ابھی تک ان کا غصہ نہیں اترتا تھا۔ جیسا کہ اس مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے۔

ان کو پہچانتے ہو؟ اباجی نے سختی سے پوچھا۔ بے شک! میں نے ایک مہذب سلیز مین کی طرح کہا۔ بے شک کے بچے، حرام زادے، میں تیری یہ سب۔۔۔۔۔ "نہ نہ ڈاکٹر صاحب، داؤجی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا" یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے"^{۸۴}

ڈاکٹر صاحب کے غم و غصے میں جہاں دیگر عوامل و محرکات شامل تھے وہیں پر پدرانہ شفقت بھی آڑے آتی تھی۔ کیونکہ ہر والد کی طرح ڈاکٹر صاحب بھی اپنی اولاد کو کامیاب دیکھنا چاہتے تھے اور ہر قیمت پر، ہر حربہ آزما کر، جس میں جسمانی تشدد تک شامل تھا کہ کسی طرح یہ پڑھ جائے۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے داؤجی کو کلینک بلوایا تھا تاکہ یہ بچہ ان کے حوالے کیا جاسکے۔ اس کے بعد گولو ان کے پاس رہنے لگا تھا۔ جہاں سے وہ میٹرک پاس کر کے واپس آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایسے باپ کے طور پر سامنے آتے ہیں جو اپنے بیٹے کے لیے بہترین اور محنتی اتالیق کا انتخاب کرتے ہیں بلکہ اس کے لیے ہوسٹل کا بھی انتظام کر دیا جاتا ہے جو کہ داؤجی کا گھر تھا کہ ہر وقت وہ داؤجی کے پاس رہے اور دن رات پڑھتا رہے تاکہ کامیابی اس کا

مقرر بنے۔ گولو کی یہ حالت نویں جماعت میں پہنچ کر غیر نصابی داستانوی کتب پڑھنے سے ہو گئی تھی۔ داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، ملکہ سبا و حضرت سلیمانؑ کے واقعات، سند باد جہازی، الف لیلہ اور فسانہ آزاد کو دن رات نصابی کتب میں چھپا کر پڑھنا اس کا مقبول مشغلہ ٹھہرا جس کی بدولت دسویں جماعت میں فیل ہو گیا۔ اب اس کو داؤجی کی شاگردی میں دے دیا گیا تھا حالانکہ یہ اپنے دوستوں کے ساتھ گھر سے بھاگ کر لاہور پہنچ کے کاروبار کے منصوبے بنا رہا ہوتا ہے۔ اس کے دوستوں میں خوشیا، کوڈو، ویسویبیب وغیرہ شامل تھے۔ مگر داؤجی کی پرتاثر گفتگو اور دل میں اتر جانے والی نگاہ کی بدولت یہ دوبارہ سکول جانے لگا۔ واپسی پہ داؤجی کے گھر ٹھہرتا۔ رات وہیں بسر کرتا اور صبح وہیں سے سکول چلا جاتا۔ آزادی کی زندگی بسر کرتے کرتے اچانک یہ داؤجی کے ہتھے چڑھ گیا۔ ان دنوں کی سختی اور طبیعت کی گرانی کا تذکرہ کچھ یوں کرتا۔

داؤجی نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ مجھے تباہ کر دیا، مجھ پر جینا حرام کر دیا۔ سارا دن سکول کی بکواس میں گذرتا اور رات، گرمیوں کی مختصر سی رات، ان کے سوالات جواب دینے میں۔ کوٹھے پر ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہوتی۔^{۸۵}

اشفاق احمد نے ننھے طالب علم کی سوچ کی بہت خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ چونکہ اس عمر میں پڑھنا لکھنا اچھا نہیں لگتا ہے بلکہ کھیلنا کو دنا، گھومنا پھرنا اور اس طرح کے مشاغل میں دل زیادہ لگتا ہے۔ یہ گھر سے نکال دیئے جانے کے بعد وہ چونکہ داؤجی کے رحم و کرم پہ تھا لہذا ان کی خوشنودی کے لیے پڑھتا رہتا۔ خواہ بے دلی سے ہی کیوں نہ ہو۔ بعض مواقع پر گولو قارئین کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے مگر داؤجی کا مشفقانہ رویہ اور سلوک اس اثر کو زائل کر دیتا ہے۔ داؤجی نہ صرف اس کی تعلیم کا خیال کرتے ہوئے درسی ضروریات کو پورا کر رہے ہوتے ہیں بلکہ اس کی جسمانی صحت کے بارے میں بھی فکر مند نظر آتے ہیں۔ یہ قدرے صحت مند بچہ ہے جسے داؤجی موٹاپے سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کو ورزش اور بدنی کسرت کا مشورہ دیتے ہیں۔ صبح خیزی کے فوائد بتاتے ہوئے اس کو صبح کی سیر پہ ساتھ لے جاتے ہیں مگر ایک دن کے سوا یہ نہ تو صبح جلدی جاگتا ہے اور نہ ہی سیر کرنے کو ساتھ جاتا ہے۔ صبح اٹھانے اور سیر کے لیے ساتھ لے جانے کا انداز کچھ یوں ہوتا۔

وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے "اٹھ گولو موٹا ہو گیا بیٹا" دنیا جہان کے والدین صبح جگانے کے لیے یہ کہا کرتے ہیں کہ "اٹھو بیٹا صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا" مگر وہ "موٹا ہو گیا" کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے۔ میں منمناتا تو چکار کر کہتے "بھدا ہو جائے گا" بیٹا تو گھوڑے پر ضلع کا دورہ کیسے کیا کرے گا؟^{۸۶}

داؤجی کا انداز ملاحظہ ہو کہ کس طرح پہلے وہ اس کی انا کو ٹھیس پہنچا کر جگانے کی کوشش کرتے ہیں اور ساتھ ہی تحریک دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک بہترین معلم کی طرح ذہنی آمادگی پیدا کرنے کے لیے مثالوں کا سہارا لیتے ہیں تاکہ متعلم پر اس سرگرمی کا مثبت اثر واضح ہو سکے۔ اس دور میں ضلع کا افسر کمشنر و دیگر حکومتی اہلکار گھوڑے کا استعمال کیا کرتے تھے کیونکہ گاڑیاں اس دور میں نہ تھیں۔ لوگ پیدل سفر کیا کرتے۔ بار برداری کے لیے گدھا، خچر، بیل گاڑی اور اونٹ استعمال لائے جاتے اور گھوڑا تیز رفتاری اور طاقت کے سبب ان تمام ذرائع پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے شاگرد کو جہاں ترغیب دے رہے ہوتے تھے وہیں پر اس کی تلقینی انداز میں حوصلہ افزائی کر رہے تھے تاکہ وہ خواب کو عملی تعبیر دینے پر آمادہ ہو سکے۔ داؤجی کے لاڈ پیار نے اسے بہت حد تک بگاڑ دیا تھا۔ امتحانات قریب آتے ہی داؤجی نے قدرے زیادہ محنت کرنا شروع کر دی۔ سکول لینے اسے پہنچ جاتے۔ واپسی پہ سارے راستے سوال در سوال کرتے چلے جاتے۔ جغرافیہ تاریخ کے سوالات کرتے۔ یہ ایک دفعہ سکول کے بیرونی دروازے کی بجائے عقبی دروازے سے گھر کی طرف چل پڑا تو یہ اس کی کلاس کے سامنے آکر بیٹھنے لگے اور واپسی پہ سارا راستہ اس کو پڑھاتے جاتے۔ ایک ضدی اور اکھڑ مزاج لڑکا جو میٹرک میں فیل ہو چکا تھا۔ اب باقاعدگی سے سکول جانے لگا اور جماعت میں اسباق میں شرکت کرنے لگا تو یہ بھی داؤجی کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ مگر یہ امتحانات کے قریب آتے ہی محنت اور توجہ زیادہ ملنے سے گھبرا جاتا ہے اور گالم گلوچ پہ اتر آتا ہے۔

میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بد زبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤ کے بچے کو یا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو میں انہیں کتے کہنے سے بھی نہ چُوتھا۔^{۸۷}

ایک بچے کے رد عمل کو جس طرح اشفاق احمد نے ظاہر کیا ہے یہ ان کا ہی خاصہ ہے۔ بچے طبیعت کے خلاف اور مرضی کے خلاف کام، رائے اور عمل کو بہت برا جانتے ہیں اور سخت ترالفاظ میں جواب دیتے ہیں۔ باغیانہ رویہ اپنالیتے ہیں اور سرکشی پہ اتر آتے ہیں۔ یہاں پر گولوکار د عمل بھی اس کے کردار کے عین مطابق ہے۔ اس کا انداز مخاطب، لب و لہجہ اور الفاظ کا چناؤ بھی اس کی عمر اور طبیعت کے مطابق ظاہر کیا گیا ہے۔ دوسرا داؤجی کی اعلیٰ ظرفی اور عاجزی کی انتہا دیکھیے کہ گالیاں کھا کے بھی اور شاگرد کی طرف سے بد سلوکی کے باوجود وہ علم و حکمت کی شمع اس کے اندر جلانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ یہ اس کے شدید الفاظ کے بدلے اس کو مسٹر ہونق، طنزورہ، انخفش اسکو اڑیا ڈومنی کہہ دیتے۔ ڈومنی بھی صرف شدید غصے کی حالت میں۔ ورنہ عام الفاظ سے نوازا جاتا۔ خیر وقت گذرتا گیا، امتحانات شروع ہو گئے۔ امتحانی سنٹر ضلع کا سکول بنا۔ لاری میں بیٹھ کر مقسوم امتحان دینے پہنچا تو ساتھ ہی داؤجی بھی ہم سفر ہوئے۔ رات بارہ بجے تک پڑھاتے اور صبح

امتحانی سنٹر تک چھوڑنے آتے۔ دھرائی کراتے رہتے۔ اگر مقسوم سوال کا جواب نہ بھی دیتا تو خود بتا دیتے۔ سوالیہ پرچہ لے کر ایک ایک سوال کا جواب پوچھتے اور اندازہ لگاتے کہ کتنے نمبر آئیں گے۔ ریاضی کے سو میں سے اسی نمبر کا پرچہ حل کرنے پر داؤجی بہت دل گرفتہ ہوتے ہیں۔ نتیجہ آنے پر صرف ایک نمبر سے فرسٹ ڈویژن رہ جاتی ہے تو داؤجی اس پر اپنے آپ کو مجرم تصور کرنے لگتے ہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب اپنے بچے کے ہمراہ مٹھائی کی ٹوکری لے کر جاتے ہیں تو داؤجی کہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھیے۔ میرا خیال تھا کہ اس

کی فرسٹ ڈویژن آجائے گی لیکن نہ آسکی۔ بنیاد کمزور تھی۔ ایک ہی تو نمبر کم ہے۔ میں نے چمک کر

بات کاٹی۔ اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا دل دو نیم ہو گیا

ہے۔ خیر میں اسے منجانب اللہ خیال کرتا ہوں۔"

اس محلے میں رانوانی ایک نوجوان رہتا ہے جو بد معاش اور غنڈہ ہے۔ اشفاق احمد نے اس کو منفی اور شر کی طاقتوں کا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ داؤجی کو ایک ہندو سمجھ کر تنگ کرتا رہتا ہے۔ ان کو چھیڑنے کی غرض سے اوئے پنڈت کے نام سے پکارتا ہے اور زبان درازی کرتا رہتا ہے۔ یہ افسانے میں شریںد عناصر کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے۔ اس سے ہر قسم کے سماجی و اخلاقی جرائم کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کے قلب و ذہن میں ہمیشہ منفی سوچیں گردش کرتی رہتی ہیں۔ وہ آتے جاتے گولو کو بھی تنگ کرتا رہتا اور چڑانے اور چھیڑنے کی کوشش کرتا ہے کہ تم ایک ہندو کے گھر رہتے ہو۔ کچھ دن وہ داؤجی کے گھر روڑے اور اینٹیں بھی شام کو اندھیرے میں پھینکتا ہے۔ جس کا الزام بے بے داؤجی پہ لگاتی ہے کہ یہ جو تم ہر وقت عربی فارسی کے منتر پڑھتے رہتے ہو۔ یہ کالا علم اب الٹا ہو گیا ہے اور جنوں نے ہمارے گھر حملہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شکایت پر رانو کو تھانیدار گرفتار کر لیتا ہے اور تھانے لے جا کر تنبیہ کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ہر صورت داؤجی سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ انہی دنوں تقسیم ہند کی وجہ سے مہاجرین کی آمد شروع ہو جاتی ہے اور بلوایوں کے حملوں کی وجہ سے فسادات بھڑک اٹھتے ہیں۔ تقسیم برصغیر نے انسانی مسائل میں اضافہ اور رویوں میں پیچیدگی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں انسانی رشتوں کا تقدس پامال ہوا۔ نہ صرف رشتوں کی پہچان اور رشتے دار کھو گئے بلکہ دوست اور دشمن کا مفہوم و معنی بھی بدل گیا۔ معاشرتی اقدار کی شکست و ریخت نے پورے سماج کو متاثر کیا۔ مہاجرین کے ساتھ راستے میں جو براسلوک اور ہتک آمیز رویہ اپنایا گیا۔ ان مظالم کی دلدوز کہانیاں سن کر مسلم اکثریتی علاقوں میں غیر مسلموں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ انھی حالات کا سامنا قصبے کے منشی چنت رام المعروف داؤجی کو بھی کرنا پڑا۔ گولونے جب مشتعل لوگوں کا ہجوم داؤجی کے گھر کے پاس دیکھا اور اندر گھسنے کی کوشش کی تو یہ منظر دیکھا۔

رانو داؤجی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا "اب بول بیٹا اب بول" اور داؤجی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے ان کی پکڑی اتار کر کہا "پہلے بودی کاٹو اور رانو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤجی کی بودی کاٹ دی۔"^{۸۹}

تقسیم برصغیر کے نتیجے میں جہاں جنگ و تشدد کے ذریعے ظلم و بربریت کی داستانیں رقم ہوئیں۔ وہیں معاشرے میں اخلاقی زوال اور انتشار بھی پھیلا جو کہ تہذیبی زوال کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس سانحے نے اجتماعی رویوں کو بہت بری طرح متاثر کیا۔ اس سے بڑھ کر زوال کیا ہو سکتا ہے کہ وہ انسان جس نے معاشرے میں بگڑے لوگوں کو سنوارنے اور سدھارنے کے لیے اپنی زندگی وقف کی ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جا رہا تھا۔ انسانیت کی تذلیل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ معلم کو درندگی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور مذہب کے نام پر شر پسند عناصر سرگرم ہو گئے تھے۔ جن کو مذہب اور مذہبی تعلیمات کا پتہ تک نہ تھا۔ ان میں رانو نامی معاشرے کا کثیف کردار بھی شامل تھا۔ رانو کی مذہبی تعلیم اور عدم پیروی ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے۔

رانو نے کہا، جانے دو بڑھا ہے۔ میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا۔ پھر اس نے داؤجی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ کلمہ پڑھ پنڈتا۔ اور داؤجی آہستہ سے بولے کون سا؟ رانو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا "سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں! جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاشی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا "چل بکریاں تیرا انتظار کرتی ہیں۔"^{۹۰}

ان کلمات سے افسانے کا دردناک اور المناک انجام ہو جاتا ہے۔ تقسیم برصغیر جیسے سانحے نے معاشرے کی روحانی اقدار اور تہذیبی عناصر کی توڑ پھوڑ میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مفلسی، غربت، جہالت جیسے مسائل سے دوچار عوام پہ مزید غم و افتاد کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ خوف، کرب، تشدد نے سماجی و ثقافتی ترجیحات کو بدل ڈالا۔ چھوٹے بڑے کی تمیز ختم ہو جانے کے باعث معاشرے کے منفی کرداروں کو کھل کر کھیلنے کا موقع ملا۔ رانو بھی ان میں سے ایک اہم کردار ہے جسے اشفاق احمد نے فسادات کے تناظر میں اپنی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ بحیثیت مجموعی افسانے کے تمام ضمنی کرداروں کو دیکھا جائے تو ان میں باہم مطابقت کے ساتھ اثر انگیزی دکھائی دیتی ہے۔ اگر منفی کردار پیش کیا گیا ہے تو اس کے پس منظر میں فرسودہ روایات اور ظالمانہ سوچ کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے اور مثبت کردار بھی ہمدردیاں سمیٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

چچا امان، بھیا (گل ٹریا)

"گل ٹریا" افسانہ ایک ننھے بچے کے کتے کے بارے میں ہے جسے یہ تحفہ اس کے چچا امان نے بھیجا تھا۔ بھیا اس کے بڑے بھائی ہیں یہ دونوں ضمنی کردار ہیں جو افسانے میں کہانی کو اہم موڑ دیتے ہیں اور اپنے نشان و آثار چھوڑ جاتے ہیں۔ کہانی اگرچہ ننھے بچے کے کتے گل ٹریا سے متعلق ہے لیکن اس کا تعلق براہ راست بھیا کے عشق میں ناکامی سے ہے۔ افسانہ نگار ان دونوں واقعات کو آپس میں جوڑ کر افسانے کا اختتام کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے بھیا کے دکھ درد اور مصائب کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کی ہمدردیاں افسانے کے اختتام پر بھیا سے ہو جاتی ہیں۔ قارئین اسے رحم بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ بھیا گھر میں بڑا بھائی ہونے کے ناطے محتاط رویہ کا حامل سمجھدار لڑکا تھا۔ اُسی کی ضمانت پر کتے کو چچا امان سے منگوانے کی اجازت دی گئی تھی کہ بھیا اس کا خیال رکھیں گے۔ افسانے میں چچا امان کا تذکرہ صرف کتا بھجوانے کے بارے میں ہی ملتا ہے۔ اس کا ذکر نہا بچہ کچھ یوں کرتا ہے۔

بستر میں لیٹ کر میں جی ہی جی میں چچا امان کا شکری ادا کرنے لگا جنہوں نے وعدے کے مطابق کوہاٹ جاتے ہی ٹی ٹی بھیج دیا تھا۔ جب تک وہ ہمارے یہاں رہے، روزانہ ٹی ٹی کے قصے سناتے رہے۔^{۹۱}

چچا امان کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ انھوں نے اپنے کتے کے بارے میں قصے کہانیاں اور اس کی شرارتوں کے واقعات سنا سنا کر چھوٹے بچے میں اشتیاق پیدا کر دیا تھا کہ وہ یہ ٹی ٹی رکھے گا۔ اس سے کھیلے گا اور اس کی شرارتوں سے لطف اٹھائے گا مگر ابا جان اجازت نہ دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بچہ ہے۔ چند دن بعد شوق اتر جائے گا تو اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ کیونکہ کتے کا صرف آجانا ہی کافی نہ تھا بلکہ اس کی دیکھ بھال، خوراک پانی کا خیال رکھنا نیز گرمی سردی میں رہائش و دیگر لوازمات کا اہتمام کرنا نہایت ضروری تھا۔ اس لیے جب بھیا نے ہامی بھری تو ٹی ٹی کو در آمد کرنے کی اجازت مل گئی۔ ننھا رومانوی کردار اپنے بھیا کا تعارف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

بھیا ہم سب بہن بھائیوں سے مختلف تھے۔ دبلے پتلے زردی مائل سفید رنگ کے خوش اطوار صاحبزادے تھے۔ بات بات میں لطیفے پیدا کرتے۔ قدم قدم میں نئی شرارتیں سمجھاتے اور ہنسی ہنسی میں ہمیں پٹوا دیتے لیکن ان کے ارادے برے نہ تھے۔ خود ہی ہمیں بھس میں چنگاری ڈالنے کے طریقہ بتاتے اور آپ ہی اسے بجھانے پر آمادہ ہو جاتے۔^{۹۲}

بھیا کے سراپا اور عادات و اطوار سے پتہ چلتا ہے کہ اشفاق احمد نے اس ضمنی کردار کو پیش کرنے میں کتنی محنت کی ہے اور کمال مہارت سے ایک نو عمر لڑکے کی تمام خوبیاں اور خامیاں اس کے اندر سمونے کی کوشش کی ہے۔ بھیا کو سمجھداری کی

بنا پر اباجان کا مشیر بھی ہونے کا شرف حاصل تھا اور وہ ان سے عموماً مشورہ اور رائے طلب کرتے تھے۔ اور اس کی روشنی میں فیصلہ کیا کرتے تھے۔ اشفاق احمد نے جہاں اس عمر کے لڑکے کے وضع دار، سمجھدار اور محتاط ہونے کا ذکر کیا ہے وہیں پر انھوں نے اوائل عمری میں کی جانے والی شرارتوں کا ذکر بھی کر دیا ہے کیونکہ اس عمر میں لڑکے بالے شرارتیں کرتے رہتے ہیں۔ عموماً چھوٹے بہن بھائیوں یا ہمسایوں، رشتہ داروں کے بچوں کو کسی نئی شرارت کا طریقہ بتاتے ہیں اور خود ذرا دور بیٹھ کر اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خود پس منظر میں رہ کر چھوٹے بچوں کو استعمال کرنا اور نقصان بھی نہ ہونے دینا، جسے ننھا بچہ یہاں بیان کر رہا ہے کہ وہ ہمیں بھس میں چنگاری ڈالنے کا طریقہ بتاتے اور خود ہی لگی ہوئی آگ کو بجھانے لگتے۔ یہ اور دیگر اس طرح کے مشاغل اس عمر کے لڑکوں کا من پسند مشغلہ ہوتا ہے۔ جب کتا کھو جاتا ہے تو چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کر بھیاکتے کو ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں مگر ٹی ٹی نے نہ ملنا تھا اور نہ ہی ملا۔ کتے کو ڈھونڈنے میں وہ کئی دفعہ رات کو دیر سے واپس آتے اور گھر کے عقبی دروازے سے داخل ہو کر پتہ نہ چلنے دیتے۔ اس عمر میں جسمانی و جذباتی تبدیلیوں کے باعث لڑکوں میں جنس مخالف کی کشش بڑھ جاتی ہے اور وہ رومانوی طرز زندگی اپنا کر عشق کے تجربے سے ضرور گذرتے ہیں۔ ناکامی اور کامیابی کی پرواہ کیے بغیر۔ بھیا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا جسے وہ اپنی ڈائری میں لکھتے رہتے تھے۔ یہ ڈائری چھوٹے بھائی کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ اس میں ایک دن کا احوال کچھ یوں لکھا ہوتا ہے۔

یہ دن بڑا سہانا ہے۔ ہم صبح کیرم کھیلے رہے "ت" مجھے اچھے اچھے لطیفے سنا کر خوب ہنساتی رہی۔ پھر میں "ایڈیٹ" کے مختلف اقتباسات اسے سناتا رہا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور میرے چہلے کو میری انگلی میں گھمائے جاتی تھی۔^{۹۳}

اس کردار کی خوبی یہاں بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر چھوٹا بھائی بھیا کو سمجھدار اور محتاط بتاتا ہے تو وہ اپنے قول و فعل اور عمل سے ثابت بھی کرتے ہیں۔ ڈائری لکھنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنی محبوبہ کا نام نہ لکھ کر اس کا بھرم رکھا ہے۔ یہ ان کی وضعداری اور اعلیٰ ظرفی کی ایک مثال ہے۔ کردار کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ لکھاری جس طرح اسے پیش کر رہا ہوتا ہے۔ کہانی کے شروع سے آخر تک وہ اسی صورت میں نظر آنا چاہیے۔ یہاں بھی بھیا پر جو چھاپ لگی نظر آتی ہے۔ شروع سے آخر تک بھیا اس کے ساتھ انصاف کرتے نظر آتے ہیں۔ الغرض بھیا کا کردار ضمنی ہونے کے باوجود اچھا اور بھرپور تاثر چھوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

پنڈت جی، مولوی ابوالحسن (صفدر ٹھیلا)

"صفدر ٹھیلا" اصلاحی پہلو لیے سکول کے طالب علموں اور اساتذہ کے واقعات پر مبنی افسانہ ہے۔ اشفاق احمد کا من پسند موضوع تو محبت ہے جس کا درس ہمیں ان کے افسانوں میں اکثر و بیشتر ملتا ہے لیکن یہ اُس عام موضوع سے ہٹ کر ہے مگر

اشفاق احمد کے افسانوں کا ایک اور اہم پہلو اخلاقی و اصلاحی نقطہ نظر سے کہانیاں لکھنا بھی ہے۔ یہ افسانہ صفدر ٹھیلا نامی نوجوان طالب علم کی کہانی ہے جو کئی دفعہ میٹرک میں فیل ہو چکا ہے۔ قد کاٹھ، جسامت اور دہشت بہت زیادہ ہے۔ سکول کے تمام اساتذہ و طلبہ اس سے دب کر رہتے تھے۔ وہ ہر وقت سر پر استرا پھیرے رکھتا۔ اس افسانے کے ضمنی مردانہ کرداروں میں اس سکول کے ہیڈ ماسٹر پنڈت امر ناتھ جی اور مولوی ابو الحسن قابل ذکر ہیں۔ پنڈت جی کو ایک اصول پسند اور سخت مزاج منتظم کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ تمام اساتذہ و طلبہ ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ بھی دل و جان سے تمام اساتذہ و طلبہ کی فلاح کا خیال رکھتے اور ہر وقت سکول کی بہتری کے لیے دن رات کام کرتے رہتے تھے۔ مگر صفدر ٹھیلا سے وہ بھی کتراتے تھے۔ ان کا تعارف افسانے میں یوں کر آیا گیا ہے۔

ہمارے ہیڈ ماسٹر پنڈت امر ناتھ صاحب بڑے کڑے آدمی تھے۔ سکول میں کسی قسم کی بے قاعدگی برداشت نہ کرتے۔ کوئی لڑکا بھولے سے ممنوعہ گراس پلاٹ میں پاؤں رکھ دیتا تو ایک بید سے کم اس کی تواضع نہ ہوتی لیکن صفدر ٹھیلے سے وہ بھی دبتے تھے۔ اگر کبھی اس کو سزا دینے کی ضرورت محسوس ہوتی تو ابو الحسن صاحب سے کہہ دیتے۔^{۹۴}

ہیڈ ماسٹر پنڈت امر ناتھ جی کا کردار بطور منتظم بہت اچھی طرح پیش کیا گیا ہے۔ جہاں وہ فرائض کی ادائیگی پہ زور دیتے نظر آتے ہیں۔ وہیں پر طلبہ و اساتذہ کے حقوق کے لیے بھی بے چین رہتے۔ اس طرح اس کردار میں قاری کی دلچسپی بڑھتی ہے۔ وہ پنڈت جی کو شعوری طور پر احترام دینا شروع کر دیتے ہیں۔ آمرانہ رویہ کسی بھی وقت ان میں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ نوجوان طلبہ کے جذباتی فیصلے ان کی ناکامی کی تاریخ رقم کر دیتے ہیں لہذا وہ نظم و ضبط پہ بہت زیادہ دھیان دیتے تھے۔ ان کے نزدیک نظم و ضبط سے زیادہ کوئی شے قیمتی اور عزیز نہ تھی۔ ان کی سرکاری زندگی میں جہاں صفدر ٹھیلے والا کردار ایک کمزور پہلو تھا۔ وہیں اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاحی کردار مولوی ابو الحسن نامی عربی و فارسی استاد کے ذریعے پورا کر دیا تھا۔ وہ ایک سخت گیر استاد کے طور پہ مشہور تھے۔ طلبہ مولوی ابو الحسن کا نام سن کر کانپنے لگتے۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اپنے تراشیدہ اصول و ضوابط پہ سختی سے کاربند نظر آتے ہیں۔ جب کبھی بھی صفدر ٹھیلے کو سزا دلوانا ہوتی تو ہیڈ ماسٹر پنڈت جی مولوی صاحب کو کہتے۔ مولوی صاحب کا انداز کچھ یوں ہوتا۔

مولوی صاحب ٹھیلے کو کان سے پکڑ کر کشاں کشاں دفتر میں لے جاتے اور پنڈت جی کی میز کے سامنے کھڑا کر کے اپنے مخصوص لہجے میں کہتے "نالائق، خبیث توبہ کر، معافی مانگ پنڈت جی سے، نہیں تو جان سے مار دوں گا" اور ٹھیلا ہنستے ہوئے کہتا۔ توبہ جی، پنڈت جی، معافی دے دو جی۔ اور پنڈت جی معاف کر دیتے۔^{۹۵}

مولوی ابوالحسن کا صفدر ٹھیلا بہت احترام کرتا تھا۔ ان سے مار کھالیتا اور ان کا کہنا بھی مان لیتا تھا حالانکہ وہ کسی بھی دوسرے استاد کے قابو میں نہ آتا تھا۔ مگر مولوی ابوالحسن کے آگے سر نہ اٹھاتا تھا۔ مولوی صاحب سخت گیر استاد مانے جاتے تھے۔ سکول کے معاملات جب صفدر ٹھیلا کی وجہ سے بگاڑ کا شکار ہوتے ہیں تو مولوی ابوالحسن ہی اس کو معافی تلافی پر آمادہ کرتے اور باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ صفدر ٹھیلا جس سے صفدر ٹھیلا کبھی بھی انکار نہ کرتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں سے بھی اس کا ذکر کرتا رہتا تھا کہ مولوی صاحب اگر سکول میں نہ ہوں تو مجھے ذرا کھل کر کھیلنے کا موقع ملے۔ مگر میں اب مولوی جی کی وجہ سے باز رہتا ہوں۔ صفدر ٹھیلا جب پنڈت جی کو جان سے مارنے کی دھمکی دیتا ہے تو مولوی جی اس کی کلاس لیتے ہیں۔ اس سے ناک کی لکیریں نکلاتے ہیں اور صفدر ٹھیلا کی قسمیں کھانے کے بعد اس کو چھوڑتے ہیں۔ الغرض اشفاق احمد نے مولوی جی اور پنڈت جی کے کردار بہت محنت سے تراشے ہیں۔ جہاں ان کا مزاج اور رویہ ایک دوسرے سے متضاد ہے۔ مگر سکول کی بہتری کے لیے ہم خیال ہیں۔ نرمی اور سختی کے امتزاج کو اشفاق احمد نے بہت خوبصورتی سے اس افسانے میں پیش کیا ہے کیونکہ یہ دنیا خیر اور شر کی قوتوں کا مجموعہ ہے۔ تو اس میں صرف ایک طرح کے لوگ اور ایک ہی مزاج کے لوگوں سے نظام کو چلانا ذرا مشکل ہو جاتا ہے تو ایک سکول کے اندر دو مختلف مزاج کے لوگوں کو پیش کیا ہے۔ جس سے افسانے میں قارئین کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور کہانی مربوط طریقے سے آگے بڑھتی ہوئی انجام تک پہنچ جاتی ہے۔

للاماموں، ڈیڈی (اجلے پھول)

"اجلے پھول" کے مرکزی کردار انجم بھائی اور آپنی ہیں۔ ان کے ساتھ ضمنی کرداروں میں ڈیڈی اور للاماموں قابل ذکر ہیں۔ ڈیڈی آپنی کے والد ہیں اور گھر کے سربراہ ہیں۔ چند ایک مواقع پر ہی رونمائی کراتے ہیں اور زیادہ دیر افسانے میں موجود رہتے ہیں اور للاماموں کی بھی یہی حیثیت ہے مگر اشفاق احمد کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے ضمنی کرداروں کو بھی جاندار اور فعال بنانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں۔ ضمنی کرداروں کو بھی کبھی مکمل جزئیات کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور کبھی سرسری سے ذکر کے بعد کسی واقعہ میں نہایت اہم رول ان کو دے دیتے ہیں کہ قارئین کو یاد رہ جاتے ہیں۔ ڈیڈی کا کردار نفیس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے چیدہ چیدہ اوصاف کو ان کی شخصیت کے خدوخال میں نمایاں کیا گیا ہے۔ مزاحیہ کردار للاماموں کا تعارف کچھ اس طرح کرایا گیا ہے۔

انہی دنوں کی بات ہے گرمیوں میں ہمارے ہاں للاماموں آگیا۔ یہ آلا جی کا رشتہ کا بھائی تھا اور آپنی سے دو سال چھوٹا۔ ہم اسے للاماموں اس لیے کہتے تھے کہ ایک تو اس کا رنگ کنہیا جی ایسا تھا۔ دوسرا بی اے کا

طالب علم ہونے کے باوجود بڑا میاں آدمی تھا۔ چالیس چالیس مضمون کی آزاد نظمیں رقم کرتا اور ان کے نیچے "باقی پھر" لکھ دیتا۔^{۹۶}

للاماموں کے تعارف سے واضح ہوتا ہے کہ اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں حقیقی انسانوں کے کرداروں کو پیش کیا ہے۔ وہ کسی ایسے انسان کی تصویر کشی نہیں کرتے جو زمین کے علاوہ کسی دوسرے سیارے کی یا آسمانی مخلوق ہو۔ زمین پر چلنے پھرنے والا عام انسان ان کے افسانوں میں نظر آئے گا۔ یہ ایک نوجوان لڑکے کا کردار ہے جو بی اے کا طالب علم ہے اور طویل نظمیں رقم کرنے کا شغف رکھتا ہے۔ اس عمر میں جسمانی و جذباتی تبدیلیوں کی وجہ سے نوعمر لڑکوں میں جنس کی کشش بہت بڑھ جاتی ہے اور وہ لطیف جذبوں کے اظہار کے لیے شعر و شاعری میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ کیونکہ شاعری میں جذبات کو بہت خوبصورتی سے لفظوں کے قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ کچھ اس طرح کی کیفیت سے یہ نوجوان بھی دوچار ہے۔ طویل نظمیں لکھنے والا یہ نوجوان اس عمر میں بھی سنجیدہ اور سمجھدار سا لڑکا ہے۔ گھر میں جب مجلس اہل قلم کی بنیاد رکھی جاتی ہے تو باری باری صدارت مختلف لوگ کرتے ہیں۔ ڈیڈی کا کردار بہت کم وقت کے لیے نمودار ہوتا ہے۔ جیسا کہ ان جملوں سے واضح ہوتا ہے۔

پھر ایک مرتبہ للاماموں کی صدارت میں مجلس منعقد ہوئی۔ ڈیڈی دورے سے آئے ہوئے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ اہل قلم نہیں تھے۔ ہم نے انھیں "اسپیشل کیس" بنا کر محفل میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔^{۹۷}

ڈیڈی عموماً دورے پر ہی رہتے تھے۔ لیکن اپنی اولاد کی تربیت اور خوشیوں میں شریک ہونا بہت ضروری سمجھتے تھے۔ اپنے بچوں کی خوشی کے لیے ہی وہ ان کی اپنی بنائی ہوئی گھر کی مجلس اہل قلم میں شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح والدین کو بچوں کے خیالات سے آگاہی ملتی رہتی ہے۔ نیز بچوں میں پنپنے والے جذبات اور نئے رجحانات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اولاد میں آج کل کون سا بچہ کس زاویے سے سوچ رہا ہے اور اس کا نقطہ نظر کس حد تک حقیقت سے قریب تر ہے۔ اس طرح والدین اپنی اولاد کی بہتر طریقے سے نگرانی، رہنمائی اور بھلائی کر سکتے ہیں۔ چونکہ سماج میں سوچنے اور سمجھنے کے زاویے بھی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے بتدریج ہونے والی تبدیلیوں کا اندازہ لگانا اور اس کے منفی اثرات سے بچانا والدین کی اہم ذمہ داری ہے۔ یہاں پر ڈیڈی کا کردار اس ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے نظر آتا ہے۔ کہ وہ کس طرح بچوں میں گھل مل کر ان کے خیالات کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جب انھوں نے اپنی اولاد اور نئی نسل کے مایوسی، درد، کرب اور دکھی جذبات سے آگاہی حاصل کی تو انھیں شدید دھچکا لگا اور ان کی تجویز پر مجلس اہل قلم کو ختم کر دیا گیا کہ عملی جدوجہد اور زندگی کے عملی پہلو کو دیکھا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ زندگی کی ناکامیوں کو سر پر سوار کرنے

کی بجائے کامیابی کے لیے مزید نئی راہیں دریافت کرنے کی اہمیت پر زور دیتا کہ حالات کی تبدیلی کا انتظار کرنے کی بجائے کامیابی کے راستے کی مشکلات اور سختیاں جھیلیں تاکہ منزل حاصل ہو سکے۔ دیکھا جائے تو یہ دونوں ضمنی کردار نہایت کم ظاہر ہونے کے باوجود اپنا گہرا اثر چھوڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

امینہ کے ڈیڈی، مانی (برکھا)

ویسے تو یہ افسانہ دونو عمر لڑکیوں کے جذبات و احساسات کی کہانی ہے جو کہ دسویں جماعت کے امتحانات سے فارغ وقت گزار رہی ہیں۔ مگر دو ضمنی کردار ایسے ضرور ہیں جو کہانی میں ظاہر ہوتے ہیں اور کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ امینہ کے ڈیڈی ان میں سے ایک ہیں۔ یہ ایک شفیق والد ہیں جن کو اپنی اولاد تو عزیز ہے ہی مگر اولاد کی سہیلیوں، دوستوں اور تعلق داروں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ امینہ کے ڈیڈی کو والد کے اس روپ میں دکھایا گیا ہے کہ وہ اولاد کے لیے، ان کی تعلیم کے لیے اور اچھے رہن سہن کے لیے بڑی محنت اور تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ اس کا رویہ اپنی اولاد سے نہایت مشفقانہ ہے۔ امینہ اسی بنا پر ان سے ہر روز پنک پھانے جانے کا مطالبہ کرتی ہے مگر وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ اس سخت گرمی کے موسم میں ایسا نہیں ہو سکتا بلکہ بارش کا انتظار کرنے کو کہتے ہیں تاکہ موسم سہانا ہو تو سیر سپاٹے کا مزہ لیا جاسکے۔ ورنہ اس گرم موسم میں انسان گھر بیٹھے بیٹھے بے حال ہو جاتا ہے۔ وہ امینہ کی سہیلی سے بھی وقتاً فوقتاً مخاطب ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ وہ کام سے واپس آتے ہیں تو امینہ کی سہیلی ثریا بھی موجود تھی۔

امینہ کے ڈیڈی اندر آ گئے۔ پنکھے کے ریگولیٹر سے نگاہیں اٹھاتے ہی انھوں نے ثریا کو دیکھا تو دور سے

پکارے۔ "کو بھی ثریا، کچھ تمہارے رزلٹ کا پتہ چلا؟ جی ابھی تو نہیں۔ ثریا نے سمٹ کر جواب دیا۔

پھر بھی کتنے نمبر آجائیں گے؟ جی یہی سیکنڈ ڈویژن بن جائے گی بس۔" اور کیا چاہیے " انھوں نے

مسکرا نے کی کوشش کی اور مسکرا کے رہ گئے۔^{۹۸}

امینہ کے ڈیڈی کا کردار اشفاق احمد نے اس طرح پیش کیا کہ وہ نہایت شفیق اور ملنسار طبیعت کے مالک ہیں۔ اپنی اولاد کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اولاد کے دوستوں، سہیلیوں کو بھی اس طرح کی محبت اور شفقت سے نوازا جائے کہ ان کو اپنائیت کا احساس ہو۔ وہ اس گھر کو بھی اپنا گھر سمجھیں۔ اس طرح کے اقدامات سے بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور دوستانہ ماحول میں اولاد کے بگڑنے کا اندیشہ اور خطرہ کم سے کم ہو جاتا ہے کیونکہ والدین بچوں کے معمولات زندگی پر نہ صرف نظر رکھے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ ان میں شامل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ تمام سرگرمیوں میں شرکت کے علاوہ وہ اپنی اولاد کے ملنے ملانے والوں سے بھی میل جول اور رابطہ رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کو بچوں کی صحبت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ اس طرح غیر محسوس طریقے سے نگرانی ہوتی رہتی ہے۔ سخت گرمی کے اس موسم میں جب ساری

مخلوق بارش بادل کا انتظار کر رہی ہوتی ہے کہ موسم کی شدت میں کمی آجائے تو امینہ کو پکنک پہ جانے کا شوق چڑھا ہوا ہے اور وہ ڈیڈی سے ضد کرتی رہتی ہے۔ ڈیڈی اسے ٹالتے اور سمجھاتے ہیں مگر وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تو ڈیڈی ثریا سے مدد کچھ اس طرح طلب کرتے ہیں۔

پھر پرسوں ہم پکنک پہ چلیں گے۔ امینہ نے الٹی میٹم دیا۔ اس گرمی میں؟ ڈیڈی نے گریبان کے بٹن کھولتے ہوئے کہا "کوئی چھینٹا پڑے تو مزہ آئے۔ ایسی گرمی میں تو اپنا ہی بھرتہ ہو جائے گا"۔ نہیں ڈیڈی ہم ضرور جائیں گے۔ امینہ ضد کرنے لگی۔ اسے سمجھاؤ ثریا، بھلا یہ موسم کوئی پکنک پہ جانے کا ہے؟^{۹۹}

یہاں ڈیڈی اپنی بیٹی کو سمجھانے کے لیے اس کی دوست ثریا کو مدد کے لیے کہتے ہیں۔ یہاں ڈیڈی کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ ان کا رویہ اپنی اولاد کے ساتھ مشفقانہ ہونے کے ساتھ ساتھ دوستانہ بھی ہے۔ وہ دوستوں کی طرح اسے سمجھا رہے ہیں نہ کہ کوئی سختی اور درشتی سے کام لیا جا رہا ہے۔ کیونکہ اس طرح ایک صحت مند اور صحیح معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ڈیڈی کا کردار بھی دلکشی اور تاثر قائم کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ مانی اس افسانے کا ایک اور ضمنی کردار ہے جو افسانے کے منظر نامے پر افسانے کی وجہ تسمیہ برکھا کی ضرورت و اہمیت اور فوائد و ثمرات کو سامنے لانے کا سبب ہے۔ برکھا برسات کے موسم کی بارش کو کہتے ہیں جس کا شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا اور مخلوق خدا گرمی سے بے حال تھی اور اس کے نقصانات پودوں/درختوں کے جھلس جانے، سڑ جانے اور طرح طرح کی بیماریوں کی صورت میں سامنے آرہے تھے۔ انسانوں میں سخت گرمی کی بدولت بیماریاں پھیلتی جا رہی تھیں۔ مانی ثریا کا چھوٹا بھائی ہے اور گرمی کے موسم میں اُسے گرمی دانے نکل آتے ہیں۔ وہ دانے چونکہ موسمی شدت کی بنا پر نکلتے ہیں اور بارش و بادل کی آمد سے ہی ان کا علاج کیا جاسکتا ہے مگر مانی اس سلسلہ میں کچھ اور ہی طریقہ اختیار کرتا ہے۔

مانی سکول سے آتے ہی دیوار کے ساتھ کمر کھانے لگتا تو بھائی جان اپنے ننگے پیٹ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتے ہوئے کہتے۔ بیٹا یہ گرمی کے دانے ہیں۔ دیواروں سے رگڑے لگا کر نہیں مٹتے۔ بادلوں کی پھوار مانگتے ہیں۔ جس دن اپنے کو ارٹھر سے دس میل پرے بارش ہو گئی تیرا پنڈا مچھل سا نکل آئے گا۔ لیکن مانی یہاں تک کھجاتا کہ خون نکل آتا۔^{۱۰۰}

ایک بچے کی کیفیات اور حرکات کو بطور نمونہ پیش کر کے اشفاق احمد نے افسانے کی مجموعی فضا اور تاثر قائم کیا ہے۔ بچے کی نفسیاتی گہرائیوں کا مشاہدہ اور تجزیہ کرنا اشفاق احمد پہ ختم ہے اور انھوں نے مانی کے کردار کے ذریعے اسے ثابت بھی کیا ہے کیونکہ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ جب گرمی دانوں کو کھانے سے تنگ آجاتے ہیں تو دیوار کا سہارا لیتے ہیں یا زمین پہ

لوٹ پوٹ جاتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ مانی کے کردار کو کسی طرح بھی ایک کمزور کردار نہیں قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ وہ اپنے کردار کو بخوبی نبھاتا نظر آتا ہے۔

اشفاق احمد کے کرداروں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں پہ خاصی توجہ دیتے ہیں اور ان کا پیکر تراشنے میں محنت کرتے ہیں۔ ان کے کردار حقیقی انداز لیے ہوئے ہمیں معاشرے کا حصہ لگتے ہیں اور ان میں مصنوعی پن نہیں دکھائی دیتا ہے۔ ان کے کرداروں میں کشش اور دلکشی دکھائی دیتی ہے کہ قاری ان کے حصار میں چلا جاتا ہے۔ اشفاق احمد کرداروں میں ڈوب کر لکھنے والے افسانہ نگار کے طور پہ سامنے آئے ہیں۔ اسی لیے افسانے کے منظر نامے پہ وہ اپنی الگ شناخت اور پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے جہاں اشفاق احمد نے منفرد طرز کے افسانے لکھے وہیں پر انھوں نے کردار نگاری میں بھی اپنے فن کا لوہا منوایا اور دو افسانے میں ایسے کردار پیش کرنے میں کامیاب رہے جو ان کو تادیر زندہ اور یاد رکھنے کا باعث ہوں گے۔ ان کے فن پاروں کو جہاں عوام میں مقبولیت نصیب ہوئی وہیں پر ناقدین اور معاصر ادیبوں کے ہاں بھی پذیرائی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اشفاق احمد نے کرداروں میں ہر قسم اور ہر درجے کے لوگوں کو نمائندگی دی ہے۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں موضوع کو دیکھا جائے تو محبت و سنج تر مفہوم کے ساتھ موجود ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ”توبہ“ اسی حوالے سے لکھا گیا ہے۔ مگر اشفاق احمد محبت برائے محبت کے قائل نہیں ہیں بلکہ محبت کو ایک ایسی قوت اور طاقت کا نام دیتے ہیں جو دل کی دنیا بدل دینے پہ قادر ہے اور اسی جذبے کے بدولت انسان میں مثبت تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ ”توبہ“ کا مرکزی کردار اعجاز لیکھا کے کہنے پہ سگریٹ نوشی سے توبہ کر لیتا ہے حالانکہ ماں باپ کی ہر شرط، دھمکی، پیار اور انعام کا کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ افسانہ ”رات بیت رہی ہے“ بھی محبت کے جذبے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں اشفاق احمد نے محبت کے جذبے کے آفاقی رنگ کو نمایاں کیا ہے۔ اس میں ان کے کردار مغربی معاشرے سے لیے گئے ہیں۔ امریکی ہوا باز پیٹر اور اس کی محبوبہ مارگریٹ اس افسانے کے کردار مغربی دنیا سے لیے گئے ہیں۔ ان کی مدد سے اشفاق احمد ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ محبت کا جذبہ مشرق و مغرب کی جغرافیائی حدود و قیود سے آزاد ہے اور دنیا کے ہر کونے میں موجود ہے بلکہ اپنی حرارت اور تپش بھی دکھاتا ہے۔ محاذ پہ موجود امریکی ہوا باز پیٹر اپنی محبوبہ کی فرمائش پہ ہی ہوائی فوج میں بطور پائلٹ بھرتی ہوا تھا اور اب وطن سے میلوں دور اپنی جان قربان کر رہا تھا۔ اس نے فوجی وردی اس لیے پہنی تھی کیونکہ مارگریٹ کو پسند تھی۔ اشفاق احمد اپنے کرداروں کے ذریعے مثبت اور اچھا تاثر قارئین پہ چھوڑ جاتے ہیں۔

افسانہ ”فہیم“، ”گل ٹریا“ اور ”تلاش“ کے مرکزی کردار ننھے بچے ہیں جن کے گرساری کہانی گھومتی ہے۔ اس طرح عمر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نو جوان، ادھیڑ عمر، بوڑھے کرداروں کے ساتھ ساتھ اشفاق احمد نے بچوں کو بھی افسانوں

میں مرکزی کردار کے طور پر موقع دیا ہے۔ فہیم ایک حساس بچہ ہے جو نانی اماں سے کہانی سن رہا ہے۔ اُس کے ساتھ اس کے دیگر بہن بھائی موجود ہیں مگر یہ کہانی میں دلچسپی اور اثر لے رہا ہے اور معصومیت سے سوال جواب کرنے کے ساتھ اپنا خاص رد عمل بھی دیتا ہے۔ جو اس کی ذہانت کی دلیل ہے۔ افسانہ ”تلاش“ کا مرکزی کردار ننھا احسان اپنے کتے جیکی سے بے انتہا پیار کرتا ہے۔ ”گل ٹریا“ افسانہ میں ننھا بچہ ہی ساری کہانی کو نتیجہ کن صورت حال تک لے کے آتا ہے۔ یہاں اشفاق احمد بچوں کے ساتھ دیگر مخلوقات کو بھی ایک خاص تناظر میں اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔ اشفاق احمد کے ہاں محبت کل انسانیت سے محبت جیسے جذبے کا نام ہے۔ وہ اس جیکی کے کردار کی مدد سے اپنا پیغام دینا چاہتے ہیں کہ عزیزوں کی چیزیں بھی عزیز اور پیاری ہوتی ہیں اور ان کی قدر کرنی چاہیے۔ نہیں تو بعض اوقات ان چیزوں کی وجہ سے عزیز بھی کھو جاتے ہیں۔ جیسے اس افسانے میں جیکی کے گم ہو جانے کی وجہ سے ننھا احسان بھی کھو جاتا ہے۔

افسانہ ”سنگدل“، ”بابا“ اور ”شب خون“ کے کردار ایک منفرد پیغام کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ ان افسانوں کے کرداروں میں پچی، بیٹرس، ایلن غیر مسلم کردار ہیں لیکن اپنی بے مثال قربانی اور مثبت رویے کی بنا پر اپنا خاص مقام بنانے میں کامیاب رہتی ہیں۔ ان کرداروں میں مذہبی تعصب نہیں پایا جاتا ہے اور یہی منشا اشفاق احمد کی بھی ہے کہ وہ بلا تفریق مذہب اور بلا تخصیص جغرافیائی حد بندی کے، صرف انسانیت کا علم تھا مے نظر آتے ہیں اور انہی اقدار کے فروغ کے لیے سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ افسانہ ”گڈریا“ کا مرکزی کردار داؤجی کردار نگاری کے فن کی رُو سے ایک بے مثال اور یادگار کردار ہے۔ یہ ہمہ جہت خصوصیات کا حامل کردار ہے جو کہ اپنی خوبیوں کی بدولت پورے افسانے پہ چھایا ہوا نظر آتا ہے بلکہ انھی خصائص کی بنا پر اردو ادب کے یادگار کرداروں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔ داؤجی بیک وقت استاد، صوفی، باپ، خاوند، شاگرد اور دوست کے روپ میں دکھائی دیتا ہے اور شخصیت کے ہر پہلو میں کمال کا رنگ بھرتا ہے کہ اگر صرف وہی پہلو افسانے کا حصہ ہوتا تب بھی داؤجی کا کردار ایک یادگار ہوتا۔ مگر اتنے پہلو ایک کردار میں پیش کرنا اشفاق احمد کی فنی مہارت کا بین ثبوت ہے کہ اس طرح کا کردار افسانے کی کہانی اور روانی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کی دلکشی اور جاذبیت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

افسانہ ”سنگہ“، ”ایل ویرا“ اور ”بندرا بن کی کُنج گلی“ میں ”معاشرے میں موجود طبقاتی تفریق کو سامنے لانے میں مدد دیتے ہیں۔ ان افسانوں کے کرداروں کی بدولت اشفاق احمد نے طبقاتی لکیر کو بہت خوبصورت انداز میں نمایاں کیا ہے۔ افسانہ ”سنگہ“ کا سرور، ”ایل ویرا“ افسانہ کی ایل ویرا اور ”بندرا بن کی کُنج گلی“ میں ”افسانے کا سجاوٹ مچھیرے کا بیٹا نمدارا معاشرے کی مخصوص سوچ کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ یہ کردار ہمارے معاشرے کی مجموعی سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہاں اشفاق احمد مادیت پرست معاشرے کی خاص سوچ کو کرداروں کے ذریعے واضح کرتے ہیں کہ اس معاشرے

میں خلوص، قابلیت، تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں ہے اگر آپ کا تعلق پست طبقات سے ہے تو۔ کیوں کہ اس معاشرے پہ بالادست طبقے کی مخصوص سوچ کی اجارہ داری ہے اور صرف ان کا ہی کہا ہوا سچ مانا جاتا ہے۔ افسانہ "امی" ماں کی مامتا کے جذبے کو سامنے لانے کا ذریعہ ہے۔ افسانہ "صفدر ٹھیلا" ایک طالب علم کی کہانی ہے۔ ان دونوں افسانوں میں موجود منفی کرداروں کے ذریعے اشفاق احمد ایک خاص پیغام دینا چاہتے ہیں کہ نیکی اور اچھائی کا جذبہ ہر اچھے برے انسان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ وہ صرف اور صرف برائی کی مثال ہی کے طور پہ ان کرداروں کو پیش نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے اندر چھپے نیک انسان کو بھی سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اشرف المخلوقات بذات خود اچھا یا برا نہیں بلکہ یہ صورت حال اور حالات ایسے ہوتے ہیں جو ان کو اس نہج پہ لے جاتے ہیں۔ ورنہ اُن کے اندر بھی اچھائی کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ افسانہ "امی" کا مسعود اس کی عمدہ مثال ہے۔

"توتا کہانی"، "اُجلے پھول" اور "برکھا" کے کردار محبت کی ادھوری کہانی کو بیان کرتے ہیں۔ یہ کردار محبت کے لیے قربانی اور ایثار کا جذبہ لیے ہوئے ہیں۔ "توتا کہانی" کا کردار حامد خجستہ کی عزت و عصمت بچانے کی خاطر بلند مینار سے چھلانگ لگا دیتا ہے۔ اشفاق احمد کے ہاں محبت صرف دو جسموں کے ملنے یا کسی کو پالینے کا نام ہی نہیں ہے بلکہ قربانی اور ایثار کا نام ہے۔ جو کسی بڑے اور عظیم مقصد کے لیے دی جائے۔ "اُجلے پھول" کا کردار انجم جان سے چلا جاتا ہے مگر عرصہ دراز سے دور و ٹھٹھے ہوئے خاندانوں کو ملانے کا باعث بن جاتا ہے۔ اشفاق احمد کے کردار محبت کے سطحی معیار سے بلند تر صورت میں ملتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اشفاق احمد کے مردانہ کردار تو ان صورت میں افسانوں پہ چھائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو کہ قارئین کو نہ صرف اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں بلکہ ناقدین اور معاصرین کو بھی بہت متاثر کرتے ہیں۔

حوالہ جات

- ۱۔ ڈاکٹر طاہر طیب، لاہور میں اردو افسانے کی روایت، مثال پبلشرز فیصل آباد ۲۰۱۵ء ص ۲۴۸
- ۲۔ اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۱۰
- ۳۔ ایضاً، ص ۱۳
- ۴۔ ایضاً، ص ۱۹
- ۵۔ ایضاً، ص ۲۴
- ۶۔ ایضاً، ص ۳۲
- ۷۔ ڈاکٹر محمد عالم خان، "اردو افسانے میں رومانی رجحانات" علم و عرفان پبلشرز لاہور ۱۹۹۸ء ص ۴۸۲
- ۹۔ ڈاکٹر مسعود رضا خاکی، "اردو افسانے کا ارتقاء"، مکتبہ خیال لاہور ۱۹۸۷ء ص ۳۷۳
- ۱۰۔ حشمت جہاں ناز، اردو نثر نگاری (ابتداء سے آج تک اردو نثر کا جائزہ) یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار پشاور سن ۱۲۸
- ۱۱۔ اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۴۲
- ۱۲۔ ایضاً، ص ۵۳
- ۱۳۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۱ء ص ۱۳۹
- ۱۴۔ اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۹۲
- ۱۵۔ ایضاً، ص ۹۸
- ۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۴
- ۱۷۔ عبدالقادر سروری، کردار اور افسانہ، حصہ دوم، مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن ۱۹۲۹ء ص ۷۰
- ۱۸۔ اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۱۳۲
- ۱۹۔ انوار احمد، محبت کی نظریہ سازی یا صنایع، (مضمون) مشمولہ راوی اشفاق نمبر جی سی یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء ص ۵۲
- ۲۰۔ اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۱۳۵
- ۲۱۔ اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۱۵۶
- ۲۲۔ ایضاً، ص ۷
- ۲۳۔ ایضاً، ص ۱۳
- ۲۴۔ ایضاً، ص ۱۲

- ٢٥- ايضاً، ص ١٩
٢٦- ايضاً، ص ٢١
٢٧- ايضاً، ص ٢٣
٢٨- ايضاً، ص ٣٠
٢٩- ايضاً، ص ٣٥
٣٠- ايضاً، ص ٣٧
٣١- ايضاً، ص ٣٧
٣٢- ايضاً، ص ٤٠
٣٣- ايضاً، ص ٤٠
٣٤- ايضاً، ص ٣٨
٣٥- ايضاً، ص ٤٠
٣٦- ايضاً، ص ٥٢
٣٧- ايضاً، ص ٥٢
٣٩- ايضاً، ص ٥٦
٣٩- ايضاً، ص ٥٨
٤٠- ايضاً، ص ٦٣
٤١- ايضاً، ص ٦٣
٤٢- ايضاً، ص ٧٩
٤٣- ايضاً، ص ٨٠
٤٤- ايضاً، ص ٨٩
٤٥- ايضاً، ص ٨٢
٤٦- ايضاً، ص ١٢٢
٤٧- ايضاً، ص ١٢٢

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۷۹

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۸۴

۵۳۔ ڈاکٹر طیب طاہر، لاہور میں اردو افسانے کی روایت، مثال پبلشرز فیصل آباد ۲۰۱۵ء، ۲۴۹

۵۴۔ ڈاکٹر انور سدید، افسانہ نگار اشفاق احمد کے لیے تعزیت (مضمون) مشمولہ ماہنامہ ادب لطیف جلد نمبر ۷۰ شمارہ نمبر

۵ لاہور مئی ۲۰۰۵ء، ص ۲۹

۵۵۔ آغا ناصر، اشفاق احمد مضمون مشمولہ ماہنامہ ادب لطیف جلد نمبر ۷۰ شمارہ نمبر ۵ لاہور مئی ۲۰۰۵ء، ص ۲۱

۵۵۔ اشفاق احمد، اجلے پھول، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۹

۵۶۔ ایضاً، ص ۲۷

۵۷۔ ایضاً، ص ۳۹

۵۸۔ ایضاً، ص ۱۹

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۸

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۱

۶۱۔ ایضاً، ص ۲۵

۶۲۔ ایضاً، ص ۳۱

۶۳۔ ایضاً، ص ۴۹

۶۴۔ خالد مسعود خان، مضمون گڈ ریا کا داؤ جی ماہنامہ ادب لطیف جلد نمبر ۷۰ شمارہ نمبر ۵ لاہور مئی ۲۰۰۵ء، ص ۳۳۴

۶۵۔ اشفاق احمد، اجلے پھول، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۵۲

۶۶۔ ایضاً، ص ۵۴

۶۷۔ ایضاً، ص ۵۵

۶۸۔ ایضاً، ص ۶۵

۶۹۔ ایضاً، ص ۷۰

۷۰۔ ایضاً، ص ۷۷

- ۱۔ ایضاً، ص ۹۹
- ۲۔ ایضاً، ص ۱۰۳
- ۳۔ ایضاً، ص ۱۰۷
- ۴۔ مرزا حامد بیگ، افسانے کا منظر نامہ، مکتبہ عالیہ لاہور س ن ص ۷۹
- ۵۔ اشفاق احمد، اجلے پھول، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۱۲۱
- ۶۔ ایضاً، ص ۱۲۴
- ۷۔ ایضاً، ص ۱۲۸
- ۸۔ ایضاً، ص ۱۳۶
- ۹۔ ایضاً، ص ۱۴۷
- ۸۰۔ ایضاً، ص ۱۴۹
- ۸۱۔ ایضاً، ص ۱۵۵
- ۸۲۔ ایضاً، ص ۱۰
- ۸۳۔ ایضاً، ص ۱۶
- ۸۴۔ ایضاً، ص ۱۷
- ۸۶۔ ایضاً، ص ۲۰
- ۸۶۔ ایضاً، ص ۲۲
- ۸۷۔ ایضاً، ص ۳۵
- ۸۸۔ ایضاً، ص ۴۶
- ۸۹۔ ایضاً، ص ۴۹
- ۹۰۔ ایضاً، ص ۴۹
- ۹۱۔ ایضاً، ص ۵۲
- ۹۲۔ ایضاً، ص ۵۳
- ۹۳۔ ایضاً، ص ۵۹
- ۹۴۔ ایضاً، ص ۹۹

٩٥- ايضاً، ص ٩٩

٩٦- ايضاً، ص ١١٢

٩٧- ايضاً، ص ١١٦

٩٨- ايضاً، ص ١٣٠

٩٩- ايضاً، ص ١٣٠

١٠٠- ايضاً، ص ١٣٢

اشفاق احمد کے افسانوں کے نسوانی کردار

الف: "ایک محبت سو افسانے" کے مرکزی کردار

لیکھا (توبہ)

"توبہ" افسانے کا مرکزی کردار لیکھا رومانوی کردار ہے جس کی محبت میں اعجاز نامی لڑکا گرفتار ہو جاتا ہے اور لیکھا نوجوان عاشق کو سگریٹ نوشی جیسی بری عادت سے توبہ کروا کے یہ بد عادت چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جیسا کہانی کا ماحول ہوتا ہے افسانہ نگار اسی طرح کے کردار تخلیق کرتا ہے۔ اس کے افکار و خیالات، عادات و اطوار اور مشاہدات کی بنا پر اسے منفرد حیثیت دلاتا ہے۔ لیکھا کے کردار کی تخلیق اور تزئین میں اشفاق احمد نے کمال مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ عام گھریلو زندگی گزارنے والی لڑکی لیکھا کی آرزوؤں اور ارمانوں کی عکاسی بہت خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ اس کردار میں ایک عام مشرقی عورت کی جھلک واضح نظر آتی ہے جس کے اندر اچھائی برائی کا پختہ تصور موجود ہے جو کہ محبوب میں پائی جانے والی بری خصلت کو بدل دینے کی ہر ممکن کوشش میں لگی نظر آتی ہے۔ زندگی اور معاشرے میں موجود چھوٹی چھوٹی برائیوں اور ناگواریوں کو غیر محسوس طریقے سے تبدیل کرنے کا مصمم ارادہ اور حوصلہ لیکھا کے اندر دکھائی دیتا ہے۔ اشفاق احمد محبت کی پاکیزگی پہ یقین رکھنے والے ادیب ہیں لہذا وہ لیکھا کے کردار کی باطنی پاکیزگی اور نیک سیرتی کو خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ لیکھا ایک معصوم اور خوش ادا لڑکی ہے جس کی اداؤں کا اسیر اعجاز ہو جاتا ہے۔ اس کا تعارف مرکزی کرداریوں کرتا ہے۔

وہ دلہنوں کی سہیلی تھی۔ میں کئی چھٹیوں میں خالہ کے ہاں آیا کرتا تھا۔ یہیں سے اسے

جاننے لگا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا۔ رنگ سانولا، ناک بہت ستواں اور نیم باز لمبی پلکیں

بند ہوتی چھوٹی موٹی کی طرح اتنی پیاری کہ چھو لینے کو جی چاہتا۔^۱

افسانے کے آغاز سے ہی لیکھا کا تعارف سامنے آ جاتا ہے اور افسانے میں اس کی حیثیت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جا کر ہو جاتا ہے جس میں اس کی سوچ بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ شادی کے دنوں میں ان دونوں کی ملاقاتیں، ان ہر دو افراد کی الگ الگ سوچ اور فکر میں تضاد کو واضح کرتی ہیں۔ جس کا اہم اثر ہمہ جہت کالموں سے بھی ہو جاتا ہے مگر کہانی کا عنصر بڑی روانی سے رواں دواں نظر آتا ہے۔ یہاں پر حرکات و سکنات اور اعمال و افعال کے ذریعے لیکھا کی شخصیت کے نیک و بد ہونے کا احساس دلایا گیا ہے۔ اس کا مزاج گہرا اور انسانی زندگی کی حقیقتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں بھی وہ نوجوان کی محبت میں

گرفتار نظر آتی ہے مگر کبھی بھی خاص حد سے آگے نہیں جاتی ہے۔ وہ مرکزی کردار کی عادت بد سگریٹ نوشی سے تنگ ہے۔ وقتاً فوقتاً اسے آگاہ کرتی رہتی ہے، روکتی ٹوکتی ہے مگر اعجاز باز نہیں آتا ہے تو بالآخر یہ اعجاز کو احساس دلانے کے لیے خود سگریٹ سلگالیتی ہے۔

ایک چھوٹا سا کش کھینچ کر اس نے گلے پھلائے اور پھر فوراً سانس چھوڑ دیا۔ ذرا سی دیر مجھ کو دیکھا۔ پھر ایک اور کش لیا اور ذرا جھک کر سارا دھواں میرے منہ میں دھکیل دیا۔ شاید ایک دفعہ پھر ایسے ہی ہوتا مگر نکاح کے چھوہارے اوپر اچھل اچھل کر شامیانے کی چھت سے ٹکرائے۔ مبارک باد کی صدا بلند ہوئی۔ باجازور سے بجا۔ وہ ٹپٹائی جلتا ہوا سگریٹ تپائی پر پھینک کر برآمدے میں بھاگ گئی۔^۲

سگریٹ سلگانے سے لے کر کش لینے اور دھواں چھوڑنے تک کی واردات جو اعجاز کے دل و جان پر گذرتی ہے اسی کے نتیجے میں اسے سگریٹ نوشی جیسے عمل سے نفرت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنی برائی اور خامی کو چھوٹا سمجھتا ہے اور نظر انداز کرتا رہتا ہے مگر جب کسی پیارے کو اس میں مبتلا دیکھتا ہے، اپنی آنکھ سے خود نظارہ کرتا ہے تو دل کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔ اسی کیفیت سے لیکھا نہایت ہوشیاری سے اعجاز کو گذارتی ہے تو اسے احساس ہو جاتا ہے۔ یہی اس کردار کی خوبی تھی اور یہی اس کی کامیابی کا سبب بن جاتی ہے۔

نانی اماں (فہیم)

"فہیم" افسانے میں پوری کہانی نانی اماں کے گرد گھومتی ہے جو کہ اصلاحی کردار ہے۔ یہ افسانہ داستانی رنگ لیے ہوئے ہے۔ کچھ عرصہ قبل مائیں اپنے بچوں کو لوری اور گیت سنایا کرتی تھیں اور بچے لوری سنتے سنتے سو جاتے تھے یا پھر گھر کے بڑے بوڑھے، دادا دادی، نانا نانی، ناصحانہ انداز میں قصے کہانیاں، حکایات، روایات اور ماضی کے واقعات کو دہرایا کرتے تھے۔ ایسے قصے کہانیاں اور داستانیں جو سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی تھیں۔ یہ افسانہ بھی اسی طرز کا ہے جس میں نانی اماں رات کو سونے سے قبل کہانی سنار ہی ہیں۔ مگر یہ کہانی ان کی اپنی ہے۔ ان کا ماضی جس میں نانا ابو، ماموں، خالہ وغیرہ کے حالات زندگی اور چیدہ چیدہ واقعات بتائے جا رہے ہیں۔ اشفاق احمد کے کرداروں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے کرداروں کا بہت گہرا تعلق اور رابطہ اپنی مٹی سے ہوتا ہے۔ اس افسانے میں بھی یہی دیکھا گیا ہے۔ اشفاق احمد کے کرداروں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ قاری کے دل میں مستقل اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ قاری کو اتنا متاثر ضرور کرتے ہیں کہ اس کی یادداشت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ افسانہ نگار نے جہاں سماجی مسائل کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے وہیں اخلاقی و اصلاحی پہلو کو بھی مد نظر رکھا ہے۔ انھوں نے اصلاح اور مقصد کو فن کے پس منظر کے طور پر

ضرور رکھا ہے مگر کبھی بھی کہانی پر حاوی اور اثر انداز نہیں ہونے دیا ہے۔ یہاں پر بھی نانی اماں بچوں کو کہانی سنانے کے دوران جب بچے ایک دوسرے کو تنگ کرتے ہیں اور سونے نہیں دے رہے تو نانی اماں یوں مخاطب ہوتی ہیں۔

بھائی جان تم میرے ساتھ سو جاؤ۔ پروین نے سلیم کو مشورہ دیا۔ ناتیرے ساتھ کیوں سوئے؟

نانی اماں چمک کر بولیں۔ بھائی بھائی جھگڑا ہی کرتے ہیں۔ تمہارے نانا اور اس کے بھائی ایک دوسرے سے عمر بھر جھگڑتے ہی تو رہے۔^۳

یہاں پر نانی اماں اپنے نواسے نواسیوں فہیم، نعیم، سلیم، نسرین اور پروین سے مخاطب ہیں۔ بچے کہانی سنتے ہوئے ایک دوسرے کو تنگ کر رہے ہیں۔ کبھی کوئی رضائی کا کونہ کھینچ لیتا ہے تو کبھی ٹانگ ایک دوسرے پر رکھنے سے جھگڑے کی نوبت آ جاتی ہے۔ یہاں پر نانی اماں مدبرانہ انداز میں چھوٹی موٹی خطاؤں سے درگزر کرنے کا درس دیتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہمارے دور میں بھی ہو جایا کرتے تھے مگر انہیں نظر انداز کیا جانا چاہیے۔ اس سے رشتے نبھانے میں آسانی رہتی ہے ورنہ اگر ان کے حساب کتاب کے چکر میں پڑ جائیں تو سکون والی زندگی کا تصور محال ہے۔ ننھے بچوں کو قصے کہانیاں سنانے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ سبق آموز واقعات کے ذریعے عملی زندگی کے بارے میں تصورات پہنچتے کیے جاسکیں تاکہ جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھیں تو باوقار اور کارآمد شہری ثابت ہو سکیں۔ اس لحاظ سے نانی اماں کا کردار ایک جاندار کردار ہے جو پوری کہانی پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ سماجی ضروریات کے پس منظر میں اعلیٰ انسانی و اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانے والی عورت جو اپنا فلسفہ حیات اپنی نسل میں منتقل کرنے کی خواہاں نظر آتی ہے۔ اعلیٰ انسانی اوصاف جو ماضی کے لوگ اپنائے ہوئے تھے۔ ان کو نسل نو تک پہنچانا اپنا فریضہ سمجھتی ہے۔ وہ باتوں باتوں میں اپنی محنت اور جفاکش طرز زندگی کا تذکرہ کرتی ہیں تاکہ بچے بھی صرف آسائشات و سہولیات کی طرف نہ دیکھنے لگیں بلکہ اپنا آپ بنانے میں اپنی توانائیاں صرف کر دیں۔ اصلاحی نقطہ نظر سے یہ ایک بھرپور کردار ہے۔ ایک اور اہم سماجی مسئلہ جس کی طرف اشتقاق احمد توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ مشرقی معاشرے میں جوائنٹ فیملی سسٹم رائج ہے۔ اس میں ماں باپ، دادا دادی، چچا تایا وغیرہ بمعہ اولاد ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ جب تمام لوگوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں تو تمام بہوؤں ایک جیسے خاندانی پس منظر کی حامل نہیں ہوتی ہیں اور نہ ہی تمام گھرانوں کے مردوں کی آمدنی ایک جیسی ہوتی ہے۔ تو کمزور خاندانی پس منظر کی عورتیں یا جن کے مردوں کی آمدنی کم ہوتی ہے۔ ان کا احوال نانی اماں بتا رہی ہیں۔

خدا بخشے میری ساس ذرا سخت طبیعت کی تھی۔ گھر کا سارا کام کاج مجھے ہی کرنا پڑتا۔ باقی سب بہوؤں کے گھر والے تو ساتھ رہتے تھے۔ ذرا سی بھی تنگی ترشی ہوتی ٹسوے

بہائیں۔ ان سے جا لگائیں۔ مجھ بیچاری کا کون تھا جس پر بھول بیٹھتی۔ عمر بھر نوکر بن کر ان کی خدمت کی۔ دن بھر آٹا گوند ہتے گوند ہتے میری کلائی ٹیڑھی ہو گئی۔^۴

اپنے کرداروں کے منہ سے اشفاق احمد نے ایسے جملے کہلوائے ہیں جو کہ سماجی مسائل کے تناظر میں نہ صرف نہایت گہرے ہیں بلکہ کاٹ دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مشترکہ خاندانی نظام میں صلاحیت، اہلیت اور وسائل کی بنا پر کچھ لوگوں کی اجارہ داری ہوتی ہے جبکہ باقی لوگ ان کی خاطر خدمت میں ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ وہ لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے بالادست لوگوں کی طرف دیکھتے ہیں اور کچھ نہ پوری ہونے والی خواہشات کو قربان کر دیا جاتا ہے تاکہ بس نظام چلتا رہے۔ یہاں پر نانی اماں نے آٹا گوند ہتے ہوئے کلائی کے ٹیڑھے ہو جانے کا ذکر مبالغے کے صیغے اور ذیل میں کیا ہے مگر یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس طرح کی کیفیت بھی ہو جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ جن بہوؤں کے گھر قریب تھے یا ان کا آسرا ہوتا تھا وہ نسبتاً آرام اور آسائش کی زندگی گزار رہی تھیں جب کہ نانی اماں کی حالت ایسی نہ تھی کہ اُس طرح کا عزت و احترام ملتا یا تقاضا کر سکتیں۔ اس لحاظ سے یہ کردار بھی عورت ذات کے مسائل اور مجبوریوں کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے اور یہ ہی کردار نگاری کا کمال ہے۔ یہ کہانی چونکہ متوسط اور درمیانی طبقے کے ایک گھرانے کی ہے اس لحاظ سے اشفاق احمد نے اس طبقے کو درپیش سماجی مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ گو کہ غریب اور مفلوک الحال طبقے کی بات کی جائے تو ان کے ہاں حالات مزید دگرگوں اور تشویشناک ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اپنے سے کم حیثیت والے سے لوگوں کا سلوک اور برتاؤ کچھ اچھا نہیں ہوتا ہے۔ اس کی تربیت پہلی سماجی درس گاہ گھر سے ہی ملتی ہے جس کا اظہار ہم معاشرے میں آئے روز دیکھتے رہتے ہیں۔

رینا (رات بیت رہی ہے)

رینا "رات بیت رہی ہے" افسانے کا مرکزی نسوانی کردار ہے۔ یہ رومانوی کردار ارشد کی محبوبہ ہے۔ ارشد ایک ہندوستانی نوجوان ہے جو بحری بیڑے پر امریکیوں کے سنگ جنگ میں مصروف کار ہے۔ اس کے دیگر ساتھیوں میں پیٹر، کارلو شامل ہیں۔ نوجوان اپنی محبوبہ کو خط لکھ رہا ہے اور اس طویل خط میں وہ بیٹے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ اشفاق احمد کے افسانے عموماً محبت کا پیغام لیے ہوتے ہیں۔ یہاں رینا کا کردار بھی محبت جیسے آفاقی جذبے میں گوندھا گیا ہے۔ رینا کی محبت ہی تھی کہ نوجوان میٹرک کے بعد پڑھنے پر آمادہ ہوا، فوج میں بھرتی ہوا اور محاذ پر چلا آیا۔ وہ خط کے آغاز میں ہی بتاتا ہے۔

اب خود ہی تم نے مجھے اتنی دور بھیج دیا ہے۔ یہاں نہ تو کوئی تمہارے جیسا ہے نہ تمہارے دیس کا۔ انگریزی کھانے کھا کر تنگ آ گیا ہوں۔ اردو میں بات کیے تقریباً ڈیڑھ مہینہ بیت چکا ہے۔^۵

رینا کے کردار کے ذریعے اشفاق احمد باور کرانا چاہتے ہیں کہ محبت ایک آفاقی جذبہ ہے جو اپنے اندر بہت طاقت رکھتا ہے۔ محبت چھن جانے کا خوف انسان سے سب کچھ کراتا ہے۔ اسی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر نوجوان محاذ پر چلا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کی محبوبہ کی خواہش تھی۔ رینا کی بے لوث محبت ہی نوجوان کو اس کی آرزوؤں کی تکمیل پر ابھارتی ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا کردار ہے جو افسانے میں مرکزی کردار کو جان کی بازی لگانے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ افسانے میں نوجوان رینا کی محبت میں سب کچھ قربان کرنے کو تیار نظر آتا ہے۔ ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے وہ یہ باور کرتا ہے کہ میں اپنی پسند تمھاری پسند پر قربان کر دیا کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے۔

میں بالوں میں ٹیڑھی مانگ نکالتا تھا لیکن تم نے کہا مجھے درمیان میں پسند ہے۔ میں نے کنگھی تمھارے آگے بڑھادی تو تم نے کہا میں خود نہیں نکالوں گی۔ پھر میری مانگ خود بخود سیدھی نکلنے لگی۔^۶

اشفاق احمد کے ہاں محبت پاکیزہ روپ میں ملتی ہے۔ نوجوان نے جب کنگھی آگے بڑھائی تو رینا نے بالوں کو چھوا تک نہیں۔ اس طرح محبت میں مشرقیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے اور رینا کا قد قاری کی نظر میں اور بلند ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے رینا محبت کی پاکیزگی و معصومیت کی علامت بنا کر پیش کی گئی ہے۔ عورت کی نفسیات اور معاشرے کی طرف سے عائد پابندیاں و ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں جو کہ عورت کو ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی ہیں کیونکہ وہ رشتے اور تعلق میں خیانت کی قائل نہیں ہوتی ہے اور اسے مکمل ایمانداری سے پروان چڑھانا چاہتی ہے۔ یہ اس کردار کی ایک صفت اور پہچان ہے۔ اشفاق احمد رینا کے کردار کے ذریعے مذہبی، اخلاقی اور سماجی فرائض اور پابندیوں کو بھی سامنے لانا چاہتے ہیں کہ کس طرح ان کا خیال رکھا جانا ضروری ہے۔ معاشرتی اصلاح بھی اشفاق احمد کا مقصد رہا ہے تو اس کی طرف بھی ہلکا سا اشارہ موجود ہے۔ وہ معاشرے میں صحت مند سوچ پروان چڑھانا چاہتے ہیں اور اسی محبت کے فلسفے کی بنیاد پر معاشرے کی تعمیر و ترقی چاہتے ہیں۔ ہندوستانی نوجوان نے میٹرک کے بعد ایف اے کی سطح پر فلسفہ کا مضمون رکھ لیا تھا۔ جس سے دماغ روشن ہونے کی بجائے دماغ الٹا ہو گیا اور نوجوان خدا کے وجود سے انکاری ہو گیا۔ یہ صورت حال رینا کے لیے حد درجہ افسوس ناک تھی۔ پہلے تو رینا اسے بھائی کے ساتھ لمبی لمبی بحثیں کرتے دیکھتی رہتی ہے مگر آخر میں اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے۔

میں نے کہا تھا۔ جب وقت۔۔۔۔۔ وقت اور فاصلہ میں کچھ نہیں سمجھتی۔ تم نے بات کاٹ کر کہا۔ آج سے خدا کو مانا کرو۔ لیکن۔۔۔۔۔! لیکن کچھ نہیں۔ میں جو کہتی ہوں کہ خدا ہے۔ میں تم سے تو نہ ڈرتا لیکن شاید تمھاری دھمکی سے ڈر گیا اور اس دن سے مجھے ہر شے میں خدا کا ظہور نظر آنے لگا۔^۷

یہاں رینا کا کردار ذرا نکھر کر سامنے آتا ہے جب وہ سختی سے اپنا حق جتاتی ہے۔ کیونکہ اس کی نظر میں اس کا محبوب گمراہ ہونے لگا تھا۔ اور خدا کے وجود کو ماننے سے گریزاں تھا تو اس نے اپنا حق جتایا اور محبوب سے خدا کا وجود سختی سے منوالیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں خیر و شر اور نیکی و بدی کی قوتوں کے ساتھ اختیار اور شعور جیسی صلاحیت بھی دی ہے۔ اس لیے راہ سے بھٹکے ہوئے نوجوان کے لیے اشفاق احمد نے ایک طاقت ور اور مضبوط کردار تراشا ہے جو اسے راہ راست پہ رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہی کردار نوجوان کو پستی کی گہرائیوں سے نکال کر مثبت سوچ کے ساتھ بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ مثبت تبدیلیوں کا عزم اور حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ نوجوان کی فکر و سوچ کے تضادات کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس اہم کام کے لیے جہاں محبت، پیار، نرمی کے ساتھ زور زبردستی اور دھمکی کی ضرورت ہو تو اس سے بھی گریز نہیں کرتا ہے۔ رینا کا کردار بحیثیت مجموعی ایک جاندار اور طاقت ور کردار ہے جو افسانے میں نوجوان کو قربانیوں اور ایثار کے لیے تحریک دیتا ہے۔

پچی (سنگ دل)

یہ افسانہ فسادات کے بعد مغوی عورتوں کی بازیافت پر مبنی ہے جو ہندوستان میں رہ گئی تھیں۔ ان کو لینے کے لیے پاکستان سے جو فوجی آفیسر مشرقی پنجاب کے ضلع لیاڑاں میں تعینات کیا جاتا ہے۔ وہ اسی علاقے میں پیدا ہوا، پلا بڑھا تھا۔ آٹھ سال پہلے اس کے والد اسٹنٹ سرجن کے طور پر اسی علاقے کے سرکاری ہسپتال میں کام کرتے رہے تھے۔ وہاں اس کی ملاقات والد کے دوست سابقہ ہمسائے پولیس انسپٹر سے ہو جاتی ہے جو اسے گھر لے جاتا ہے۔ گھر میں اس کی جواں سال بیٹی پچی چھوٹے بھائی امر کے ساتھ رہتی ہے۔ پچی اس نوجوان کی بچپن کی دوست اور آشنا ہے جسے نوجوان آفیسر پسند کرتا تھا۔ پچی اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ یہ ہندو لڑکی رومانوی کردار ہے۔ اشفاق احمد نے اس کردار کے ذریعے فلسفہ محبت پیش کیا ہے کہ محبت بلا تفریق مذہب، رنگ نسل اور جغرافیائی حدود کے ایک ایسا آفاقی جذبہ ہے جو اپنا وجود رکھتا اور منواتا ہے۔ جس کے وجود سے انکار حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ پچی کا کردار بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کا دھیمالب و لہجہ اور انداز، رواداری اور ہمدردی، فسادات کے بعد کی سہمی ہوئی فضا کو معمول پر لانے کا باعث ہے۔ مغوی عورتوں کے سلسلہ میں اس کا ایثار اور بے باک کردار قارئین کو بہت متاثر کرتا ہے۔ پچی کے کردار کے بارے میں منیر الدین احمد اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

افسانہ نگار پچی کے کردار کو بہت غیر محسوس طریقے سے آگے لاتا ہے۔ وہ تو اس کو ہیر و من بنانے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔ اس لیے وہ اس کو کہانی میں مرکزی مقام نہیں دیتا ہے اور وہ بھی اس وقت جب افسانہ اختتام پہنچ چکا ہوتا ہے۔^۸

بہمی پورے افسانے میں ایک محبوبہ کی صورت میں سامنے آتی ہے گو کہ اشفاق احمد نے اس کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے لائے ہیں مگر کہانی کے جذباتی اختتام پر وہ اپنا پیار مغوی لڑکیوں پہ قربان کر دیتی ہے تو یوں قاری کی نظر میں وہ ایک ایثار اور قربانی دینے والی عورت کے طور پر ابھر کے سامنے آتی ہے جسے بہت پسند کیا جاتا ہے۔ گھریلو سی سگھڑ نوجوان عورت، غالب کی پرستار، شعر و شاعری کو پسند کرنے والی لڑکی، بچوں کی تربیت کے معاملے میں سخت گیر، حساس، رحم دل، بے باک اور نڈر جو جان پر کھیل کر سجن سنگھ جیسے غنڈے سے حسنانامی لڑکی کو برآمد کروا کے پاکستان بھجوا دیتی ہے۔ نوجوان جب کام کے سلسلے میں تین چار دن بعد گھر واپس لوٹتا ہے تو ہفتے سے بڑھی ہوئی شیو کرنے لگتا ہے تو پچی اسے شیو بنا دیتی ہے۔

ابھی سیفٹی ریزر میں بلیڈ لگایا ہی تھا کہ بہمی کی آہٹ نے چونکا دیا۔ لائیے میں آپ کی شیو بناؤں۔ شیو؟ پر یہ تو بڑی مہارت کا کام ہے۔ تم سے۔۔۔۔۔! مہارت نہ مہارت لائیے ریزر دیکھیے اور وہ شیو بنانے لگی۔^۹

اشفاق احمد اس کردار کو ایک ایسی لڑکی کی صورت میں پیش کرتے ہیں جو مردانہ وار زندگی گزار رہی ہے اور زندگی کے مسائل و مصائب میں ہار نہ ماننے والی ہے۔ یہ ایک نرم و نازک لڑکی نہیں بلکہ سخت جان اور بہادر ہے۔ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے بہت حساس ہے۔ امراس کا چھوٹا بھائی ہے جو کہ والدہ کی وفات کے بعد بہت بگڑ چکا ہے۔ مگر پچی لاڈ پیار کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت کے معاملے میں کوئی رعایت نہیں کرتی ہے۔ وہ تعلیم کو لازم خیال کرتی ہے۔ امر کے بارے میں بتاتی ہے کہ "اگر مجھ سے خوف نہ کھاتا ہو تو سکول جانا بھی چھوڑ دے۔" وہ خود ایف اے تک تعلیم یافتہ ہے۔ اسے اردو سے حد درجہ لگاؤ ہے۔ جب وہ اردو میں اول آئی تھی تو اس کے پتاجی نے جرمنی سے چھپا ہوا دیوان غالب اسے انعام کے طور پر دیا تھا۔ وہ خود بھی شعر و شاعری کی دلدادہ ہے۔ اشارتا کو جوان فوجی آفیسر سے محبت کا اظہار کرنے لگتی ہے تو اشعار کا سہارا لیتی ہے۔ جب وہ دونوں ایک شام کو اکٹھے بیٹھے ہوتے ہیں تو پچی کونانی اماں کے آنے کا پتہ چل جاتا ہے تو فوراً اٹھ کھڑی ہوتی ہے تب وہ دل کے جذبات کے اظہار کے لیے شاعری کا سہارا لیتی ہے۔

جس اچانک پنپے سے وہ اٹھی تھی، اسی اچانک پن سے بیٹھ کر بولی۔ تمہیں اس شعر کا مطلب آتا ہے؟

جو بات دل میں رہ گئی نشتر بنی حفیظ
جولب پہ آگئی رسن و دار ہو گئی۔"

یہاں پٹی ایک ایسی شوخ سی لڑکی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو شعروں کی تشریح پوچھنے کے بہانے کبھی کبھار اپنے محبوب سے محبت کا اظہار کرتی ہے جس میں اس کی مجبوری اور بے بسی کو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ گو کہ دونوں کے درمیان مذہب کی بہت گہری اور واضح خلیج حائل ہے جسے نظر انداز کرنا اور پاٹنا ممکن نہیں ہے مگر دل کے ہاتھوں مجبور بھی ہے اور اپنے احساسات بھی پہنچانا چاہتی ہے۔ ذہنی کشمکش میں مبتلا پٹی صاف اور واضح الفاظ میں اظہار کی بجائے دبے لفظوں میں شاعرانہ پیرائے میں محبت کا پتہ دیتی ہے۔ اسی محبت اور مروت کا شکار ہو کر وہ نوجوان کا بہت خیال رکھتی ہے اور اس کا ہر کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتی ہے۔ اس کے کمرے کی صفائی ستھرائی اور اس کے دیگر معاملات کا خود خیال رکھتی ہے۔ ایک دن نوجوان آفیسر کو بذریعہ ڈاک پاکستان سے ایک دکھی والد کی چٹھی ملتی ہے جو اس کی مغوی لڑکی کے بارے میں تھی۔ وہ اسے سرسری سا پڑھنے کے بعد کونے میں نوٹ لکھ دیتا ہے کہ باوجود تلاش بسیار کے لڑکی نہ مل سکی۔ جس کا پٹی کو پتا چل جاتا ہے اور وہ سخت ناگواری کا اظہار کرتی ہے۔

جب وہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ قرینے سے رکھ چکی تو تپائی سے عرضی اٹھا کر پڑھنے لگی۔ پڑھنے کے دوران اس نے مجھ سے انگریزی کے دو مشکل الفاظ کے معنی پوچھے جب پڑھ چکی تو کاغذ ٹیڑھا کر کے میرا ریمارک پڑھا اور جھنجھلا کر عرضی کو میری گود میں پھینک دیا۔

کتنے سنگ دل ہو تم؟^{۱۲}

یہ کہتے ہوئے پٹی کی آنکھیں دھندلا جاتی ہیں۔ یعنی اس کے اندر چھپا درد اور کرب محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ بلا تعصب ایک مسلمان لڑکی کے لیے فکر مند نظر آتی ہے۔ اس دن وہ اور امر ناریاضی کے اظہار کے لیے پورا دن کمرے میں نہیں آئے۔ یہ اقدام ان کی نرم دلی اور انسان دوستی کو ظاہر کرتا ہے۔ پٹی یہاں پر محبت، رحمدلی اور انسان دوستی کو کوئی معنویت دیتی ہے۔ رنگ و نسل اور مذہب سے ماوراء ایک بلند تر انسانیت کا تصور ابھرتا ہے۔ المیہ اور حزن و ملال کی فضا کے باوجود وہ ایک پاکستانی مغویہ لڑکی کے لیے مسرت کا باعث بن جاتی ہے۔ وہ سجن سنگھ نامی ایک بد فطرت انسان کے چنگل سے حسنانامی لڑکی کو آزاد کرانا چاہتی ہے جس کے بارے میں اس نے چٹھی میں پڑھ لیا تھا۔ ایک رات سوتے ہوئے وہ اچانک نوجوان فوجی آفیسر کو جگاتی ہے۔ اس کا منظر کچھ یوں ہے۔

کسی نے آہستہ سے آکر میرا سر چھوا۔ میں چونکا، پٹی لبوں پر انگلی رکھے خاموش کھڑی تھی۔ مجھ پر جھک کر بولی۔ آج میری مدد کرو۔ میں بڑی پتا میں ہوں۔ میں نے حیرت سے پوچھا کیا بات ہے؟ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ مجھے ایک لڑکی کے اغوا کرنے میں مدد دے سکتے ہو؟ اغوا۔۔۔؟ ششی ششی اس نے میرے ہونٹوں پہ انگلی رکھ دی۔^{۱۳}

پہلی جلدی جلدی سارا سامان رات کے اندھیرے میں فوجی ٹرک پر لوڈ کر دیتی ہے اور وہ خود سجن سنگھ کے گھر کی دیوار پھلانگ کر حسنا کو ساتھ لے آتی ہے اور رات کے اندھیرے میں نکل جانے کا کہہ دیتی ہے۔ وہ رات کی چاندنی میں ان تمام لوگوں کو الوداع کہتی ہے اور انسان دوستی کی مثال قائم کرتے ہوئے انسانیت کے جذبے کے تحت اپنی محبت کی قربانی پیش کرتی ہے اور تقسیم سے قبل ہندو مسلم پیار محبت اور تعصب سے پاک بے لوث سچائی اور حقیقت کو سامنے لے آتی ہے۔ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر کسی کی جان بچانا اور منزل مقصود تک پہنچانا انسان دوستی کی عمدہ مثال ہے۔ اشفاق احمد نے پہلی کے کردار کے ذریعے محبت کو محدود تصور کی بجائے لامحدود اور انسانی سرحدوں و حدود سے ماوراء اور بلند تر مقام دینا چاہتے ہیں۔ وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سرحد کے دونوں جانب دھڑکنے والے دل محبت کا بیج بونا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں اطراف سے شریک عناصر کے باوجود مسلمانوں اور ہندوؤں نے جان پر کھیل کر انسانوں کی جانیں بچائی ہیں۔ یہی انسانیت کی معراج ہے اور اعلیٰ اخلاقی اقدار جن کی جھلک پہلی میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بیٹرس (شب خون)

بیٹرس ایک نرس ہے جو کہ ٹی بی وارڈ میں مریضوں کی دیکھ بھال کا کام کرتی ہے۔ جہاں افسانے کا مرکزی کردار شقودیگر مریضوں کے ساتھ داخل ہے اور زندگی کے آخری ایام گزار رہا ہے۔ بیٹرس ایک متحرک کردار ہے جو کہ فرض شناس نرس تو ہے ہی مگر ساتھ ساتھ وہ ایک نرم دل خاتون بھی ہے جو خود غرضی اور ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر سوچتی ہے اور مریضوں کے ساتھ گل مل کر آخری ایام بتانے میں معاون کردار ادا کرتی ہے۔ اشفاق احمد نے اسے ایک عام نرس کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ ایک منفرد خاتون جس کا مریضوں اور زندگی کے بارے میں اپنا زاویہ نگاہ ہے۔ مریضوں سے اس کا رویہ نہایت مشفقانہ ہوتا۔ وہ درد اور تکلیف میں مبتلا مریضوں کی تکلیف کم کرنے کے لیے ہنس ہنس کے باتیں کیا کرتی۔ وہ شقود پر بھی بہت مہربان تھی۔ جو ڈاکٹروں اور اپنوں کے رویے کے باعث زندگی سے مایوس ہو چکا تھا مگر بیٹرس اس کو حوصلہ دیتی ہے۔ اس کی تعریف و توصیف کرتی ہے تاکہ شقود جینے کا ارادہ باندھ لے۔ بیٹرس کا انداز کچھ اس طرح ہوتا۔

تمہارے نتھنے بڑے خوبصورت ہیں۔ بیٹرس نے شقود کی ناک کو چھو کر کہا۔ ہاں اچھے

تھے پر اب نہیں۔ اب کیوں نہیں۔ دیکھو جب تم سانس لیتے ہو تو یہ نوزائیدہ بچے کی

ہتھیلیوں کی طرح گلابی ہو جاتے ہیں۔^{۱۲}

بیٹرس خوبصورت اور نوجوان نرس ہے جسے اپنی خوبصورتی اور حسن کا احساس بھی ہے۔ وہ شقود میں زندگی اور جینے کا جذبہ پیدا کرنے کی خاطر شقود کو محبت کا احساس دلانا چاہتی ہے۔ یہ محبت ایثار و قربانی کا جذبہ لیے ہوئے ہے جو کہ نسوانی وقار کی علامت اور اہم نسوانی خصوصیت ہے۔ وہ ہر حال میں شقود کی زندگی بچانا چاہتی ہے جو کہ مرض کے ساتھ ساتھ

تنہائی، محرومی اور اپنوں کی بے حسی کا شکار ہے۔ شقو ایک بھرپور زندگی گزار رہا تھا کہ اسے ٹی بی جیسا موذی مرض لاحق ہو گیا اور وہ ہسپتال پہنچ گیا۔ جب اس کے مرض کی تشخیص ہوئی تب تک آخری مراحل میں بیماری پہنچ چکی تھی۔ زندگی اور موت کے ساتھ ساتھ افراد اور طبی عملے کے رویے سے پیدا ہونے والی کشمکش کو بیٹرس کم سے کم کرنا چاہتی ہے۔

شیو کرو گے؟ بیٹرس اندر داخل ہوئی۔ اوں ہوں۔ کیوں۔۔؟ دل نہیں چاہتا۔ بڑھی ہوئی شیو چہرے کی ہیبت کم کر دیتی ہے۔ پھر وہی بات،،،،،! لیکن تمہارے چہرے پر ہیبت ہے ہی کہاں۔۔؟^{۱۵}

یہ اس کردار کی خوبی ہے کہ وہ مریضوں کو مثبت انداز فکر اپنانے کی ترغیب دیتے ہوئے زندگی سے آشنا کرتا ہے۔ اشفاق احمد کرداروں کے ساتھ غیر جانبدارانہ رویہ اپناتے ہیں اور کردار کو اس کے فطری روپ اور انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہونے دیتے جو اس کے گزشتہ رویے کے منافی ہو۔ جذباتی اور ہمدردانہ رویہ بیٹرس کی پہچان بن چکا ہے۔ دکھی اور تنہا افراد جو مریضوں کی صورت میں اس کے ساتھ ہیں جو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت موت کو بہت قریب سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے لیے بیٹرس اپنے جذبات سے مجبور ہو کر جان بچانے کی خاطر خون دینا شروع کر دیتی ہے۔ شقو کو کھانسی کے دوران بلغم کے ساتھ خون آنا شروع ہو چکا تھا۔ پھیپھڑے بری طرح متاثر ہو چکے تھے اور خون کی کمی سے نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے درد کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ تو شقو کو خون کی اشد ضرورت تھی تاکہ اس کی تکلیف کم ہو سکے۔

جب ڈاکٹر انجکشن دے چکے تو شقو نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔ یہ کیسا ٹیکہ تھا ڈاکٹر صاحب۔۔؟ خون کا۔۔؟ کیسے خون کا۔۔۔؟ یہ بیٹرس نے تمہارے لیے دیا تھا،،،،، اپنی مرضی سے۔^{۱۶}

خون کا عطیہ دینا یہ ثابت کرتا ہے کہ بیٹرس ایک ایسے کردار کے طور پر سامنے آتی ہے جو کہ مسیحائی کے پیشے سے تو مکمل طور پر نباہ رہی ہوتی ہے مگر اس کے اندر بھی ایک عورت کا دل موجود ہوتا ہے۔ ایسا دل دھڑک رہا ہوتا ہے جس میں چاہے جانے کی، اپنانے کی خواہش موجود ہوتی ہے۔ گو کہ وہ لفظوں سے اس کا اظہار نہیں کر پاتی مگر عمل سے ضرور ثابت کر دیتی ہے کہ اس کے اندر ایک محبت کرنے والا دھڑکتا ہوا دل موجود ہے۔ یہ کردار قنوطیت کا شکار نہیں بلکہ ہر دم پر امید دکھائی دیتا ہے۔ جینے کی امنگ اور خواہش اس کے اندر پائی جاتی ہے اور شقو کو زندہ رکھنے کے لیے ہر طرح سے اس کا ساتھ دینے کو تیار نظر آتی ہے۔

جب بیٹرس ڈاکٹر شاہ کو ساتھ لے کر آئی تو انھوں نے کہا۔ حیرت ہے یہ ابھی تک زندہ ہے۔ بیٹرس کچھ کہہ نہ سکی۔ خاموش ڈاکٹر کو دیکھتی رہی۔ خون کا ایک اور انجکشن دو گی؟ ضرور۔! بیٹرس نے بازو آگے بڑھا کر کہا۔ ڈاکٹر صاحب نے خون ٹیوب میں کھینچ کر سرنج بھری اور شقو کے بازو میں گھونپ دی۔^{۱۷}

بیٹرس کی قربانی و ایثار کو عملی صورت میں اضافے کو نمایاں کیا گیا ہے جس کی بنا پر قاری کی ہمدردیاں بیٹرس کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ رجائیت کی علامت کے طور پر ابھرنے والا یہ کردار بہت متاثر کن ہے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شقو نامی مریض کی زندگی اور صحت کے بارے میں بہت حساس ہو جاتا ہے۔ دوسرے افراد اور طبی عملے کو بھی اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ بیٹرس تمام مریضوں کے ساتھ عموماً اور بالخصوص شقو کے ساتھ انس و محبت کا رویہ رکھے ہوئے ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر شاہ اس سے مزید خون کا انجکشن لے کر شقو کو لگا دیتے ہیں۔ اس کردار پر کافی محنت کی گئی ہے۔ بطور کردار بیٹرس مخصوص حسن کی مالک ہے اور یہ حسن اس کے انداز اور عادات و اطوار کی مدد سے چمکنے دکنے لگتا ہے۔ بیٹرس کو جب شقو کی زندگی کی کوئی امید نہیں رہتی تو وہ زیادہ سے زیادہ وقت اسی کے پاس گزاری ہے۔ وہ دوسروں کی جگہ ڈیوٹی دن رات کرنا شروع کر دیتی ہے تاکہ شقو کے پاس رہے۔

نرس بوائے نے آکر پوچھا۔ تھریڈون زندہ ہے؟ تو بیٹرس نے روٹکھی ہو کر اسے باہر دھکیل دیا۔ ڈورنن اپنی ڈیوٹی پر آئی تو بیٹرس نے کہا جاؤ تم سو رہو۔ تمہاری جگہ میں ڈیوٹی دوں گی۔^{۱۸}

بیٹرس کا نرس بوائے سے تلخ رویہ اور ڈورنن کی جگہ رات کی ڈیوٹی بھی خود کرنا ہمدردی اور انسیت کے بیدار جذبات کی علامت ہے۔ نرس بوائے سے نوک جھونک شقو کے لیے رحم اور ترس کے جذبات سامنے لاتا ہے۔ ہمدردی کا جذبہ آخری وقت تک بیٹرس میں دکھائی دیتا ہے جو کہ وفا شعار عورت اور فرض شناس نرس کی بنیادی پہچان ہے۔ اور یہی خوبیاں اس کردار کی عظمت ہیں جو قاری کو بہت متاثر کرتی ہیں۔

نخستہ (توتا کہانی)

نخستہ "توتا کہانی" کا ایسا رومانوی کردار ہے جسے افسانے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اپنے پڑوس میں آباد کرائے دار حامد نامی نوجوان کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے مگر روایتی محبت نہیں بلکہ محبت کی پاکیزگی اور معصومیت کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ غلط راستوں پر چلنے کی بجائے، مشرقی روایات کی امین نخستہ ایک مضبوط کردار کی صورت میں افسانے کا حصہ ہے۔ یہ محبت یک طرفہ نہیں ہے بلکہ حامد کے جذبات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ دونوں کا رابطہ اپنے گھر کی چھت پر ہوتا رہتا ہے مگر

کوئی ملاقات نہیں ہوتی۔ حامد نجستہ کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ ایک سانولے رنگ کی لڑکی ہے۔ اپنی ملاقاتوں کے بارے میں بتاتا ہے۔

نجستہ سے میری ملاقات بس یونہی سرسری سی تھی۔ میں اپنے کوٹھے پر آنے کا اعلان
شیلے کے اشعار سے کیا کرتا اور وہ اپنی چھت پر آکر زور سے پکارتی۔ سارے کپڑے اتار
لاؤں امی۔۔۔؟^{۱۹}

نجستہ چھت پر آنے کا پیغام نوجوان تک کس طرح پہنچاتی۔ یہ ماضی میں جھانک کر دیکھا جائے تو جب ذرائع ابلاغ نے ترقی
نہ کی تھی، مواصلاتی رابطے کی کوئی صورت نہ تھی۔ دنیا عالمگیریت کی زد میں آکر ایک سنگل ٹچ کے نیچے نہ پہنچی تھی اس
وقت پیغام رسانی کے قدیم طریقے ہی رائج تھے۔ کبوتر کے ذریعے چٹھیاں بھیجنا، کبوتر اڑانے چھت پر آنا، کپڑے اتارنے
چھت تک پہنچنا، پانی کے گھڑے سر پہ رکھ کر کنوئیں یا پانی کے چشمے تک جانا اور ملاقات ہو جانا یا ایک دوسرے کو دیکھ لینا
ہی غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ اس کردار کے ذریعے اشفاق احمد نے پرانے وقتوں کی ایک گھریلو سی لڑکی کی زندگی کو سامنے لایا
ہے جو روایتی انداز میں محبت کرنے لگتی ہے مگر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر صرف محبت کی وادی میں کھو کر اپنی اخلاقی
حالت کو خراب نہیں ہونے دیتی ہے۔ بلکہ ایک خاص حد اور دائرے میں رہ کر حامد کی ذات سے وابستگی کا اظہار کرتی ہے۔
انسانیت کے مرتبے کی نہ تو توہین کرتی ہے اور نہ اشرف المخلوقات کے درجے سے خود کو گرنے دیتی ہے۔ اس طرح کے
حقیقی کردار زندگی میں ہمیں جا بجا نظر آتے ہیں۔ نجستہ کی پھوپھی اپنے بیٹے کی بات پکی کرنے حیدر آباد سے لاہور ان کے
پاس آتی ہیں تو ان کو مقبرہ جہانگیر کی سیر کرانے کا پروگرام بنتا ہے۔ اور جمعہ کا دن طے ہو جاتا ہے۔ حامد وہاں اپنی سائیکل پر
پہنچ جاتا ہے اور مینار پر چڑھ جاتا ہے۔ نجستہ وہاں پہنچ کر اسے دیکھ کر حیران ہو جاتی ہے۔ پہچان نہیں پاتی تو حامد اپنی محبت کی
داستانوں کا ذکر کرتا ہے، تعارف کراتا ہے۔ محبت کا یقین دلانے میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ وہ اس کی باتوں سے
لطف اندوز ہونے لگتی ہے اور اس کی محبت کو سراہتی ہے۔

اس پر وہ مسکرانے لگی اور اس کے گالوں میں دو ننھے گڑھے پیدا ہو گئے۔ رنگے ہوئے
ناخنوں والا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر بولی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم بھی اسی قدر بے
قرار ہو۔^{۲۰}

حامد اس کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کرتا ہے۔ وہ بہت قریب آ جاتے ہیں جیسے صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے
ہوں، ایک دوسرے سے مانوس ہوں۔ بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔

پھر ہم دونوں ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس کی گود میں سر رکھ دیا۔ جس میں وہ اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتی رہی اور آہستہ آہستہ کچھ گنگنائی رہی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں سیڑھیوں سے قدموں کی چاپ اور پھولے ہوئے سانسوں سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔^{۲۱}

سیڑھیوں پہ باتیں کرنے کی آوازیں اور قدموں کی چاپ نجستہ کی والدہ اور پھوپھی کی تھی۔ یہاں محبت کا جذبہ ہمدردی میں بدلتا ہے اور جان نثاری تک جا پہنچتا ہے۔ نجستہ سہم جاتی ہے کہ اب گھر والے ایک لڑکے کے پاس بیٹھا دیکھ کر شک کریں گے۔ واپسی کا راستہ بھی کوئی نہیں تھا۔ اس دوران حامد عشق میں جان کی بازی لگانے کا فیصلہ کر لیتا ہے اور مینار سے چھلانگ لگا دیتا ہے تاکہ نجستہ کی عزت و عصمت محفوظ رہ جائے اور ساری زندگی دوسروں کی باتوں، طعنوں اور طنز کا نشانہ نہ بنے۔ نجستہ اپنی زندگی خود ختم کرنا چاہتی تھی کیونکہ ایک عورت کے لیے اس کی پاک دامنی ہی سب کچھ ہوتا ہے جس کے سہارے وہ زندگی گزار سکتی ہے۔ تو جب عزت ہی داؤ پہ لگ جائے تو ایسا ہی فیصلہ کیا جاتا ہے مگر حامد اس دوران چپ چاپ چھلانگ لگا دیتا ہے۔ جو کہ کسی صورت گھائے کا سودانہ تھا بلکہ امر ہو جاتا ہے۔

کلثوم (بندر ابن کی کُنج گلی میں)

کلثوم اس افسانے کا رومانوی کردار ہے۔ کلثوم امیر والدین کی بیٹی ہے جو ادب کی طالبہ ہے اور یونیورسٹی میں دیگر طلبہ کے ساتھ نمدار انامی طالب علم بھی پڑھتا ہے۔ کلثوم کا کردار ایلٹ کلاس اور طبقہ اشرافیہ کی مادی سوچ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ نفس طبیعت کی لڑکی تھی مگر سارا خاندان اور رشتے دار مادیت پرست تھے۔ کاروباری سوچ کے حامل ہر وقت اسی سوچ میں کھوئے رہتے تھے۔ جب کہ کلثوم لطیف جذبات کی حامل لڑکی تھی جسے ادب اور فنون لطیفہ سے لگاؤ تھا۔ مگر ایسی سوچ کو مادیت پرست گھرانے اور طبقے میں پذیرائی کیسے مل سکتی تھی۔ نمدار اسے وہ کلاس میں قریب بھی آ جاتی ہے اور وہ بھی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ضرور ہے مگر دونوں کو اپنی اصلیت کا پتہ ہے جو ان دونوں کو پیار محبت میں مزید آگے نہیں بڑھنے دیتے بلکہ تعلقات رسمی نوعیت سے ذرا آگے تک ہی بمشکل پہنچ پاتے ہیں۔ اس کردار کے ذریعے اشفاق احمد اعلیٰ طبقے کی منافقت، دوغلا پن، کھوکھلا پن اور مطلب پرستی کو بے نقاب کرتے ہیں۔ جہاں ظاہری بناوٹ تو موجود ہوتی ہے مگر صداقت، خالص پن اور بے لوث جذبات کا ملنا مشکل ہوتا ہے۔ نمدار انامی لڑکے سے کلثوم کا تعارف اس وقت ہوتا ہے جب وہ پوری کلاس کے ساتھ ان کے مالٹوں کے بانغات میں رات کو مالٹے چوری کرنے پہنچتے ہیں۔ کلثوم نے نمدار کو دیکھ لیا۔ دوسرے دن کالج پرنسپل کے دفتر میں کلثوم کے والد شکایت لے کر پہنچے تو شناخت پریڈ کے لیے مشتبہ افراد کو بلا لیا گیا۔

میری باری آئی اور میں اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر لڑکی کی آنکھیں خوشی سے ناچ اٹھیں۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ہاتھ باندھ کر کہا۔ مجھ پر رحم کرو۔ میں بھی تمہاری طرح

ایک نادار آدمی ہوں اور اگر تم نے مجھے پہچان لیا تو میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ لڑکی کے باپ نے پوچھا۔ یہی ہے وہ لڑکا۔۔۔؟ تو لڑکی نے ایک آنکھ میچ کر اور پیشانی پر بہت سی شکنیں ڈال کر کہا۔ یہ تو نہیں۔ وہ بچکی جو گا تو لمبا پتلا سینک سلائی سا تھا۔^{۲۲}

کلثوم ایک رحم دل اور خدا ترس لڑکی کے روپ میں سامنے آتی ہے جس نے ایک غریب مگر ہونہار اور محنتی طالب علم کو معاف کر دیا تھا۔ دونوں کی قربت کی کہانی یہیں سے شروع ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے قریب آنے لگتے ہیں۔ اشفاق احمد اس کردار کے ذریعے اعلیٰ طبقے کی نمائندہ لڑکی کی شخصیت اور کردار کا ظاہری و باطنی تضاد ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ جو بظاہر پروٹوکول، نمود و نمائش اور احساس برتری میں زندگی گزار رہے ہوتے ہیں مگر ان کے دل میں خلوص، سادگی، ایثار، مروت جیسے جذبے مفقود ہوتے ہیں۔ جس سے ان کی شخصیت میں دوہرا پن آ جاتا ہے۔ وہ ایک مخصوص ماحول اور مزاج کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔ کلثوم بھی اپنے طبقے کے سارے لوگوں کی سوچ کے خلاف ہے مگر عورت ذات ہونے کے ناطے بغاوت نہیں کر سکتی صرف نفرت کر سکتی ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس کی ذات، احساسات، کیفیات کو سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ صرف ملمع کیے ہوئے رویے اور رشتے آس پاس ضرور ہیں۔ وہ نمدار اکو بتاتی ہے۔

کلثوم کہہ رہی تھی میرا کوئی ساتھی نہیں۔ ہمارے خاندان میں بہت سے آدمی ہیں مگر سارے کے سارے تاجر ہیں۔ ان کے یہاں ہر قسم کا سودا ہے لیکن لطیف جذبات کی کمی ہے۔ کوئی ایسا ذہن نہیں جو میرا ساتھ دے سکے۔^{۲۳}

کلثوم شکوہ کر رہی ہے کہ اس کے جذبات کو سمجھنے والا، سراپنے والا اور محسوس کرنے والا کوئی نہیں بلکہ سارے کے سارے تاجر پیشہ لوگ ہیں۔ جو کبھی کتابی باتوں میں نہیں آتے اور نہ ہی گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔ جس قسم کے خیالات اور سوچ کلثوم تلاش کرتی ہے وہ اس کے آس پاس موجود سودا گروں کے ہاں نہیں مل سکتی۔ وہ اس طبقے کے خود ساختہ معیارات کو تنقید کا نشانہ بناتی ہے اور اعلیٰ و معزز کہلائے جانے والے طبقہ اشرافیہ کے چہروں سے نقاب نوج لینا چاہتی ہے۔ جو دوسروں کو صرف مالی ذرائع اور وسائل نہ ہونے کی بنا پر کم تر اور کم درجہ مانتے ہیں۔ بظاہر اعلیٰ شخصیتوں کے مالک، اعلیٰ اقدار کے حامل افراد اور ظاہری رکھ رکھاؤ کے ذریعے ناک اونچی رکھنے والا طبقہ اندر سے توڑ پھوڑ کا شکار، دل اور محل تاریکی سے ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی لیے جب کلثوم کو نمدار انامی مچھیرے میں خلوص اور سچائی نظر آتی ہے تو وہ اس کے قریب ہو جاتی ہے۔ وہ نمدار اکو بتاتی ہے کہ وہ کراچی ساحل پہ سیر کے لیے گئی تو مچھیروں کی بستی سے گذر ہوا۔ وہاں کی عورتوں نے کلثوم کو بہت متاثر کیا۔ جھونپڑیوں میں رہنے والی عورتیں کلثوم کی سہیلیاں بن گئیں۔ وہ نمدار اکو بتاتی ہے۔

ان میں بہت سی میری سہیلیاں بن گئیں مگر ہمارا ان کا کیا ساتھ۔ ان میں خلوص ہے، مروت ہے اور ہم، ہم۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور بولی۔ لیکن آپ میں ایک طرح کا خلوص ہے، مروت کی باس ہے، وہی مروت جو صرف ان کے یہاں مل سکتی ہے۔^{۲۴}

کلثوم ایک سیدھی سادی، شرمیلی سی پڑھا کو لڑکی کے کردار میں سامنے آتی ہے۔ جس کے اندر ایک شریف زادی کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ وہ حقیقت کو سمجھتی ہے اور کالج میں پر خلوص تعلقات کے باوجود اپنے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کردار کے ذریعے اشفاق احمد اخلاقی خوبیوں اور اوصاف کی اہمیت بتانا چاہتے ہیں کہ یہ ضرور دوسروں کو متاثر کرتی ہیں آپ کا تعلق معاشرے کے کسی بھی طبقے سے ہو۔ مگر اعلیٰ اخلاقی اوصاف دوسروں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک اور بات جو اشفاق احمد اس کردار کے ذریعے باور کرانا چاہتے ہیں کہ پاکیزگی و شرافت صرف اعلیٰ طبقے میں موجود عورتوں کی میراث نہیں ہے بلکہ یہ خرابیاں کسی بھی طبقے کی عورت میں پائی جاسکتی ہیں اور نچلے طبقے اور مزدور پیشہ غریب عورتوں کو ذلیل یا عزت و پاکیزگی سے عاری سمجھنا درست نہیں ہے بلکہ یہ سارے معیارات ہمارے معاشرے میں طبقاتی تقسیم کی وجہ سے اعلیٰ طبقے کے خود ساختہ ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ایلن (بابا)

"بابا" فسادات کے تناظر میں لکھا گیا المناک اور دردناک افسانہ ہے۔ ایلن اور وحید دو اہم کردار ہیں۔ ایلن ایک انگریز عورت ہے۔ وحید اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے اور اسے بابا اپنی زمین بیچ کر ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے ولایت (انگلستان) بھیجتا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب وہ واپس لوٹتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی بیوی ایلن اور بیٹا مسعود ہوتے ہیں۔ بابا بیٹے کی محبت کی خاطر اپنی بہو کو قبول کر لیتا ہے۔ وحید اپنی بیوی ایلن کا تعارف ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "یہ ایلن ہے۔ اس کے والد اینگڈن کے کالج ہسپتال میں ڈاکٹر ہیں اور اس کا بھائی جوزف لندن میڈیکل کالج میں میرا ہم جماعت تھا۔" ایلن کا کردار اشفاق احمد نے بہت خوبصورتی اور محنت سے تراشا ہے۔ جو کہ انسان دوستی، ہمدردی اور عزت و احترام میں اپنی مثال آپ ہے۔ تعصب کی کوئی جھلک ایلن میں نہیں دکھائی دیتی ہے۔ رنگ، مذہب، وطن اور نسل کے تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے رشتوں کا پاس ہے اور وہ انھیں نبھانے کا ہنر بھی خوب جانتی ہے۔ وہ بابا کے احساسات و جذبات کی دل سے قدر کرتی ہے اور وحید کو بھی احترام کرنے کا کہتی ہے۔ وہ ان کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتی ہے جیسے کوئی اپنے باپ کے لیے جذبات رکھتا ہو۔ ایلن ایک وفا شعار بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ فرمانبردار بہو بھی ہے۔ اسے کاشت کاری کا شوق ہے لہذا وہ ہر کام میں وحید کے ساتھ شریک ہوتی ہے مثلاً اہل چلانا، گائے کا دودھ دوہنا، مویشیوں کو چارہ ڈالنا، زرعی مشینری کی دیکھ بھال و مرمت وغیرہ۔ اسی بنا پر بابا کے دل میں اپنی بہو کے لیے بہت

احترام ہے۔ جب وحید کو بطور ڈاکٹر ملازمت مل جاتی ہے تو بابا کا رویہ ایلن کے ساتھ مزید مشفقانہ ہو جاتا ہے۔ مغربی عورت ہونے کی وجہ سے بابا اپنی بہو سے ذرا فاصلے پر رہتا ہے مگر ایلن یہ فاصلے مٹا دیتی ہے۔ بابا صبح سویرے اٹھ کر کنوئیں پر جانا چاہتا ہے تو کچھ اس انداز میں اپنی بہو سے اجازت طلب کرتا ہے اور ایلن کا رد عمل کچھ اس طرح تھا۔

مسعود ابھی جاگا تو نہیں۔ لیکن اتنی دیر سے اٹھنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ کیا میں اسے جگا کر کنوئیں پر لے جاؤں؟ ایلن نے بھولپن سے کہا۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں بابا۔ مجھ سے اجازت مانگ رہے ہیں۔ اپنے بیٹے کو جگانے کے لیے دوسروں سے نہیں پوچھنا چاہیے۔ اچھا، اچھا۔ بابا نے اس کی سعادت مندی سے خوش ہو کر کہا۔^{۲۶}

ایلن کا کردار مشرقی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ یا جیسے وہ شفیق، ملنسار اور سعادت مند خاتون کے طور پر دکھائی گئی ہے ہر معاشرے کی اکثر عورتوں کا رویہ اور برتاؤ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جہاں بابا، وحید و دیگر لوگ اپنی محبتیں ایلن پر نچھاور کرتے ہیں اور اسے غیر ملکی عورت ہونے کا احساس نہیں ہونے دیتے اسی طرح ایلن کا رویہ اور رد عمل بھی ایسا ہی ہے۔ محبت اور یگانگت کے ساتھ ایک دوسرے کو سمجھنے کا احساس دکھائی دیتا ہے۔ وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی ہے اور مذہب کوئی بھی ہو وہ امن و سلامتی اور انسان دوستی کا ایک مضبوط اور توانا تصور دیتا ہے۔ اسی طرح معاشرے میں بلا تخصیص رنگ و نسل اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانا اور پھیلانا انسان دوست شخص کا اولین فرض بنتا ہے۔ ایک انگریز میم کے منہ سے ایسے جملے کہلوانا اور اس کے عمل سے ثابت کرنا بلاشبہ اشفاق احمد کی فنی مہارت کا بین ثبوت ہے۔ اشفاق احمد ایلن کے کردار کے ذریعے مغربی معاشرے اور تہذیب کی سماج حقیقتیں ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ جہاں انسان تو انسان، جانوروں کے حقوق کا بھی بہت زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ ایلن خوبصورت اور پرکشش ہونے کے باوجود نرم و نازک عورت نہیں ہے بلکہ کاشت کاری اور مویشی پالنے کا ہنر جانتی ہے اور باقاعدہ تربیت یافتہ خاتون ہے۔ اسی لیے اسے وحید اور بابا کے ساتھ ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنے میں کوئی مشکل نہیں پیش آتی ہے۔ یہ ایک ایسا پرکشش کردار ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ افسانے میں نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک روز جب شدید بارش اور طوفان آتا ہے اور نہر ٹوٹ جانے کے باعث سارا پانی گاؤں میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ اوپر ٹیلے پہ ہونے کی وجہ سے محفوظ مقام پر تھے مگر گائے پانی میں ڈوب رہی تھی۔ اگر اسے کھول کر آزاد کر دیا جاتا تو وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ جاتی اور تیر کر جان بچا لیتی۔ اس خوفناک صورت حال میں ایلن پانی میں کود جاتی ہے۔

اس کے پیچھے بابا کی دو تین آوازیں گونجیں لیکن وہ طوفانی رات کے اندھیارے میں گھستی چلی گئی۔ چٹلی اب بھی ذکر رہی تھی اور ایلن کو پانی میں تیرتا دیکھ کر اس کی آواز

میں کرب پیدا ہو گیا تھا۔ بارش کی شدت کم نہ ہوئی تھی اور پانی سمندری لہروں کی طرح
اٹھتا چلا آ رہا تھا۔^{۲۷}

ایلن نے جا کر چتلی (گائے) کو آزاد کر دیا اور خود سردی لگ جانے کی وجہ سے بیمار ہو جاتی ہے۔ علان نہ ہونے کے باعث جب کہ گاؤں سارے کا سارا ڈوب چکا۔ بباد و سرے گاؤں سے ڈاکٹر لینے جاتا ہے مگر کوئی نرس بھی ان حالات میں اس کے ساتھ دو گنی اجرت پر بھی آنے کو تیار نہ تھی۔ بابا واپس پہنچتا ہے تو ایلن کا انتقال ہو چکا ہوتا ہے۔ اشفاق احمد اس کردار کے ذریعے اچھا رویہ، وسعت قلبی اور ایثار و جانثاری کی جانب لطیف سا اشارہ کرتے ہیں۔ انسانیت کا بلند معیار پیش کر کے انسان تو انسان جانور کی جان بچانے کے لیے اپنی جان تک داؤ پہ لگا دینے والا ایلن کا کردار اور روپ سامنے لے کر آتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ایلن کا کردار ایک ایسی غیر ملکی اور غیر مذہب کی عورت کا ہے جو شروع سے آخر تک ہمدردیاں سمیٹنے میں کامیاب ہوتی ہے اور انمٹ تاثر چھوڑ جاتی ہے۔

امی

یہ افسانہ ماں کی مامتا کی کہانی ہے جسے مامتا سے محروم بچہ مسعود مل جاتا ہے جو کہ سوتیلے والد کی وجہ سے زندگی کی عام ڈگر سے ہٹ گیا ہے۔ مرکزی کردار امی اصلا حلی اور متحرک کردار ہے۔ یہ افسانہ بھی تقسیم پاکستان کے دنوں کی کہانی کو بیان کرتا ہے۔ امی کی اولاد گلریز اور دیدی ہے۔ گلریز کا ہم جماعت مسعود اس کے ساتھ کھیلنے اس کے گھر جاتا ہے تو امی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ مسعود امی کی محبت کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ امی اسے بھی اپنے بچے گلریز کی طرح پیار و محبت سے نوازیں دیتی ہے۔ اسی دوران تقسیم ہند کا واقعہ پیش آتا ہے تو دونوں خاندان ٹکڑھٹڑھٹے ہو جاتے ہیں۔ مسعود کی والدہ نے شوہر کی وفات کے بعد دوسری شادی کر لی۔ دوسری شادی سے اولاد ہونے کے بعد اس کی توجہ مسعود سے ہٹ جاتی ہے۔ سوتیلے والد کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑی اور نوکری کرنے لگا۔ جوئے کی لت بھی پڑ گئی۔ تقسیم کے بعد مسعود کی ملاقات بازار میں اچانک امی سے ہو جاتی ہے۔ وہ اسے گھر آنے کی دعوت دیتی ہے۔ مسعود ان کے گھر جاتا ہے۔ گلریز کے اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک ہونے کی وجہ سے اس کا کمرہ خالی ہوتا ہے تو مسعود وہیں رہنا شروع کر دیتا ہے۔ مسعود امی کے گھر رہنے کے باوجود چھوٹی موٹی چوری کر لیتا ہے۔ کبھی پیسے اٹھا لیتا ہے کبھی کچھ۔ امی کی پنشن چار سو روپے ماہوار ہوتی ہے جب کہ گلریز کا خط آتا ہے کہ اسے دو ہزار روپے کی مزید داخلہ فیس کی اشد ضرورت ہے۔ امی پریشان رہنے لگیں تو مسعود جوا کھیل کر رقم دینے کا ارادہ کرتا ہے کیونکہ امی نے زیورات بیچنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک رات جب وہ پورے اٹھارہ سو روپے کی بازی جیت کر نکلتا ہے تو رات کے اندھیرے میں اسی کے ساتھی رقم کی خاطر پیچھے سے چاقو کا وار کر دیتے ہیں۔ یہ گر پڑتا ہے

سامنے گلی سے گشت کرتی پولیس کی آواز سنائی دیتی ہے تو چور بھاگ جاتے ہیں اور رقم ہاتھ لیے مسعود جان دے دیتا ہے۔ اس افسانے کے بارے ڈاکٹر سبینہ اولیس اعوان لکھتی ہیں۔

اشفاق احمد نے معاشرے کے جیتے جاگتے کرداروں کو افسانوں میں پیش کیا۔ اشفاق احمد نے معاشرے میں اصلاح پسندی کو فروغ دیا۔ انھوں نے انسانی زندگی میں محبت کو اولیت دی۔ انھوں نے ایک خوشگوار سماجی زندگی کا تصور مختلف سماجی رشتوں سے قائم کیا۔ وہ ایک پرسکون اور پر امن گھریلو زندگی کو مقدم سمجھتے ہیں۔ انھوں نے محبت کے بل بوتے پر زندگی کے گوشوں کو روشن کیا۔ اس نوع کے افسانوں میں اجلے پھول، شب خون، امی اور گڈریا شامل ہیں۔^{۲۸}

امی کا کردار بہت محنت سے تراشا گیا ہے۔ امی خود بیوگی کی زندگی گزار رہی ہیں لہذا اپنی زندگی کے اس المیے کو گہرائی سے محسوس کرنے کے عمل سے گزری ہیں۔ انتہائی دلی صدمے اور دھچکے کے باعث ان میں مسعود کے دکھ درد کو محسوس کرنے کی صلاحیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ وہ مسعود جیسے ماں باپ سے بچھڑے ہوئے معصوم پھول کی اس زمانے کی روایت کے مطابق تربیت کرنا چاہتی ہے۔ وہ اس کو تعلیم دلانے میں اپنا حصہ ڈالتی ہے تاکہ وہ پڑھ لکھ کر زندگی کے مصائب و مشکلات کو جھیل سکے اور معمول کی زندگی گزار سکے۔ امی کو پہلے دن سے ہی مسعود پر ترس آنے لگا تھا۔ وہ اس کی حالت سے بہت دل گرفتہ ہوئیں۔ پہلی دفعہ مسعود جب گلریز کے ساتھ ان کے گھر پہنچا تو امی سے ملاقات یوں ہوئی۔

پھر اس کی نگاہیں سگتے ہوئے اس لڑکے پر پڑیں۔ جس نے ٹخنوں سے اونچی میلی شلوار پہن رکھی تھی اور جس کی خاکی کینوس کے جوتوں سے اس کی انگلیاں باہر جھانک رہی تھیں۔ گلریز نے

شرماتے ہوئے کہا یہ میرا دوست مسعود ہے۔ امی یہ میرے ساتھ پڑھتا ہے۔^{۲۹}

مسعود کی خستہ حالت دیکھ کر ایک دل سوز منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو امی کا دل پسچ جاتا ہے۔ وہ اسے چائے پانی دیتی ہیں اور گلریز کو نصیحت کرتی ہیں کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو اور مسعود کو تاکید کرتی ہیں کہ گلریز کے ساتھ آجایا کرو۔ امی کے روپ میں اشفاق احمد نے مامتا کے جذبے کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ امی ایک ایسی خاتون کی صورت میں افسانے میں موجود ہیں جو دوسروں کا دکھ درد اپنے سینے میں محسوس کرتی ہے۔ معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے کردار جو مسعود کی صورت میں ہیں۔ ان کو اپنائیت کا احساس دلا کر مہذب انسان بنانا چاہتی ہیں۔ امی کا کردار سادہ مزاج، مہذب اور نفیس ہونے کے ساتھ ساتھ دل موہ لینے والی شخصیت کا ہے جسے صدمات اور حادثات نے نرم و ملائم بنا دیا ہے۔ گلریز جب ولایت تعلیم کے لیے چلا جاتا ہے تو مسعود سے ملاقات کے بعد امی اپنی ساری محبتیں مسعود پر نچھاور کرنے لگتی ہے۔ اسے

مسعود میں اپنے بیٹے گلریز کی صورت دکھائی دینے لگتی ہے۔ مسعود سے ملاقات تقسیم ہند کے بعد جب عید کارڈ والی دکان پر ہوتی ہے تو امی اسے گھر آنے کی دعوت دیتی ہیں۔ بے ٹھکانہ مسعود کو چھت مل جاتی ہے۔ تو اندھا کیا مانگے دو آنکھیں کے مصداق مسعود امی کے پاس رہنے لگتا ہے۔ کبھی کبھار امی کے پرس سے چار آنے، آٹھ آنے چرا لینے سے اس کی زندگی مزید آسان ہو جاتی ہے۔ گلریز ہر مہینے خط ضرور لکھتا جو مسعود کو بھی پڑھنے کو ملتا۔

امی گلریز کا ہر خط مسعود کو ضرور دکھاتی اور پھر اتنی دفعہ پڑھا کر سنتی کہ مسعود کو الجھن ہونے لگتی اور وہ خط پھینک کر باہر چلا جاتا۔ گلریز کے ہر خط میں یا تو روپوں کا مطالبہ ہوتا یا گرم کپڑوں اور دیگر معمولی معمولی چیزوں کا۔ جن کا بندوبست امی بڑے انہماک سے کیا کرتی۔^{۳۰}

ممتا کے جذبے سے سرشار امی اپنے بیٹے کا خط بار بار پڑھواتیں۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ امی کا کردار حقیقی انداز میں پیش کیا گیا۔ جس میں ایک ماں کے جذبات کی عکاسی فطری انداز میں کی گئی۔ پردیس میں بیٹے کی فرمائشیں پوری کرنا ایک ماں کی خوبی ہے جسے عام زندگی کے مشاہدے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح یہ کردار بالکل حقیقی سا لگتا ہے۔ اسی طرح اس کردار کے اندر خوداری اور انا بھی دکھائی گئی ہے کہ آخری خط ماں مسعود کو نہیں دکھاتی جس میں اس نے دو ہزار کی خطیر رقم مانگی تھی۔ امی خود بندوبست کرنے لگ جاتی ہے اور اپنا زیور تک بیچنے پہ آمادہ نظر آتی ہے۔ جہیز کا سارا زیور بیچنے کے لیے لے جاتی ہے حتیٰ کہ اپنی انگوٹھی تک بیچ دینا چاہتی ہے۔ جسے مسعود برداشت نہیں کر پاتا اور اپنے انداز میں ماں کا قرض چکانے کی خاطر رقم کا بندوبست کرنے جوا کھیلنے چلا جاتا ہے۔ امی کی شخصیت میں خوداری اور انا کے ساتھ قربانی اور ایثار کو بھی دکھایا گیا ہے جو قارئین پہ گہرا نقش چھوڑتا ہے۔ جو اس افسانے میں زندگی پیدا کرتا ہے اور نازک معاشرتی صورت حال میں اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ب۔ ایک محبت سو افسانے کے ضمنی کردار

امی (توبہ)

"توبہ" افسانے کے ضمنی کرداروں کا جائزہ لیا جائے جو دونوں کردار زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ وہ مرکزی کردار اعجاز کی والدہ ہے۔ ماں اور ممتا کا جذبہ ایسا جذبہ ہے جو لفظوں میں نہیں بیان ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا کی محبت کا زمین پر دوسرا روپ ماں ہے۔ یہاں پر بھی اشفاق احمد ماں کی محبت کا وہی روپ دکھانا چاہتے ہیں۔ اعجاز کی ماں ہر عورت کی طرح اپنی اولاد سے بے حد پیار کرتی ہے اور اس کو سگریٹ نوشی سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا سگریٹ چھوڑ دے۔ وہ اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنے کو تیار نظر آتی ہے۔ شریٹیں، وعدے، قسمیں، لالچ، دباؤ اور ہر حربہ اختیار کرتی ہے کہ کسی طرح اعجاز یہ کام چھوڑ دے۔ افسانے کے آغاز میں والدہ کا انداز ملاحظہ ہو۔

جب میں نے شارع عام میں سگریٹ پینے شروع کر دیئے تو امی نے دس دس کے دو نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ لے آج سے توبہ کر کہ آئندہ سگریٹ پیوں تو اپنی امی کا خون پیوں۔ میں نے نوٹ جیب میں ڈال لیے کان کھایا، ناک صاف کی، گلے کی خراش دور کر کے امی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور توبہ کر لی۔^{۳۱}

یہ جھوٹ موٹ کی توبہ تھی جو کہ اعجاز نے کی تھی۔ یہ اس طرح کے کئی وعدے کر کے مکر چکا تھا مگر امی بھی اس پہ کچھ نہ کچھ شرط لگانے کو تیار بیٹھی ہوتی تھیں۔ یہاں پر اشفاق احمد والدین کی محبت کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ کس طرح والدین اپنی اولاد کی محبت میں بے بس نظر آتے ہیں۔ اشفاق احمد جو سوچتے ہیں اسی کو اپنے کردار کے ذریعے پیش کر دیتے ہیں۔ یہاں پر بھی امی کا کردار بہت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے جو کہ ایک بھولی بھالی مشرقی عورت ہے اور ہر دفعہ بیٹے کی محبت میں دھوکے میں آجاتی ہے۔ حالانکہ اسے پتہ بھی ہوتا ہے کہ بیٹا باز آنے والا نہیں مگر پھر بھی مامتا کے جذبے سے سرشار ہو کر نت نئے ہتھیار نئے ولولے سے لیکر میدان میں آجاتی ہے۔ ان کو روز ہارنا پڑتا تھا۔ جس کی منظر کشی اشفاق احمد یوں کرتے ہیں۔

پھر انھوں نے روئی کی ایک چھوٹی سے پھریری ”پین کمر“ سے تر کر کے داڑھ میں رکھ لی اور کروشیئے سے دبانے لگیں۔ وہ نوآموز جواری تھیں، کل ہی انھوں نے بیس روپے کا داؤا باسے پوچھے بغیر لگایا تھا اور ہار گئی تھیں۔^{۳۲}

ماں اپنی اولاد کے لیے شفقت و رحمت کا سمندر لیے ہوئے ہوتی ہے۔ بچے کی رگوں میں ماں کا خون دوڑ رہا ہوتا ہے تو ماں ہر ممکن کوشش کرتی ہے کہ وہ اپنا خون، اپنی اولاد، اپنی نسل کو پاکیزہ تر صورت میں معاشرے کے سامنے لے کر آئے۔ اس کردار کے ذریعے اشفاق احمد نے حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔ تخیل سے کام کم سے کم لیتے ہوئے حقیقی زندگی کا کردار اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر گھر میں موجود ماں کا نقشہ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ حالات جیسے بھی ہوں، طبقہ کوئی بھی ہو، معاشرے میں ماں کا کردار اسی صورت میں نظر آئے گا۔ افسانے میں ایسے کردار کی تخلیق اشفاق احمد کا خاصہ ہے۔ گو کہ یہ ایک ضمنی کردار ہے اور مختصر سا رول ہے مگر اس حد تک جاندار کہ افسانے میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ بحیثیت انسان، بشری خوبیوں کا جو خاص پہلو جس زوایے سے اشفاق احمد دکھانا چاہتے ہیں وہ اس میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں کہ یہ ضمنی کردار بھی اچھا خاصا اثر بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

پروین (فہیم)

"ایک محبت سوافسانے" میں دوسرا افسانہ "فہیم" شامل ہے۔ یہ کہانی نانی اماں اور فہیم نامی نواسے کے گرد گھومتی ہے۔ نانی اماں داستانوی انداز میں رات کو سونے سے قبل بچوں کو کہانی سنارہی ہیں۔ وہ اپنی حقیقی زندگی کے قصے، واقعات اور تجربات سنارہی ہیں۔ فہیم مرکزی کردار تھا جو کہ تمام بچوں سے زیادہ لاڈلا، حساس اور سب سے چھوٹا ہے۔ پروین نسرین اس کی دو بہنیں ہیں۔ جن کا معاون اور ضمنی کردار افسانے کو دلچسپی سے آگے بڑھانے میں مدد دیتا ہے یہ ایک پرکشش ضمنی کردار ہے جسے نہایت عمدگی اور نفاست کے ساتھ پیش کیا گیا ہے بے یقینی کی سی کیفیت اس کردار کو انفرادیت بخشی ہے۔ پروین کا بچوں جیسا انداز جو کہ تجسس سے بھرپور ہے، کہانی کو بوریٹ سے بچاتے ہوئے روانی سے آگے بڑھاتا ہے۔ نانی اماں جب اپنے سر کے ہاتھوں سرزنش کا ذکر کرتی ہیں تو سر کے الفاظ دہراتی ہیں جو کہ پروین کو سمجھ نہیں آرہے۔

یاد رکھو تم نے میری بہو اور معصوم بچی کو تنگ کیا ہے۔ معصوم بچی کون نانی اماں؟ پروین نے پوچھا۔ اے تمہاری بڑی خالہ۔ بیٹی، نانی نے جواب دیا۔ وہ چھوٹی سے تھی۔ ابھی پاؤں چلنا سیکھا تھا کہ آنکھیں دکھنے لگیں۔۔۔۔۔ ۳۳

وہ واقعات جو نانی اماں سنارہی تھی وہ بڑے آدمی کو تو سمجھ آرہے تھے مگر یہاں اس کردار کی خوبی یہ ہے کہ جہاں بھی مبہم سے الفاظ سے کہانی آگے چلی پروین نے اس کی وضاحت کے لیے سوال داغ دیا۔ اس سے بچوں کی طبیعت اور ذہنی کیفیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر انہماک سے کہانی سن رہے ہوتے ہیں اور جہاں بھی سمجھ نہ آئے تو آگے نہیں چلنے دیتے جب تک کہ تسلی نہ ہو جائے۔ یہ کردار بھی پروین نامی لڑکی کا ہے جسے کہانی سننے اور سمجھنے کا شوق ہے تو اس کے کردار سے افسانے کو شدت و حرکت ملتی ہے۔ بچوں کا فطری جذبہ تجسس اس کردار کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا پہلو جس کی طرف افسانہ نگار اس کردار کے ذریعے توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ بچوں کے اندر خوف اور ڈر کا جذبہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے جیسے ہی وہ کسی نامانوس چیز کا ذکر سنیں یاد رکھ لیں تو ڈر جاتے ہیں۔ کہانی سننے کے دوران جب نانی اماں لومڑی کا ذکر کرتی ہیں تو پروین ڈر جاتی ہے اور خوف کا اظہار بھی کر دیتی ہے۔

نانی اماں، لومڑیاں یہاں بھی ہوتی ہیں۔ پروین نے خوفزدہ ہو کر پوچھا، نہیں بیٹی، یہاں نہیں ہوتیں۔ یہاں تو صرف بندر رہی ہوتے ہیں۔ نانی اماں نے تسلی آمیز لہجے میں جواب دیا۔ بندر تو ہوتے ہیں پر۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ پروین نے خود ہی فقرہ بچ میں چھوڑ دیا۔ ۳۴

یہاں پروین کا کردار بچوں کی نمائندگی کر رہا ہے اور جانوروں اور درندوں سے ڈر اور خوف کا اظہار کر رہا ہے۔ یہاں پروین کا کردار افسانے کو خوبصورت موڑ دیتا ہے اور سوال جواب کے ذریعے نہایت لاجواب تصادم کی سی صورت حال پیدا

کرنے کا سبب ہے جو قصے کو منطقی نقطہ عروج پر لے جاتی ہے۔ چونکہ یہ ایک ضمنی کردار ہے تو اس حد تک جامع اور مضبوط نہیں کہ کہانی پر اثر انداز ہو سکے مگر اپنی عمر کے مطابق اور افسانے کی ڈیمانڈ کے مطابق خیالات و حرکت سے بھرپور ہے۔ یہ پھیکا اور کمزور کردار نہیں ہے بلکہ جذبات کا گہرا اور شوخ رنگ لیے ہوئے ہے۔ مزاج و مرتبے کے مطابق افسانے میں پروین کے مکالمے اشفاق احمد کی فنکارانہ عظمت پر دلالت کرتے ہیں اور خود اعتمادی کو عیاں کرتے ہیں۔

مار گریٹ (رات بیت رہی ہے)

مار گریٹ "رات بیت رہی ہے" افسانے کا رومانوی کردار ہے۔ یہ امریکی ہوا باز نوجوان پیٹر کی محبوبہ ہے جسے محاذ جنگ پر بہت شدت سے روزانہ بلکہ ہر وقت یاد کرتا رہتا ہے جو کہ پیٹر مار گریٹ کی محبت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ پوچھنے کی حد تک مار گریٹ سے عشق میں مبتلا ہے اور عشق میں پاگل پن کی حدود کو چھو رہا ہے۔ بنیادی طور پر یہ افسانہ دو نوجوان ہوا بازوں پیٹر اور ارشد کی کہانی ہے۔ پیٹر امریکی اور ارشد ہندوستانی جونیوان ہے۔ دونوں اپنی اپنی محبت کو محاذ پر یاد کرتے ہیں۔ مار گریٹ ایک اہم ضمنی کردار ہے جو افسانے کو رواں دواں رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ پیٹر ہر وقت اس کی تصویر اپنے پاس رکھتا ہے اور مار گریٹ کو سب سے جدا اور منفرد قرار دیتا ہے۔ مار گریٹ کو فوجی بہت اچھے لگتے تھے اور اس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے پیٹر فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ پیٹر خود اقرار کرتا ہے۔

مار گریٹ نے مجھے کہا تھا کہ مرد فوج میں بھرتی ہونے کیلئے پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھو میری ٹوپی

پہن کر یہ کس قدر خوش نظر آتی ہے۔ اسے ہوائی فوج سے بہت انس تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ

میں ایک اچھا پائلٹ بن سکوں۔ میں پائلٹ تو بن گیا مگر شاید اچھا نہیں۔^{۳۵}

پیٹر کا جب جہاز دم میں آگ لگنے سے بحری جہاز کے عرشے پہ گرا تھا اور موت و حیات کی کشمکش میں تھا تو اس نے یہ الفاظ ادا کیے تھے۔ اس نے مار گریٹ کی تصویر دیکھنے کی خواہش تھی اور ان الفاظ کے ساتھ جان دے دی تھی۔ انسان زندگی تو جیسے تیسے گزار لیتا ہے مگر موت کے وقت وہ سچائی کا اعتراف ضرور کرتا ہے اور مبالغہ آرائی سے گریز کرتا ہے۔ پیٹر کے یہ الفاظ مار گریٹ سے سچی اور حقیقی محبت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر اس کی محبت میں کھوٹ ہوتا تو مار گریٹ کی خواہش کبھی پوری نہ کرتا۔ مار گریٹ ایک جاندار کردار ہے جو کہ پیٹر کو ہوا بازی کا شعبہ اپنانے پر مجبور کرتا ہے۔ جو کہ اس کی محبت کی سچائی پر دلالت کرتا ہے۔ پیٹر کے اعتراف سے مار گریٹ کا مقام اور بڑھ جاتا ہے۔ مشرقی کرداروں کی نسبت مغربی لوگ محبت کا بانگ دہل اظہار کرتے ہیں۔ جب کہ مشرقی لوگ اپنی محبت کو چھپائے پھرتے ہیں۔ اس کردار میں بھی اشفاق احمد مہارت سے کام لیتے ہوئے مار گریٹ کو خود اعتمادی سے بھرپور لڑکی کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ایسا نڈر، بے باک اور بے

خوف کردار جو کہ محبوب کو فوج میں بھرتی کروادیتی ہے کہ جب اپنے علاقے میں گھوما کریں گے تو لوگ ہمیں سلام کیا کریں گے۔ پیڑ مار گریٹ کے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے۔

یہ اکثر کہا کرتی تھی کہ جب تم وردی پہن کر میرے ساتھ پر سنٹن گلیوں میں چلا کرو گے تو ہر بڑی اور بحری فوجی ہمیں سلام کیا کرے گا۔ کاش اس کی یہ آرزو پوری ہو سکتی۔^{۳۶}

مغرب میں محبوبہ، دوست یا گرل فرینڈ کا کردار بزدل نہیں ہوتا ہے وہ نہیں سوچتی ہیں کہ لوگ ان کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ ان کی بدنامی ہوگی، برادری اور دوستوں میں باتیں ہوں گی یا دنیا والے کیا خیال کریں گے۔ مار گریٹ کے محبوب پیٹر کے ساتھ گھومنے کی خواہش کا اظہار ان کی اپنی ثقافت اور کلچر کے عین مطابق ہے۔ تو کہا جاسکتا ہے کہ مار گریٹ اپنے طبقے کی بھرپور نمائندگی کر رہی ہے۔ اس کی عادات و خواہشات مغربی معاشرے کے عین مطابق ہیں اور یہی اس کردار کی بہت بڑی خصوصیت اور خوبی ہے۔

منی آپا (تلاش)

منی آپا اس افسانے کا ایک ضمنی کردار ہیں جو کہ ایک روایتی لڑکی کے طور پر افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔ منی آپا احسان کی بڑی بہن ہے جس کی شادی مشرقی پنجاب میں میانی میں ہونے والی تھی کہ فسادات کی وجہ سے رک گئی تھی۔ اب یہ لوگ کراچی میں پہنچ چکے تھے۔ منی آپا کو احسان بہت پسند کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کے کتے جیکی کو برانہ سمجھتی تھیں۔ اشفاق احمد نے یہ کردار ایک روایتی لڑکی اور بہن کی عکاسی کرنے کے لیے پیش کیا ہے۔ جسے ہم مصنوعی یا غیر فطری کسی طور پر بھی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اسے ایک مکمل کردار کے طور پر پیش کرنے کی پوری سعی اور کوشش بھی کی ہے۔ گھر میں والدہ کے ساتھ ہاتھ بٹانا، اپنی بڑھائی پر توجہ دینا، چھوٹے بہن بھائیوں کا پوری طرح خیال رکھنا اور اس طرح کے دیگر سنجیدہ اور چیدہ چیدہ کام کرنا منی آپا کے کردار کا خاصہ ہے۔ یہی کچھ ہم مشرقی معاشرے میں ایک گھر میں عام طور پر دیکھتے رہتے ہیں۔ احسان منی آپا کے بارے میں اظہار خیال ان الفاظ میں کرتا ہے۔

منی آپا جیکی کو اس قدر برانہ سمجھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جیسے اور چیزیں گھر میں یونہی پڑی رہتی ہیں۔ ایک یہ بھی سہی۔ دراصل انہیں جیکی سے پیار نہ تھا۔ احسان سے تھا۔ وہ اسے خوش کرنے کیلئے ایسا کرتیں اور اگر وہ موجود نہ بھی ہوتا تو بھی انہیں اس کے کتے سے محبت جتانے میں بڑا مزہ آتا۔^{۳۷}

ایک لڑکی کا کردار جو اپنے بھائی کی محبت میں اس کے کتے کو بھی اچھا جانتی تھی اور برا بھلا نہ کہتی تھی۔ بلکہ موقع ملنے پر ننگے پاؤں سے اس کی پوستانیں سہلانے لگتیں۔ جس کا جواب جیکی زمین پر لوٹ پوٹ کر دیتا۔ وہ احسان کو ستانا اور پریشان نہیں

کرنا چاہتی ہیں۔ حالانکہ گھر میں والدہ، باجی و دیگر افراد کے جیکی کے بارے میں خیالات کچھ اچھے نہیں تھے اور اسے بوجھ سمجھتے تھے۔ مگر منی آپا جیکی کے لیے دل میں احسان کی وجہ سے نرم گوشہ رہتی تھیں۔ اس وجہ سے یہ ایک مخلص اور جھوٹ سے پاک لڑکی نظر آتی ہے جو کہ قاری کو بہت متاثر کرتی ہے۔ اس کے کردار میں گھریلو سنجیدہ زندگی بھرپور طور پر نظر آتی ہے جو کہ ہمدردی اور خدا ترسی سے لبریز ہے۔ گو کہ منی آپا کا رول افسانے میں مختصر آمنظر عام پر آتا ہے مگر جتنی کم نمائندگی ملی ہے اس کے باوجود ایک لڑکی کی بھرپور عکاسی اور جھلک واضح دکھائی دیتی ہے۔ لڑکیاں پڑھائی لکھائی کے بارے میں سنجیدہ طرز عمل کی حامی ہوتی ہیں۔ منی آپا کا طرز عمل بھی ایسا ہی تھا۔

امتحان کے دن قریب تھے۔ منی آپا ڈھیر ساری کتابیں اپنے آگے ڈالے ناک کرید کر تارتخ یاد کیا کرتیں۔ انہیں اب نہ احسان سے انس رہا تھا نہ جیکی سے۔ جوں جوں امتحان قریب آتا جاتا ان کی بیگانگی بڑھتی جاتی۔^{۳۸}

پڑھائی کے ساتھ دیوانگی کی سی حد تک وابستگی اور محنت منی آپا کے سنجیدہ طرز عمل کی عکاس ہے۔ یہی اس کردار کی خوبی ہے کہ لڑکیاں عموماً پڑھائی لکھائی میں دلچسپی لیتی ہیں جبکہ لڑکوں میں کھلنڈراپن زیادہ پایا جاتا ہے۔ ان کی گھر سے باہر سرگرمیاں اور مشاغل انہیں دیگر کاموں میں مصروف رکھتے ہیں۔ وہ تعلیم کو مناسب وقت نہیں دے پاتے۔ سوائے چند ایک ذہین یا سنجیدہ طلباء کے۔ مگر لڑکیاں عموماً محنت کرنے والی ہوتی ہیں۔ گھر کے کام کاج میں بھی مصروف اور دیگر مثبت مشاغل میں بھی سرگرم عمل نظر آتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کردار مشرقی لڑکی کی حیثیت سے نہایت خوبصورتی اور عمدگی سے رقم کیا گیا ہے۔ منی آپا کا رویہ ننھے احسان کے لیے حوصلہ افزائی اور انس و محبت پر مبنی ہے جو کہ ننھے احسان کے لیے تسکین کا باعث ہے۔ منی آپا احسان کے دکھ درد کو اپنا سمجھتی ہیں۔ اس لیے جب خان غصے میں آکر جیکی کو پھینک آتا ہے تو منی آپا بہت حیران ہوتی ہیں اور اپنا رد عمل یوں دیتی ہیں۔

"منی آپا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ واقعی پھینک آئے خان؟" "ہاں" خان نے قاتلانہ اعتراف کیا۔"^{۳۹}

یہاں اشفاق احمد منی آپا کی ذہنی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اسے جیکی کے یوں پھینکوا دینے پر نہ صرف بہت حیرت ہوتی ہے بلکہ بہت صدمہ پہنچتا ہے اور اس کے لبوں پہ سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ بطور بڑی بہن احسان کے لیے دل میں ہمدردی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور خان کے اس عمل سے اس کیلئے نفرت بڑھ جاتی ہے۔ ایک روایتی بہن کی جھلک صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

شب خون

سسٹر، تھارپر، ڈورن، جہلم والی خالہ اور نور بانو اس افسانے کے ضمنی کردار ہیں۔ جو اپنے رول کے مطابق کم یا زیادہ وقت کیلئے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ سسٹر کا کردار ایک ایسی نرس کے طور پر سامنے آتا ہے جو صرف اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔ پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کے دائرے سے باہر نہیں نکلتی۔ ہر وقت اپنے چہرے کے تاثرات کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری دکھائی دیتے ہیں۔ چاہے وہ محبت ہو یا ہمدردی یا نفرت ہو۔ وہ صرف اور صرف سپاٹ چہرے کے ساتھ کام سے مطلب رکھنے والی سسٹر ہے۔ وہ بیٹرس کا جھکاؤ جب شقونامی مریض کی طرف دیکھتی ہے تو اس کو اشارے کنایے سے آگاہ ضرور کرتی ہے اور پیشہ ورانہ رویہ اپنانے پہ اصرار کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے۔

خدا کی پناہ۔ سسٹر نے آکر کہا۔ بیٹرس یہ تمہارے پارٹ پر فیز نہیں۔ ایک پیشٹ

پر اتنا وقت لگا دیا۔ آن فیز، ان جسٹ، پلیزمیک ہیٹ۔^{۴۰}

سسٹر کا کردار نہ صرف اپنی ذمہ داریوں اور حدود و قیود سے باخبر ہے بلکہ وہ دوسروں کو بھی آگاہ کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ مریض اور مسیحا کے رشتے میں شفافیت اور انصاف دکھائی دیا جانا ضروری ہے۔ چچی جان بھی اس افسانے کا ایک اہم ضمنی کردار ہیں۔ وہ ایک شفیق خاتون کے طور پر متعارف کرائی گئی ہے۔ وہ اپنے خاوند شقو کے چچا کو قائل کرتی ہے کہ کیوں نہ اپنی بیٹی کنیز کی شادی شقو سے کر دی جائے جبکہ وہ ابھی بھی ہسپتال میں ہی تھا۔ گو کہ اس فراخ دلانہ پیشکش کے پیچھے شقو کے حصے پر آئی ہوئی زمین دکھائی دے رہی تھی۔ اشفاق احمد نے اس کردار کے ذریعے خاندان میں شادیوں کے پیچھے یہ منطق بتائی ہے کہ موروثی زمینوں کو اپنے خاندان میں رکھنے کے لیے شادیاں خاندان میں ہی کی جاتی ہیں تاکہ زمین اور جائیداد باہر نہ چلی جائے۔ اس مذموم سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لڑکا لڑکی کی ذاتی سوچ، خواہش، کردار، پسند ناپسند یا حالات وغیرہ کو نہیں دیکھا جاتا بس جیسا بھی ہو رشتے اور شادی کے وقت اور کچھ نہیں دیکھا جاتا ہے۔ اسی لیے معاشرے میں بے ڈھنگے جوڑ بکڑ ملتے ہیں جو بس زندگی گزار ہی رہے ہوتے ہیں۔ حقیقی لطف سے محروم ہوتے ہیں۔ اسی خواہش کا اظہار چچی، چچا سے کرتی ہیں۔

میرا دل تو اب بھی یہی چاہتا ہے۔ چچی نے پنکھا جھلتے ہوئے کہا۔ کیا؟ چچا بولے یہی کہ کنیز کی

شادی اب بھی شقو سے ہو جائے۔ واہ پاگل ہوئی ہے۔ وہ بیچارہ پتہ نہیں کتنے دن کا مہمان ہے

اور لگی ہے بیاہر چانے۔^{۴۱}

عورتوں کی سوچ کی عکاسی کی گئی ہے کہ کس طرح مامتا کے جذبے سے معمور ہو کر زندگی کے آخری دنوں میں بھی وہ شقو کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو کرتی ہے۔ حالانکہ شقو بی وارڈ میں زندگی کے پل گن گن کر گزار رہا ہے۔ اس طرح عورتوں

کی ایک عادت اور بھی ہوتی ہے کہ وہ کمزور دل کی مالک ہوتی ہے اور جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتی ہے۔ ذرا سی بات پر ان کی آنکھ سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ فکری و جذباتی کشمکش، بے بسی و بے چارگی کی تصویر ایک عورت جو تھوڑا سا بھی دکھ ملنے پر جذبات اور الفاظ پر قابو نہیں رکھ سکتی ہے۔ ہمدردی اور محتاط رویے کی حامل جہلم والی خالہ بھی ایسا ضمنی کردار میں جو کہ بھانجے کی محبت میں سرشار ہو کر وارڈ میں اسے دیکھنے آتی ہیں تو رونے لگ جاتی ہیں۔

سسٹرنے کہا۔ ایک عورت تمہیں ملنے آئی ہے۔ آنے دو۔ شقونے جواب دیا۔ گو میں بہت تھک گیا ہوں۔ پر اپنوں سے ملنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ جہلم والی خالہ اندر داخل ہوئیں۔ وہ ناک پر رومال رکھے سہمی سہمی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتھیں۔ تم تو بہت کمزور ہو گئے ہو شقو۔ خالہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔^{۴۲}

جہلم والی خالہ کا کردار اور مکالمے جس سوچ کی عکاسی اور نمائندگی کر رہے ہیں اور ان کی ہمارے معاشرے میں کوئی کمی نہیں ہے۔ زندگی موت کی حقیقت کو جاننے کے باوجود بیمار اور مریض کو دیکھ کر دکھی ہو جاتی ہے اور جذبات پہ قابو نہیں رکھ سکتی۔ افسانہ نگار نے عورت کے اس کمزور پہلو کو انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ دیکھا جائے تو اشفاق احمد نے اس افسانے میں جو ضمنی کردار پیش کیے ہیں۔ ان میں گہرا سماجی شعور جھلکتا ہے اور حالات و واقعات کے عین مطابق اپنا کردار بخوبی نبھاتے ہیں۔ تمام کردار اپنے طبقے اور پیشے کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام کردار مختصر وقت میں ظاہر ہونے کے باوجود قارئین کو اپنے سحر میں جکڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

نمدار بن کی کُنج گلی میں

اس افسانے میں نمدار انامی چھیرے کی والدہ اور اس کی ہم جماعت کانت دواہم ضمنی کردار ہیں۔ ویسے یہ افسانہ دو مرکزی کرداروں کے گرد ہی گھومتا ہے مگر چند ایک مقامات پر ضمنی کردار کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ نمدار کی ماں ایک روایتی اور گھریلو عورت ہے جو خود ناخواندہ ہے۔ جھوپڑی میں رہنے والے ماہی گیر اپنے بچوں کو صرف ماہی گیری کا پیشہ ہی سکھاتے ہیں مگر نمدار کو پڑھائی کا شوق تھا۔ وہ سکول سے کالج میں پہنچا تو پچھٹے کپڑے اور پرانے جوتوں کے علاوہ اچھے نمبروں کی سفارش سے اس کی دو آنے فیس معاف ہو جاتی ہے۔ جب ایف اے کے بعد بی اے میں داخلہ لینا ہوتا ہے تو نمدار کی ماں پڑھائی کی اہمیت کی قائل نہ ہونے کی بنا پر حمایت نہیں کرتی مگر نمدار اسے قائل کر لیتا ہے۔ نمدار کی ماں نے ایک ایسی عورت کے کردار کو نبھایا ہے جو مامتا کے جذبے سے بھی معمور ہے مگر پڑھائی لکھائی کو ایک فضول قسم کی امیروں کی عیاشی سمجھتی ہے۔ نمدار ماں کے خیالات اس طرح بیان کرتا ہے۔

چاچا کی طرح ماں بھی میری پڑھائی کے خلاف تھی۔ مگر اسے جب پتا چلا کہ بی اے کرنے کے بعد مجھے ڈگری کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت بنگلہ اور پیاری سی کار بھی مل جائے گی تو اس نے میری مخالفت چھوڑ دی اور میری لائین کی چیمنی کو ہر روز اپنی اوڑھنی سے صاف کرنے لگی۔^{۴۳}

ماں کا کردار چونکہ اس افسانے میں ایک روایتی عورت کا ہے جسے پڑھائی لکھائی کے فوائد کا نہیں پتہ بلکہ جب اسے گریجویشن کے بعد نوکری کا پتہ چلتا ہے تو وہ بیٹے کی محنت اور عظمت کی قائل ہو جاتی ہے۔ اس کی نظر میں وہ خواب اشفاق احمد نے سجائے اور دکھائے ہیں جو ہر والدین اپنی اولاد کے لیے دیکھتے ہیں۔ گاڑی، بنگلہ، نوکر وغیرہ کا خواب ہر غریب امیر ماں باپ کی نظر میں ہوتا ہے۔ یہاں بھی ماں اپنے بیٹے کی خاطر خدمت اس وجہ سے اور زیادہ کرنے لگتی ہے کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر سرکاری افسر بن جائے گا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ اس طرح یہ کردار غریب کی جھونپڑی میں رہنے والی ماں کی آنکھ کے اندر چھپے خواب کو دکھانے کی کوشش کرتا ہے جس میں پڑھائی کی تکمیل کے ساتھ ہی نوکری اور نوکر مل جانے ہیں۔ کانتا، سریندر، کلثوم اور نمدار کے ہم جماعت ساتھی ہیں۔ جو کالج کے ماحول اور کلاس کی بحث وغیرہ میں حصہ لینے کی وجہ سے افسانے میں نظر آتے ہیں۔ نمدار کو شرارتیں کرنے اور مزاح پر مبنی گفتگو کی عادت تھی۔ ایک جماعت میں ان کے درمیان یوں مکالمہ ہوتا ہے۔

کانتا نے پوچھا۔ پھولوں میں سے اچھا پھول کون سا ہے؟ گو بھی کا۔ میں نے ایک دم جواب دیا۔ سریندر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ بھئی ایسا غیر شاعرانہ جواب ادب کی کلاس میں۔۔! کانتا نے کہا میرا مطلب ہے سب سے اچھی خوشبو والا پھول کون سا؟ میں نے جواب دیا۔
رومن چپل پراون کا پھول۔^{۴۴}

کانتا اور سریندر کلثوم نمدار کے ہم جماعت ہیں جن کی وجہ سے کالج کی سرگرمیوں سے آگاہی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور مقام پر ان کا خاص جاندار سا اظہار نہیں ملتا ہے۔ یہ کردار کچھ دیر کے لیے ہی نمودار ہوتے ہیں اور کہانی میں بوریت سے بچاؤ کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ عام زندگی کے مشاہدے اور تجربات میں ایک دوسرے کو شریک کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پس منظر اور ماحول کی وجہ سے ایک دوسرے میں مماثلت بھی نظر آتی ہے۔ انفرادی جذبات و احساسات کے ذریعے افسانے کو رواں دواں رکھنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور کہانی کو انجام تک پہنچاتے ہیں۔

ماں، دیدی (امی)

ماں اور دیدی دو ایسے ضمنی کردار ہیں جو افسانے میں مسعود کے ساتھ معاون کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ماں مسعود کی حقیقی ماں ہے جو اس کے والد کی وفات کے بعد مسعود کو پالتی ہے اور دیدی گلریز کی بڑی بہن ہے۔ ماں کا کردار افسانے میں

مظلوم عورت کی نمائندگی کرتا ہے۔ معاشرے میں عورت مظلومیت کی چلتی پھرتی تصویر ہے۔ خاص طور پر ایک بیوہ عورت کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل امر ہے۔ حالات کے ظلم و ستم کا شکار عورت زندگی اور اولاد کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی ہے اور اقدامات اٹھاتی ہے۔ مگر عام طور پر ناکامی اور مایوسی ہی مقدر ٹھہرتی ہے۔ ماں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا ہے جو مسعود کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔

مسعود کی ماں نے اپنے خاوند کی موت کے ایک سال بعد ہی اپنے کسی دور کے رشتہ دار سے شادی کر لی تھی۔ اول اول تو اس کی دوسری شادی کا مقصد مسعود کی تعلیم و تربیت تھی لیکن اپنے دوسرے خاوند کی جابرانہ طبیعت کے سامنے اسے مسعود کو تقریباً بھلانا ہی پڑا۔^{۴۵}

ہمارے معاشرے کی ستم ظریفی یہ ہے کہ بیوہ اگر شادی نہ کرے، عقد ثانی نہ کرے تو معاشرے کی نظر میں عفت اور پاکدامنی ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اگر کر لیتی ہے تو مزید اولاد ہو جانے کی صورت میں پہلی اولاد کی تربیت بہت متاثر ہوتی ہے۔ کیونکہ ساری توجہ دوسرے گھر کو بسانے پر ہوتی ہے۔ سوتیلے والد کا سلوک بھی پہلی اولاد کے ساتھ مناسب نہیں ہوتا ہے۔ وہ اسے اپنا خون ماننے سے عموماً انکاری ہوتے ہیں لہذا وہ اسے نظر انداز ہی کرتے رہتے ہیں۔ ماں کے ساتھ بھی اس افسانے میں کچھ ایسا ہی رویہ روار کھا جاتا ہے جس کی بنا پر ماں کا مقام مسعود کی نظر میں کم ہو جاتا ہے۔ وہ اسے ناپسند کرنے لگتا ہے۔ سوتیلے والد کی سخت طبیعت، تحکمانہ لہجہ، طعن و طنز وغیرہ مسعود کے ساتھ ساتھ ماں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ماں نے مظلوم عورت کا کردار بخوبی نبھایا ہے۔

دید کی گریز کی بڑی بہن ہے۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والی لڑکی ہے۔ اس نے مسعود کی گھر آمد کا نوٹس نہ لیا۔ بلکہ سپاٹ سار د عمل دیا۔ جب پہلی دفعہ مسعود گلریز کے ساتھ ان کے گھر جاتا ہے تو دیدی کا رد عمل کچھ یوں تھا۔

گلریز نے اندر داخل ہو کر کہا۔ دیکھو دیدی دیکھو میرے پاس جادو کا کارڈ ہے اور دیدی نے

سلائیوں سے نگاہیں اٹھائے بغیر کہا۔ اچھا ہے۔ مسعود دیدی کا رویہ دیکھ کر بادب ہو گیا اور

گلریز خفیف ہو کر جالی کا دروازہ زور سے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ دیدی نے ماتھا سکیر کر کہا،

آہستہ اور پھر سوالیہ نگاہوں سے مسعود کو دیکھ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔^{۴۶}

دید کی کالج کی طالبہ تھی اور لڑکیاں اس عمر میں سنجیدگی اور وقار کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ وہ مناسب سافاصلہ رکھتی ہیں اور ہر کسی کے ساتھ جلدی گھل مل جانا پسند نہیں کرتی ہیں۔ یہاں بھی دیدی کا رویہ اس کی عمر کے عین مطابق ہے اور اس افسانے میں دیدی کے کردار کے ذریعے فطری اور جبلی رویہ و صورت حال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو دیدی کی نفسیات اور طرز عمل کا آئینہ دار ہے۔

ج۔ "اُبلے پھول" کے مرکزی کردار

عطیہ بانو (شک)

عطیہ بانو اور سرور کے رومانس پر مشتمل یہ افسانہ محبت کے حصول میں ناکامی اور قربانی کے ایک نئے پہلو کو واضح کرتا ہے۔ گاؤں کے بڑے پیر زادہ صاحب کی بھتیجی عطیہ بانو ایف اے کرنے لاہور کالج جاتی ہے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب وہ گاؤں آتی ہے تو پیر زادہ صاحب گاؤں کے بی اے پاس نوجوان سرور کو اسے پڑھانے کی ذمہ داری دے دیتے ہیں۔ پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو جلد ہی عشق و محبت میں بدل جاتا ہے۔ عطیہ بانو کی شادی گھر والے ایک مالدار نوجوان عزیز الدین سے طے کر دیتے ہیں۔ عطیہ بانو سرور کو کہتی ہے کہ تم بھی مال و دولت اکٹھی کرو تا کہ میرے والدین راضی ہو سکیں۔ اس افسانے میں محبت کو انسانی ہوس کی بھینٹ چڑھتے دکھایا گیا ہے۔ وہ سرور کو زندگی کی ناہمواریوں اور تاریک راستوں سے گزرنے کا حوصلہ دیتی ہے مگر سرور جیسے عام آدمی کے بس میں نہ تھا کہ وہ کامیابی حاصل کر سکتا۔ طبقاتی امتیاز اور محبت و خلوص کا ایسا تصادم دکھایا گیا ہے جو معاشرے کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے کا بالادست اور طاقتور طبقہ اس نظام کی آبیاری میں لگا ہوا ہے۔ جس میں ظاہری بناوٹ، رکھ رکھاؤ اور طبقاتی کشمکش کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ بلندی پستی، امیری غربتی، حق ناحق، ظلم و انصاف، سرمایہ داری و مزدوری ایسے نکتے اور سوالات ہیں جو اس نظام کی اصلاح میں حائل رکاوٹ ہیں۔ اس افسانے میں عطیہ بانو کا سماجی رتبہ بلند ہوتا ہے تو اس کی سوچ میں بھی مادیت پرستی جھلکتی ہے۔ جب چھٹیوں کے بعد سرور اُسے ملنے کالج جاتا ہے تو وہ اسے بتاتی ہے۔

پچھلے اتوار کو بڑے اباجی یہاں آئے تھے۔ انھوں نے میری منگنی کا پکا ارادہ کر لیا ہے۔ کوئی عزیز

الدین ہے۔ جنگ میں انیس ہزار روپیہ کمایا ہے اور اباجی نے اس کی پاس بک دیکھ کر ارادہ پکا کر لیا

ہے۔ اور تم نے۔۔؟ سرور نے آہستہ سے پوچھا۔ میں کیا کروں سرور؟ وہ رونے لگی۔^{۴۷}

شیلے کی نظمیں سننے والا سرور اسے رحم طلب نگاہوں سے دیکھتا ہے مگر عطیہ بانو کا تعلق بھی بالادست طبقے سے تھا۔ وہ ایک خیمے میں سرور کے ساتھ شکار کے گوشت اور کہانیوں کے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتی تھی؟ اشفاق احمد نے یہ کردار جس طبقے سے لیا ہے۔ اس کی مکمل سوچ کی عکاسی عطیہ بانو کرتی ہے۔ عطیہ بانو گو کہ سرور کے عشق میں مبتلا ضرور تھی مگر کوئی بھی بڑا فیصلہ لینے سے پہلے مکمل شعور اور ہوش حواس سے کام لیتی ہے۔ وہ اسے پسند ضرور کرتی ہے مگر زندگی گزارنے جیسے فیصلے کو اپنے والدین کی رضامندی اور خوشنودی پہ چھوڑ دیتی ہے۔ ویسے بھی والدین کے فیصلے میں اسے دلکشی اور کشش نظر آرہی ہوتی ہے جب کہ سرور کے ساتھ تو غربت اور مفلسی صاف نظر آرہی ہوتی ہے۔ عطیہ بانو سرور سے کہتی ہے۔

”اگر تم بھی بزنس کیا کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اگر تمہارے پاس اتنا ہی روپیہ ہوتا تو اباجی کبھی بھی انکار نہ کرتے۔“ ۴۸

یہاں عطیہ بانو کی خود غرضانہ سوچ کھل کر سامنے آتی ہے جو سرور کے خلوص اور عشق کو روپے پیسے میں تو لٹا شروع کر دیتی ہے اور اصل مجبوری بتا دیتی ہے کہ اگر اس کے پاس بھی روپیہ پیسہ ہو اور وہ اُسے خریدنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو عطیہ بانو کو حاصل کر سکتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے اشفاق احمد نے اعلیٰ طبقے کے کھوکھلے پن اور اخلاقی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے اور معاشرے کے متوسط اور پسماندہ طبقے کی سوچ اور حالات زندگی کو اجاگر کیا ہے۔ اس کردار کے ذریعے خانگی اتار چڑھاؤ، تہذیبی و تمدنی کشمکش کے ساتھ اونچ نیچ کو بھی سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ پسماندہ طبقہ حالات سے مفاہمت کیے بس زندگی کو اُسی ڈگر پہ جیے جا رہا ہے اور حالات کو مشیت ایزدی سمجھ کر قبول کیا ہوا ہے۔ جب کہ طبقہ اشرافیہ ان کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ دونوں طبقات کی سوچ، مشاغل، حالت زار، آن بان اور مظلومیت جیسے مماثل عوامل کو سامنے لاتے ہوئے افسانہ نگار خالم سماج کی ان دیکھی رکاوٹوں کا ذکر کرتا ہے جو ان کو آپس میں محبت ہونے کے باوجود ملنے نہیں دیتا۔ یہ فطری اور پیدائشی حق ہونے کے باوجود رسم و رواج کی بندشوں سے آزاد نہیں ہیں۔ اور دو کرداروں کو اپنی پسند کی زندگی گزارنے کی اجازت نہیں مل پاتی۔

آپی (اجلے پھول)

”اجلے پھول“ افسانے کا مرکزی کردار آپی ہے جو کہ ادب دوست نوعمر لڑکی کے طور پہ افسانے میں متحرک دکھائی دیتی ہے۔ آپی اپنے خاندان کے ہمراہ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی تھی۔ بی ایس سی کے بعد گھر والوں کی منت، خوشامد اور دباؤ، دھمکی کے باوجود ایم بی بی ایس میں داخلہ نہ لیا اور گھریلو زندگی گزارنے لگی۔ ان کے گھر اس کے تایا زاد انجم بھائی کی آمد ہوتی ہے جو بسلسلہ ملازمت ان کے شہر میں ہونے کی بنا پر ان کے گھر رہنے لگے۔ دونوں کی ہم آہنگی کو محبت میں بدلنے میں دیر نہ لگی۔ مگر دونوں کو ایک ہونے میں جو رکاوٹ آڑے آتی تھی۔ وہ دونوں گھرانوں کے تعلقات میں سرد مہری تھی۔ جس کی بنا پر دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے کے باوجود ایک نہ ہو سکتے تھے۔ مگر کہانی میں اس وقت ڈرامائی موڑ آتا ہے جب انجم بھائی کو فوج میں کمیشن مل جاتا ہے اور وہ برما کے محاذ پہ چلا جاتا ہے۔ وہاں وہ اپنے والد کو آمادہ کر لیتا ہے۔ اس کے گھر والے آپی کا رشتہ مانگنے آجاتے ہیں جسے بخوشی قبول کر لیا جاتا ہے اور منگنی ہو جاتی ہے۔ دو سال بعد محاذ سے انجم بھائی کی واپسی ہونا تھی۔ سارے گھر والے ریلوے اسٹیشن جاتے ہیں مگر صرف ان کا سامان ہی پہنچتا ہے۔ دوسرے دن ان کی لاش آجاتی ہے۔ یوں محبت کی ادھوری کہانی تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ آپی کی شادی کسی اور سے کر دی جاتی ہے اور وہ چھوٹی بہن کے ہمراہ اجلے پھولوں کی لڑیاں اور گل دستے قبرستان رکھنے چلی جاتی ہے۔ آپی کا کردار ادب دوست اور جمالیاتی حس کا مالک ہے۔ دونوں کی غیر رسمی ملاقات اور بات چیت غیر ارادی طور پر آگے بڑھتی چلی

جاتی ہے اور محبت کے نقطہ عروج تک پہنچ جاتی ہے۔ افسانے کا آغاز چاندنی رات میں اگلے پھول چننے کی منظر کشی سے ہوتا ہے۔ دونوں بہنیں بنگلے کی پھلواری باغیچے میں پھول چن رہی ہوتی ہیں جو کہ قبر پر ڈالنے جانا ہوتا ہے۔ مناظر فطرت کی دلدادہ آپی پھولوں کو قبر کے لیے چننے میں مصروف ہوتی ہے۔ تجسس کی کیفیت میں راوی ماضی کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ جب اس کا بی ایس سی کا نتیجہ دیکھنے سارے لوگ یونیورسٹی جاتے ہیں۔ وہ پاس ہوتی ہے۔ مگر اپنا نتیجہ دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی کہ کہیں فیل نہ ہو جاؤں۔ پاس ہو جاتی ہے مگر ایم بی بی ایس میں داخلہ نہیں لیتی۔ گھر والے منت خوشامد بھی کرتے ہیں۔ والد نے لاڈ پیار کے ساتھ دھمکی، دباؤ بھی ڈالا مگر ہر حربہ ناکام رہا۔ جب یہ بات نہ مانی تو والدہ کو شک ہوا کہ لڑکی کو کسی سے پیار اور عشق وغیرہ تو نہیں ہو گیا جو کہ اس عمر میں عموماً ہو ہی جاتا ہے۔ والدہ اپنے بچوں کی بہترین دوست بھی تھی۔ والدہ اس معاملے کی تفتیش یوں کرتی ہیں۔

آلا جی نے آپی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بڑے پیارے لہجے میں انگریزی میں پوچھا "میری پیاری بچی تمہیں کسی سے محبت تو نہیں؟ آپی ہنس پڑیں اور آلا جی کا ہاتھ تھپتھا کر کہنے لگیں "جب ہوگی تو سب سے پہلے آپ کو ہی بتاؤں گی"۔^۹

ایف ایس سی میں فرسٹ ڈویژن نہ ہونے کی بنا پر جب میڈیکل میں داخلہ نہ ملا تھا تو آپی نے مجبوراً بی ایس سی میں داخلہ لیا تھا اور اب اس وجہ سے مزید تعلیم جاری نہیں رکھنا چاہتی ہے مگر اس کی والدہ آلا جی کو خدشہ تھا کہ بات نہ ماننا اور زندگی سے جی اُچاٹ ہو جانا کہیں عشق کا نتیجہ نہ ہو۔ آپی چونکہ ادب کی دلدادہ لڑکی ہے لہذا وہ اردو انگریزی ادب کو کھنگالنا شروع کر دیتی ہے اور لائبریری کی ادبی کتب کو پڑھنا ہی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیتی ہے۔ اسی عرصہ کے دوران ان کے گھر میں اس کے تایا زاد انجم بھائی کی آمد اور قیام سے زندگی میں تبدیلی اور رونق آنا شروع ہو جاتی ہے۔ انجم بھائی قصہ گھڑنے کا ماہر، شعر و شاعری کا شغف رکھنے والا انسان تھا لہذا بات ادبی گفتگو، اشاروں کنایوں اور شعر و شاعری کے تبادلے سے آگے نکل جاتی ہے اور دونوں کو محبت کے بڑھتے ہوئے جذبے میں گرفتار ہو جانے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ آپی چونکہ مشرقی گھرانے کی عورت ہے اور دونوں خاندانوں کی دُوری کو بخوبی جانتی ہے اس لیے وہ مزید آگے نہیں بڑھنا چاہتی ہے اور خود کو روک بھی نہیں پاتی ہے۔ اسی دوران انجم بھائی کو برما کے محاذ پر جانے کا حکم نامہ مل جاتا ہے اور ان کو سارے لوگ رخصت کرنے ریلوے اسٹیشن پہ آتے ہیں۔ انجم بھائی آپی کو مایوس نہ ہونے کی تلقین کرتے ہیں اور مثبت انداز اپنانے کی بات کرتے ہیں۔ وہ آپی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ میں محاذ پر ضرور جا رہا ہوں لیکن میں اپنے والدین کو آمادہ ضرور کر لوں گا۔ اسی طرح ہوا کہ دونوں گھرانوں کے درمیان تلخیاں اور غلط فہمیاں کم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ سرد مہری کا خاتمہ انجم بھائی کے خطوط کی بدولت ہوا اور اس لڑکی کی زندگی میں خوشی واپس لوٹ آئی۔

پہلے تو بتایا جی نے لوگوں کے ذریعے آپ کی رشتے کا یو نہی سا اظہار کیا لیکن ایک دن تائی جی کو ساتھ لے کر خود آپہنچے اور آپ کی رشتے کی درخواست کی، منگنی ہو گئی۔^{۵۰}

آپ کی منگنی سے اس لڑکی کو خوشی مل جاتی ہے۔ وہ مایوسی اور قنوطیت جو اس کردار پہ آغاز میں چھائی ہوئی تھی، ہٹ جاتی ہے۔ اشفاق احمد نے آپ کی کردار کو فطری انداز میں ایک عام گھریلو لڑکی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ یہ چالاک اور شاطر نہیں بلکہ بھولی بھالی قسم کی لڑکی ہے۔ جو لفظوں اور جذباتوں کے سہارے زندگی گزار رہی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ خواب اشفاق احمد نے سجائے ہوتے ہیں جن کی تکمیل اور تعبیر منگنی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ انجم بھائی کے فوج میں جانے کے بعد اور برما کے محاذ پر دو سال تعیناتی سے دونوں کے محبت کے جذبے میں کمی نہیں آتی بلکہ خطوط کے تبادلے سے جذبات اور خیالات ایک دوسرے تک پہنچائے جاتے ہیں۔ مگر آپ کی انجم بھائی کی واپسی سے خوشی کی بجائے صدمہ جھیلنا پڑ جاتا ہے کیونکہ برما سے زندہ واپسی کے بجائے براستہ دہلی لاش ہی واپس آتی ہے۔ یوں محبت کی کہانی ادھوری رہ جاتی ہے۔ آپ کی شادی دوسری جگہ طے کر دی جاتی ہے۔ جب وہ میکے آتی ہے تو قبرستان ضرور جاتی ہے۔ اور گھر کے باغیچے سے پھول توڑ کر قبر پہ ڈالے جاتے ہیں۔ خلوص، چاہت، وفاداری اور محبت کے ساتھ ساتھ وضع داری بھی اس کردار کی ایک خوبی ہے جو کہ اس کردار کو سب سے الگ، سب سے جدا اور سب سے منفرد کر دیتی ہے۔ مشرقی اقدار اور روایات کا بھرم رکھنے والی لڑکی تمام اصولوں، رسومات اور بندشوں کی پابندی کرنا لازم سمجھتی ہے جو اسے ممتاز حیثیت دلانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

ثریا (برکھا)

ثریا اس افسانے کا رومانوی کردار ہے۔ یہ کہانی اس کی ایک طرفہ محبت پر مبنی ہے۔ جس میں اس کی ہم راز اس کی دوست امینہ ہے۔ اشفاق احمد کا یہ افسانہ ایک ایسی عمر کی لڑکیوں کی کہانی پر مشتمل ہے جس میں انسان کے بھٹک جانے کا خدشہ کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ ثریا ایک ایسی لڑکی ہے جس کی عمر سولہ برس ہے اور ابھی ابھی میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی کوئی مصروفیت نہیں ہے۔ جس طرح عموماً ہمارے معاشرے میں ہوتا ہے کہ امتحان کے بعد نتائج کا انتظار کیا جاتا ہے۔ ثریا بھی شب و روز سو کے گزار رہی ہے۔ اس کے مشاغل میں گانے سننا، ریڈیو کے فرمائشی پروگرام سننا، ہفتہ وار اور ماہانہ رسالے منگوانا وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی سہیلی امینہ کے ہاں اسے آنے جانے کی اجازت تھی۔ لیکن سخت گرمی کے دن اور گھر سے نکلنے کو دل ہی نہ کرتا۔ انھی دنوں ان کے ہمسائے لطیف صاحب کا بھانجا گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے ہاں رہنے کے لیے آ جاتا ہے۔ ثریا اس کے بارے میں خواب دیکھنے لگتی ہے۔ وہ بھی چھت پر یا صحن پر بیٹھ کر کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہے۔ اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔ سگریٹ پینا اس کی عادت تھی یا شام کو کبھی کبھی محلے

کے بچوں کے ساتھ گلی میں کرکٹ کھیل لینا۔ ایک دو دفعہ اس کی آنکھیں اس سرخ و سفید لڑکے سے دوچار ہوئیں مگر اسی دوران طویل وقفے کے بعد بارش برس جاتی ہے اور وہ لڑکا واپس چلا جاتا ہے۔ یہ افسانہ ثریا کی ایک طرفہ اور ادھوری محبت کی کہانی ہے۔ جسے وہ صرف امینہ سے چھپا نہیں سکتی اور اس کو اُس لڑکے کے بارے میں بتاتی ہے۔ وہ چند دن کا مہمان واپس چلا جاتا ہے اور محبت کی کہانی شروع ہونے سے پہلے ہی انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ امتحان دے دینے کے بعد ثریا کی مصروفیت کو اشفاق احمد نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

اسے فرمائشی پروگرام سننے، جی بھر کے سونے اور فلمی رسالے پڑھنے کے علاوہ صبح و شام باقاعدگی

سے دودھ بھی پینا ہوتا تھا کیونکہ اس کی امی کے نزدیک رنگت نکھارنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔^{۵۱}

اشفاق احمد نے اس عمر اور ان حالات میں جبکہ کوئی طالبہ / طالب علم میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہوا ہو، کے مشاغل کو ثریا کے کردار کے ذریعے سامنے لایا ہے۔ اس وقت ثریا کا کوئی کام نہ تھا سوائے سونے کے۔ سونے کے لیے بھی وہ دن چڑھے تک سوئی رہتی۔ رات دیر تک جاگنا، کہانیاں پڑھنا، فرمائشی پروگرام سننا اور فلمی رسالے پڑھنا، ثریا کے دل پسند مشغلاتھے۔ لیکن یہ ایک ثریا کی نہیں بلکہ اس لڑکی کی کہانی ہے جو امتحانات سے فارغ ہوئی ہو اور گھر میں بھی اس کے لیے ابھی کوئی خاص مصروفیت اور ذمہ داری نہ ہو تو وہ وقت گزاری کے لیے اس طرح کے شوق پال لیتے ہیں۔ دوسرا اشفاق احمد اس کردار کے ذریعے اس عمر کی لڑکیوں کی کیفیات اور محسوسات سے آگاہ کیا ہے۔ یہ بلوغت کی عمر ہوتی ہے اور اس میں لڑکیوں کی جسمانی و جذباتی کیفیات کی تبدیلی کے سبب ایسے نازک مرحلے سے گزر رہی ہوتی ہیں کہ بہک جانے کا اندیشہ موجود ہوتا ہے۔ اشفاق احمد نے اس نازک موضوع پر بھی اصلاحی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے قلم اٹھایا ہے کہ اس عمر کی نادانی کو واضح کیا جاسکے اور خطرات و نقصانات کو سامنے لایا جائے۔ جس کی بدولت اس دور میں کی گئی غلطیاں اور غلط فہمیاں پوری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کیونکہ اگر انسان کے جذبات مجروح ہو جائیں یا ان کو ٹھیس پہنچ جائے یا جذبات کوئی غلط رخ اور راہ اختیار کر جائیں تو ساری زندگی کے لیے پچھتاوے اور ندامت انسان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ثریا کی بھی تھی۔ وہ بھی اپنی عمر کی لڑکیوں کے عین مطابق دن کو رومانوی خواب دیکھنے میں مصروف رہتی تھی۔ خود ہی اس لڑکے کے بارے میں سوچتے رہنا، اُس کے بارے میں اپنی سہیلی امینہ سے باتیں کرنا اسے اچھا لگتا۔ اس عمر میں ایک طرفہ محبت ہو جانا بھی ایک عام سی بات ہے اور یہ ہی ثریا کے ساتھ بھی ہوا۔ اُسے دن رات اس کے بارے میں سوچتے سوچتے محبت سی ہونے لگتی ہے۔ ایک دن جب وہ سگریٹ لے کر واپس آ رہا تھا۔ تو اس نے ثریا کو کھڑکی کھولے دیکھا تو ثریا کو انتہائی خوشی کا احساس ہوا۔ ثریا نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔

اگر گیارہ گنتے گنتے وہ اس کھڑکی کے پاس آکر السلام علیکم کہہ دے تو چاہے کچھ بھی ہو میں مصافحہ کے لیے ہاتھ باہر نکال دوں گی۔ جب ثریا سات پر پہنچی تو وہ کھڑکی سے دو تین قدم آگے نکل چکا تھا۔^{۵۲}

اشفاق احمد نے یہاں اس کردار کے ذریعے اس عمر کی ایک طرفہ چاہت کو واضح کیا ہے۔ وہ جذبات کو مجروح ہونے سے بچانا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں کیونکہ اس نوخیز عمر میں لڑکیاں جذباتی انداز میں کی گئی شروعات میں سنجیدہ ہو کر بہت دور تک نکل جاتی ہیں جہاں سے واپسی بعض اوقات مشکل ترین یا ناممکن سی ہو جاتی ہے۔ اشفاق احمد نے انھی وجوہات کو بیان کیا ہے تاکہ زندگی میں ندامت اور تکلیف کا سبب بننے والی وجوہات سے بچا جاسکے۔ لڑکیوں کی بڑھتی ہوئی عمر کے اتار چڑھاؤ اور تبدیلیوں کو مثبت انداز میں سنبھالا جاسکے تاکہ ان کی زندگی کو پہنچنے والے ناقابل تلافی نقصان سے بچا جاسکے۔ دوسرے لفظوں میں اشفاق احمد ثریا کے کردار کے ذریعے معاشرے میں برائیوں اور منفی رجحانات کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ تعلیم کے حصول کے باوجود بعض اوقات انسان کے لڑھک جانے کا خطرہ بدستور موجود رہتا ہے۔ افسانہ نگار غلط راستوں پر چلنے کے بجائے ان کی حوصلہ شکنی کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ایسی روایات کو جو فطرت اور قدرتی عمل کے خلاف ہوں، ان کی نفی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور ایسے تمام تر عناصر اور عادات جو انسان کے لیے نقصان دہ اور معیار سے کم تر ہوں، ان کو اپنا کراشراف المخلوقات کے مرتبے سے نیچے نہیں گرنے چاہیے۔ وہ عارضی جذبوں کو دائمی نقصانات کے عوض گروی نہیں رکھنا چاہتے بلکہ نئی نسل کو اس سے بچانا چاہتے ہیں۔ صحت اور اخلاق کو تباہ کرنے والے تمام عوامل سے نئی نسل کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اقدار اور روایات کی پامالی نہ ہو سکے اور برے اثرات سے بچا جاسکے۔

ایل ویرا

ایل ویرا ایک اطالوی لڑکی کا نام ہے جس کے نام پر افسانے کا نام رکھا گیا ہے۔ یہ افسانہ اسی رومانوی کردار کی سچی اور خالص محبت کی کہانی ہے۔ اشفاق احمد کے افسانوں کا بنیادی موضوع محبت ہے جو مختلف روپ میں ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ اشفاق احمد انسانوں کے نرم و نازک احساسات کی ترجمانی بہت رومانوی انداز میں کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو اور ہر طبقے کی محبت کو بہت احسن طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ ایل ویرا پیشے کے لحاظ سے طوائف ہے جس کی ملاقات مصنف پروفیسر سے کار میں ہوئی جب وہ اپنے دوست ٹھا کر کے ساتھ لانگ ڈرائیو پہ نکلے تھے تو موج مستی کے لیے دو لڑکیوں کو ساتھ بٹھالیا۔ دو ہزار لیرے (اطالوی کرنسی) طے ہوئے مگر دوران سفر مناسب موقع اور جگہ نہ ملنے کے باعث ان طوائفوں سے تلخ کلامی ہو گئی اور پروگرام منسوخ کر کے واپس چل پڑے۔ سفر کے اختتام پر پوری قیمت ادا کی اور بتایا کہ میں دانش گاہ روم کے شعبہ شریقات میں اردو کا استاد ہوں۔ وہ اس کے رویے سے بہت متاثر ہوئی۔ دوسرے دن یونیورسٹی آ پہنچی۔ پروفیسر

اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا مگر ایل ویرا پروفیسر کو دل دے بیٹھی۔ پروفیسر بدنامی کے ڈر سے ایل ویرا سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا مگر یہ اس کے اتنا ہی قریب ہوتی گئی۔ پروفیسر کے چھوٹے موٹے کام خوش دلی سے کر دیتی۔ پروفیسر اطالیہ کے نواب ستانالی خاندان کی لڑکی سینور نیاماریا میں دلچسپی لینے لگا تو یہ بھی اس کی خوشی میں خوش تھی۔ یہ ایل ویرا کو نظر انداز کر کے ماریا کو وقت دیتا رہا کہ مدت ملازمت ختم ہو جانے پر واپسی کا پروگرام بنا تو پروفیسر نے ایل ویرا کو بندرگاہ آنے سے روک دیا کہ نواب خاندان کی عورتیں آئیں گی لیکن لوگ نہ آئے اور ایل ویرا محبت کے ہاتھوں مجبور بندرگاہ پہ چھپ کر پہنچ جاتی ہے اور ہاتھ ہلا کر پروفیسر کو رخصت کرتی ہے تو پروفیسر کو اس کی قدر آتی ہے مگر اس وقت کچھ ہونہ سکتا تھا۔ ”لاہور میں اردو افسانے کی روایت“ کے مصنف ڈاکٹر طیب طاہر اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

اشفاق احمد افسانوں میں محبت کی مختلف صورتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اشفاق احمد کا افسانہ ایل ویرا بھی محبت کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس میں ایل ویرا ایک طوائف کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس افسانے کی فضا بھی رومانوی ہے۔^{۵۳}

اشفاق احمد نے طوائف کے جذبات کو ایل ویرا کے کردار کی صورت میں نہایت مہارت سے پیش کیا ہے۔ افسانہ نگار نے ایک عورت کے دل میں دھڑکتے ہوئے دل کو سامنے لایا ہے کہ محبت کی چنگاری اُن کے دل میں بھی پائی جاتی ہے۔ جو کہ کسی وقت بھی بھڑک کر آگ کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ وہ اگر معاشرے کا ناپسندیدہ کردار اور طبقہ ہیں تو دوسری طرف معاشرے کے افراد اور انسان ہی اس کے ذمہ دار بھی ہیں جن کی ہوس اور درندگی کی بھینٹ ان کو چڑھنے پہ مجبور کیا جاتا ہے۔ مگر معاشرے کے بظاہر عزت دار لوگ ان سے تعلق رکھنا دن کی روشنی میں پسند نہیں کرتے۔ یہی معاملہ ایل ویرا کے سلسلہ میں بھی درپیش تھا کہ پروفیسر اس سے جان چھڑانے کی تدبیر کیا کرتا۔ دوسری طرف اشفاق احمد نے انسانی کردار کے ایک اور پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ محبت کرنے والا ہمیشہ قربانی اور ایثار پہ آمادہ نظر آتا ہے تو کچھ ایسی ہی کیفیت ایل ویرا کی بھی تھی۔ اسے پتہ بھی تھا کہ پروفیسر نواب خاندان کی لڑکی ماریا میں دلچسپی لیتا ہے تو یہ اس معاملے میں بھی اس کی ہر ممکن مدد کرتی ہے۔ پروفیسر غیر مقامی ہونے کی بنا پر مقامی فرد کا محتاج تھا جو کہ اس کو زبان، معاشرت، رسم و رواج و دیگر معاملات میں اس کی مدد کر سکے۔ پروفیسر ایل ویرا کی محبت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کا جذباتی استحصال کرتا ہے۔ اس کی معاونت سے ہی وہ سینور نیاماریا سے عشق پروان چڑھاتا ہے۔ ایل ویرا تحائف کے سلسلہ میں پروفیسر کی معاونت کرتی۔ اس کا انداز کچھ یوں ہوتا۔

اپنی حیثیت سے بڑھ کر اگر کوئی تحفہ خریدتا تو ایل ویرا اس کا پارسل بناتی اور وہی اسے ڈاک خانے لے جا کر سپرد ڈاک بھی کرتی۔ ایل ویرا ہی سے میں نے ایک رومال پر چائے رنگی پتیوں کا پھول کڑھوا کر مارنیا کو دیا تھا کہ یہ ہمارے ملک کی صنعت کا ایک نادر نمونہ ہے۔^{۵۴}

ایل ویرا کا کردار ہمیشہ ہی سے بہت زیادہ معاون اور مثبت ہوتا۔ وہ کبھی بھی رکاوٹ نہ بنی۔ اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ پروفیسر کی خوشی میں خوش رہتی۔ حتیٰ کہ مارنیا کے لیے تحفے بھی نہ صرف پیک اور سپرد ڈاک کرتی بلکہ کچھ تو اپنے ہاتھوں سے تیار بھی کرتی۔ ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی بھی اپنی محبت میں شراکت کو برداشت کر سکے۔ خصوصاً عورتیں اس معاملے میں بہت حساس ہوتی ہیں لیکن یہاں ایل ویرا کی اعلیٰ ظرفی کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ کمال فیاضی کا مظاہرہ کرتی ہے اور جانتے ہوئے بھی پروفیسر کے معاشقے کو خراب نہیں کرتی بلکہ اس میں ہر طرح کا حصہ ڈالنے کو تیار نظر آتی ہے۔ ایل ویرا کا کردار بھی پرکشش، دلچسپ اور یادگار ہے جو قارئین کے ذہنوں پر اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ حالانکہ وہ جس گھٹن زدہ ماحول کی پیداوار تھی وہاں کے اصول اور ضابطے الگ ہوتے ہیں۔ وہاں کی دنیا کا ایک اپنا مزاج ہوتا ہے۔ دنیا کے توہین آمیز رویے کے رد عمل کے طور پر فطری طور پر ہی بد چلنی ان کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔ وہ ایسی ایسی حرکتوں کی مرتکب ہوتی ہیں جن سے معاشرے کے مہذب افراد کو گھن آتی ہے۔ وہ ایک خاص طبیعت اور فطرت کی حامل ہوتی ہیں۔ مگر ایل ویرا اس لحاظ سے الگ نوعیت کا کردار ہے جس کے دل میں محبت کا چراغ جل رہا ہے اور وہ خالص محبت کو ہر قیمت نبھائے جا رہی ہے۔ عموماً گھٹن زدہ ماحول کی پیداوار لڑکیوں کی جذباتی و نفسیاتی کیفیات کا اظہار کھلے بندوں نہیں کیا جاتا مگر ایل ویرا اس معاملے میں خاصی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے۔ اس کی محبت صرف جنسی تسکین یا مالی فوائد کے عوض نہیں بلکہ اعلیٰ ظرفی کے ساتھ ایثار و قربانی پر مشتمل ہے۔ اسی اعلیٰ پن کا مظاہرہ ایل ویرا آخری ملاقات میں کچھ اس طرح کرتی ہے۔

صبح اپنے گھر سے روانہ ہوتے وقت میں نے رسمی طور پر ایل ویرا کو گلے لگا لیا۔ اس نے دونوں بازو میری کمر میں حائل کر دیئے اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ مجھے خط لکھا کرو گی نا؟ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کی کمینیاں پکڑ کر بازو علیحدہ کیے اور سٹیشن پر آگیا۔ ٹکٹ لینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مڑے مڑے ہزار ہزار لیرے کے دونوٹ میری جیب میں پڑے تھے۔ مجھے ایل ویرا کی حماقت پر ہنسی آگئی۔^{۵۵}

ایل ویرا نے دو ہزار معاوضہ واپس کر دیا تھا جو اس نے پروفیسر سے پہلی ملاقات میں وصول کیا تھا۔ یہ اس کی اصول پسندی اور اعلیٰ روایات کی پاسداری کا ثبوت تھا کہ بلا خدمت حاصل کیا گیا معاوضہ ایک طوائف ہو کر بھی اس نے واپس کر دیا تھا۔ دوسرا وہ اس کو ساحل سمندر پہ الوداع کہنے آ جاتی ہے جبکہ پروفیسر نواب خاندان کا انتظار کرتا رہ جاتا ہے۔ اشفاق احمد

اس کردار کے ذریعے یہ مثبت پیغام دینا چاہتے ہیں کہ کسی انسان کا پیشہ یا سماجی کم تر رتبہ اس کے جذبات کے حقیر اور کم تر ہونے پہ دلالت نہیں کرتا بلکہ وہ بھی اصل اور خالص جذبات رکھتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ انسان کی عقل پہ ہوس اور مادیت پرستی کی پٹی بندھ جاتی ہے جس سے اس کو اصل اور خالص محبت کو پہچاننے میں نہ صرف دقت پیش آتی ہے بلکہ دکھائی ہی نہیں دیتی۔ حالانکہ ہم سونے چاندی اور مقام و مرتبے کے ڈھیر میں حقیقی محبت کو دفن کر دیتے ہیں مگر محبت مر نہیں سکتی، ختم نہیں ہو سکتی بلکہ اپنا آپ منوا کے رہتی ہے۔ یہی پیغام اشفاق احمد نے کامیابی سے ایل ویرا کے کردار کے ذریعے دیا ہے۔

د۔ اُجلے پھول کے ضمنی کردار

بے بے، قراۃ العین، امی جان (گڈریا)

"گڈریا" اشفاق احمد کے شہرہ آفاق افسانوں میں سے ایک ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک گڈریا ہے جسے لوگ داؤجی کا نام سے پکارتے ہیں۔ داؤجی مختصر سے خاندان کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ اس کی بیوی جسے سب بے بے کہتے ہیں، بیٹی قراۃ العین اور بیٹا امی چند شامل ہیں۔ گڈریا ایک شریف النفس آدمی ہے جسے گھریلو زندگی میں بھی عاجز اور مسکین شوہر کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ شادی سماج کا ایک اہم تقاضا ہے جس کے ذریعے ایک خاندان کی تشکیل ہوتی ہے اور مرد و عورت ہر دو افراد مل کر نسل نو کو معاشرتی و سماجی ذمہ داریوں کے لیے تیار کرتے ہیں۔ عورت اور مرد پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کو نبھانے اور ادا کرنے کی صلاحیت ہی اس کے کردار کا تعین کرتی ہے۔ نان و نفقہ و گھریلو اخراجات چونکہ مرد کے ذمہ ہوتے ہیں مگر داؤجی کی منشی گیری ختم ہو جانے پر اور منصفی میں عرضی نویسی کے کام میں مندا ہونے کی بنا پر وہ یہ سب کچھ بطریق احسن سرانجام دینے سے قاصر ہوتے ہیں۔ جبکہ بے بے کو کڑھائی سلائی و دیگر کاموں سے اتنی آمدن ہو جاتی ہے کہ وہ گھریلو اخراجات چلا سکے۔ ایک تو بے بے کی جہالت، دوسرا معاشی اجارہ داری اُسے داؤجی و دیگر سے بد تمیزی اور بد زبانی کی اجازت دے دیتی ہے۔ بے بے کا برا سلوک داؤجی کا پورے افسانے میں ایک کمزور پہلو ہے۔ وہ بے بے کی بد زبانی اور بد تمیزی پہ صبر کرتے ہیں۔ داؤجی کو گڑ کی چائے پینے کا شوق تھا مگر گھریلو حالات پہ بے بے کی اجارہ داری اور حساب کتاب اس عیاشی کی اجازت نہ دیتے تھے۔ داؤجی کبھی کبھار چھپ کر منصفی (کچہری) سے واپسی پہ چائے پیتے آتے۔ ایک دن بے بے گھر نہ تھی۔ گولو داؤجی کے لیے دودھ لے کر آیا تو انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا اور کہا کہ میں گڑ لے آتا ہوں اور چائے بناتے ہیں۔ قراۃ العین اور گولو کو پڑھائی پہ بٹھا کر داؤجی گڑ کی چائے بنانے لگے۔ بے بے خلاف توقع جلدی واپس آگئی۔ جب دیکھا کہ اس کی غیر موجودگی میں عیاشی ہو رہی ہے تو بے بے کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ داؤجی رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ داؤجی کو چو لہے کے پاس بیٹھا دیکھ کر بے بے نے کہا۔

بے بے نے ایک دوہتر داؤجی کی کمر میں مارا اور کہا۔ بڈھے بردھا تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر بہارو پھرے۔ تجھے بم سمیٹے، یہ تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھ کو کسی کا ڈرنہ رہا۔ تیرے بھانویں میں کل کی مرقی آج مروں۔ تیرا من راضی ہو۔ تیری آسیں پوری ہوں۔ کس مرنے جوگی نے جناور کس لیکھ کی ریکھانے میرے پلے باندھ دیا۔ تجھے موت نہیں آتی۔^{۵۱}

اشفاق احمد نے بے بے کا کردار ایک ایسی گھریلو عورت کے طور پر پیش کیا ہے جو فطرتاً جارجانہ مزاج کی مالک ہے۔ بے بے کو منفی سوچ اور منفی رویے کا علامتی پیکر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ نفسیاتی طور پر وہ بہرہ پن اور خود غرضی کا شکار ہے اور داؤجی کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی ہے۔ عموماً طنز آمیز لہجے میں بات کرتی ہے جبکہ داؤجی کو مثبت سوچ کا مالک بتایا گیا ہے۔ کردار کی خوبی یہ بھی ہے کہ زبان، الفاظ اور لب و لہجے کے برتاؤ میں خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بے بے کا لہجہ رونکھاپھیکا ہے جو اس کے جارجانہ مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ بے بے عدم توازن کا شکار ایک ایسی عورت ہے جو افسانے میں شروع سے لے کر آخر تک نفرت آمیز رویہ رکھنے کا جواز پیش کرتی ہے۔ بے بے کو یہ زعم تھا کہ وہ کماء عورت ہے۔ گھر کا خرچہ اب اس کے دم سے چل رہا ہے۔ داؤجی کا کام کاج ختم ہو چکا۔ صرف کتابیں پڑھنے سے پیٹ نہیں بھرا جا سکتا۔ اس لیے اس کے رویے کا تناؤ اور کھچاؤ پورے افسانے پر چھایا رہتا ہے۔ بیٹی کا نام قراۃ العین تھا جس کا معنی ان پڑھ بے بے کو نہیں پتا تھا۔ بے بے کو یہ نام پسند نہ تھا۔ بے بے خود سینے پر ونے اور سلائی کڑھائی کا کام کرتی تھیں اور یہ کام اپنی بیٹی قراۃ العین کو بھی سکھا رہی تھیں تو اس نام کی انوکھی منطق بے بے سامنے لے کر آتی۔ بے بے داؤجی کو کہتی۔

تو نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے سینے لکھوادے ہیں۔ منہ اچھانہ ہو تو شبد تو

اچھے نکالنے چاہئیں اور داؤجی ایک لمبی سانس لے کر کہتے "جاہل اس کا مطلب کیا جانیں" ^{۵۲}

داؤجی نے ایک بامعنی نام اپنی بیٹی کا رکھا ہوا تھا مگر بے بے کو اس میں بھی کچھ اچھانہ دکھائی دیتا تھا اور اسے برا بھلا کہتی رہتی۔ ہمارے معاشرے میں لڑکیاں اور بیٹیاں عام طور پر والدین کی خدمت گار ہوتی ہیں۔ والدین کی خواہشات کے سامنے اپنی تمام تر خواہشات کی قربانی دے دیتی ہیں۔ قراۃ العین کو بھی والدین کی خواہشات کا پاس ہے نیز اسے گھریلو حالات کا بھی احساس ہے جس بنا پر قراۃ العین ایثار و قربانی کا پیکر بنی نظر آتی ہے۔ وہ گھریلو حالات کو بہتر بنانے کے لیے ماں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیتی ہے تاکہ آمدن میں اضافہ ہو سکے اور گھریلو حالات بہتر ہو سکیں۔ یہ پس منظر میں رہنے کے باوجود نسوانی خصوصیات سے بھرپور کردار ہے۔ چونکہ داؤجی خود بھی علم دوست شخصیت تھے۔ درس و تدریس سے وابستہ تھے لہذا انھوں نے پوری کوشش کر کے اپنی بیٹی کو گھر پر تعلیم دی۔ مروجہ علوم فارسی، عربی وغیرہ سکھلائے نیز امور خانہ داری کی بھی تربیت دی تھی۔ مگر والدین کی خواہش اور حسرت پوری نہیں ہو سکتی چاہے وہ اولاد کے لیے کتنا کچھ ہی نہ کر

دیں۔ کچھ ایسا ہی حال داؤجی کا بھی ہے۔ بی بی کی جب بارات پہنچی تو باپ نے بیٹی کو رخصتی کے موقع پر آنسو بہاتے ہوئے معافی مانگی کہ میں تجھے پڑھا لکھانہ سکا۔ دونوں باپ بیٹی رونے لگتے ہیں۔ اس رقت آمیز منظر میں باراتیوں کی طرف سے سمدھی آگے بڑھ کر دلاسا دیتے ہیں۔

ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا منشی جی آپ فکر نہ کریں، بیٹی کو میں کریم پڑھا دوں گا۔ داؤجی پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔ کریم تو پڑھ چکی ہے۔ گلستان بوستان بھی ختم کرا چکا ہوں۔ لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی۔^{۵۸}

نامساعد حالات کے باوجود ذاتی لگن اور شوق کے بل بوتے پر داؤجی کا قراۃ العین کو فارسی ابتدائی کتب پڑھا دینا کچھ کم نہ تھا مگر پدرانہ شفقت آڑے آتی ہے اور زیادہ تعلیم نہ دلوا سکے پر ارمان اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ قراۃ العین کا کردار اسی بنا پر قاری کو متاثر کرتا ہے کہ وہ قدرے مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ عمومی طور پر معاشرے میں عورتوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کو کم تر مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ غریب اور پسے ہوئے طبقے میں لڑکیوں کی تربیت میں اس بات کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ مردوں سے خوفزدہ رہتی ہیں اور اپنا کم تر درجہ قبول کر لیتی ہیں لیکن قراۃ العین کو ایسی صورت حال سے دوچار نہیں ہونا پڑتا ہے۔ بلکہ پڑھے لکھے ماحول کی وجہ سے اچھا تاثر دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

”ت“ (گل ٹریا)

”گل ٹریا“ ایک کتے ٹی ٹی کی کہانی ہے جو دو بھائیوں نے شوق سے چچا سے منگوایا تھا مگر دوسرے دن ہی ان سے کھو جاتا ہے۔ چونکہ وہ ان سے مانوس نہیں ہوا تھا اور جب وہ زنجیر کھولتے ہیں تو کتا بھاگ جاتا ہے اور واپس نہیں آتا۔ ت نامی کردار ضمنی علامتی کردار ہے جو افسانے کے آخر میں سامنے آتی ہے مگر غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتی ہے کیونکہ قاری کو آخر میں پتہ چلتا ہے کہ سارا قصہ اس واقعے سے جڑا ہوا تھا جب ت کی رخصتی ہوتی ہے اور وہ چپ چاپ کسی اور کے ساتھ گاڑی میں روانہ ہو جاتی ہے حالانکہ بھیا کے ساتھ پیار و محبت کے تذکرے سے بھیا کی ڈائری کے صفحے کے صفحے بھرے ہوئے تھے۔ جس طرح کتا ڈھونڈنے میں دونوں بھائیوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسی طرح ان دونوں کی محبت بھی ناکام ہوئی تھی۔ اس افسانے میں محبت کی دو کہانیاں ہمیں دکھائی دیتی ہیں جس میں ایک انسان کی ایک انسان سے محبت ہے اور دوسری کہانی ایک انسان کی ایک جانور سے محبت۔ مگر دونوں کا نتیجہ ایک جیسا ہے کہ ناکامی دونوں کا مقدر ٹھہرتی ہے اور جدائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان دونوں کی محبت اس وقت سامنے آتی ہے جب بھیا کی ڈائری چھوٹے بھائی کے ہاتھ لگتی ہے۔ وہاں ہر دن کے واقعات، ملاقاتوں کے تذکرے اور دیگر واقعات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بھیا

بتاتے ہیں کہ میرے ہاتھ میں پہنے چھلے کو گھما رہی تھی تو میں نے کہا چونکہ عورتوں کو زیور عزیز ہوتا ہے اس لیے تم اس کو شوق سے گھما رہی ہو تو وہ برامان جاتی ہے اور کہتی ہے۔

تم سمجھتے ہو۔ میں ہر انگلی کے چھلے کو اسی طرح گھماؤں گی۔ کیونکہ میں عورت ہوں اور عورت کو زیور عزیز ہوتا ہے۔
میں نے ڈرتے ہوئے کہا "ہاں"۔ ت نے کہا۔ خیر ہم ایسے کنگال بھی نہیں۔ میں نے ایسے بہت سے چھلے دیکھے ہیں۔
لیکن انھیں اس طرح پھرانے کی تمنا کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔^{۵۹}

اس مکالمے کے ذریعے اشفاق احمد نے عورتوں کی نفسیات کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ زیور عورتوں کی مجبوری اور عزیز ترین شے ہوتی ہے۔ مگر یہاں "ت" "بھیا کی محبت میں اس سے بھی بڑھ کر دعویٰ کرتی ہے کہ اگر یہ گھانس پھونس بھی ہوتی لیکن تیرے ہاتھ میں ہونے کی بنا پر، تجھ سے نسبت ہونے کی بنا پر وہ بھی مجھے عزیز از جان ہوتا۔ دوسرا یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں کی محبت کس سطح کی تھی۔ "ت" کے اس جواب سے بھیا بھی اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگتے ہیں کہ ایک پیار بھرا ساتھی ان کو ملا ہے۔ جو دنیاوی معیار سے بالاتر اور مادیت پسندی سے آزاد ہے۔ اس کی نظر میں دھات اور گھاس کا بنا زیور صرف اور صرف اس وجہ سے برتر اور کم تر ہے کہ محبوب کے ہاتھ کا لمس ہی اس زیور کی قدر و قیمت کا تعین کرے گا۔ مگر پھر حالات بدل جاتے ہیں۔ اس لڑکی کی نسبت کہیں اور طے ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ کسی دنیاوی متاع اور جاہ و جلال کے لیے تھی یا گھریلو باؤدو دیگر مجبوریوں تھیں۔ اس کی رخصتی کا وقت آ جاتا ہے اور باراتی عورتوں کے جھرمٹ میں کھڑی ہے اور دلہن کی گاڑی میں بیٹھ جاتی ہے۔ یہ منظر کچھ یوں تھا۔

بروکیڈ کی اچکن والا پھولوں کی لڑیاں ایک طرف ہٹا کر دروازہ کھول رہا ہے اور گل ٹریا
بڑے حجاب اور بڑی لہک کے ساتھ اندر داخل ہو رہی ہے۔ اس نے سر جھکا کر کار میں ایسے

قدم رکھا جیسے وہ بھیا کو جانتی ہی نہیں۔^{۶۰}

اشفاق احمد نے عورت ذات کے رویے کو فطری انداز میں المیاتی احساس کے ساتھ پیش کیا ہے اور دلچسپ کہانی کے تانے بانے سے اس کی بھرپور وضاحت ہوتی ہے۔ کہانی کا اختتام جہاں المیہ، درد اور کرب کو ظاہر کر رہا ہے وہیں پر سماجی و گھریلو مجبوریوں پر طنز کے نشتر چلاتی نظر آتی ہے۔ انسانوں کی اصلیت اور تضادات سامنے آ جاتے ہیں۔ اس کردار کا مطالعہ ہمیں کئی تلخ حقیقتوں سے آشنا کرتا ہے۔ افسانے کا المیاتی اختتام اس کردار کا خاص تاثر قاری کے ذہن میں بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

میں۔ آلاچی (اجلے پھول)

"اجلے پھول" اشفاق احمد کا بہت مشہور افسانہ ہے۔ اسی افسانے کے نام پر دوسرے مجموعے کا نام "اجلے پھول" رکھا گیا۔ یہ کہانی انجم بھائی اور آپنی طلعت کی محبت کی کہانی ہے۔ اس میں راوی (میں) آپنی کی چھوٹی بہن ہے۔ جو واقعات کو بیان کرتی ہے اور واقعات ہم تک پہنچتے ہیں۔ اسے ہمدرد و غمگسار لڑکی کے روپ میں دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک سنجیدہ اور درد بھرا کردار تراشا گیا ہے جو کہ آپنی کی محبت میں ناکامی اور ادھورے پن کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے اور اُسے ڈھارس بندھاتی ہے۔ آپنی کی شادی کے ایک سال بعد جب وہ انجم بھائی کی قبر کے لیے پھول چننے جاتی ہے، انہی جملوں سے افسانے کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ یہ اپنے دکھ کا اظہار ان الفاظ سے کرتی ہے۔

یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ میں اکیلی پھول چننے آئی ہوں اور جب ٹوکری بھر کر اندر لوٹوں

گی تو اکیلے ہی بیٹھ کر انہیں گوندھوں گی۔^{۱۱}

ایک بہن کا دکھ بھر انداز اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی بڑی بہن کی کمی کو بُری طرح سے محسوس کر رہی ہے۔ اس سے پہلے یوں ہوتا تھا کہ دونوں بہنیں پھول چننے آتی تھیں۔ اشفاق احمد نے اس کردار کے ذریعے دو بہنوں کے درمیان محبت کو پاکیزہ اور بہترین روپ میں پیش کیا ہے۔ اشفاق احمد اپنے کرداروں کو متحرک اور عمل سے بھرپور دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اس لڑکی کا کردار بھی جاندار انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ راوی کو گھر میں چھوٹے اور لاڈلے ہونے کا بھرپور احساس ہے اور ساتھ ہی وقت گزرنے پر سمجھ بوجھ اور موقع شناسی کی صلاحیت بھی بہتر ہو جاتی ہے۔ عام گھریلو لڑکی کے روپ میں وہ اپنی بہن کے ساتھ کئی معاملات، کھیلوں اور رازوں میں شراکت دار رہی ہے۔ انجم بھائی اور آپنی کی محبت کا قصہ بھی اسی کی زبانی منظر عام پہ آتا ہے۔ انجم بھائی کی آمد کی خبر بھی اسی کے ذریعے افسانے میں پہنچتی ہے۔ اسی کی بدولت افسانے کا تاثر اور دلکشی قائم رہتی ہے۔ ایک دن کہ جب گھر میں آپنی اور انجم بھائی کے سوا کوئی نہ تھا تو اسے انجم بھائی کے کمرے میں جانا پڑا۔ قریب جاتے ہی اُسے کمرے سے آوازیں سنائی دیں۔ کمرے میں انجم بھائی اکیلے نہ تھے۔ کمرے کا منظر کچھ یوں تھا۔

میں نے پردے کے ساتھ لگ کر اندر جھانک کر دیکھا۔ انجم بھائی قالین پر بیٹھے سٹوے

سٹینڈرڈ سے تصویریں کاٹ کاٹ کر ایک بڑے رجسٹر پر چپکا رہے تھے۔ آپنی ان کے پیچھے

کھڑی تھیں اور بھائی کے کندھے کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے بار بار چھو کر کہہ رہی تھیں۔

بولتے کیوں نہیں، بولتے کیوں نہیں؟^{۱۲}

یہاں سے انجم بھائی اور آپنی کے درمیان تعلقات کا انکشاف راوی کے ذریعے ہوتا ہے جو کہانی کا مرکزی موضوع بھی ہے اور آگے چل کر کہانی کا اختتام کا باعث بنتا ہے۔ ان دونوں کے رومانوی تعلقات ایک راز ہی رہتے اگر راوی نے منکشف نہ کیا ہوتا۔ اس لحاظ سے یہ ایک اہم کردار ہے۔ آلا جی اس افسانے کا ایک اور ضمنی کردار ہیں جو کہ ان بچوں کی والدہ ہیں۔ سراپا ایثار و محبت کردار جس میں ممتا، محبت، اپنائیت غرض تمام جذبات ہمیں ملتے ہیں۔ زندگی کے تمام رنگوں سے بھرپور اور مزین جو ہمیشہ خوش و خرم رہتی ہے۔ شگفتہ دلی کا پیکر آلا جی کا تعارف کچھ یوں ہے۔

خالہ کے چھوٹے بچے چونکہ ہماری امی کو آلا جی کہتے تھے، اس لیے ہم انھیں آلا جی کہنے لگے تھے۔ ہم تو ہم امی کے سب بہن بھائی انہیں اسی نام سے پکارنے لگے اور امی کا نام خاندان بھر میں مشہور ہو گیا۔ آلہ جی اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں اور اپنے خاندان کی سب سے پہلی گریجویٹ خاتون۔^{۶۳}

یہ ایک اصلاحی کردار ہے جس کے نام سے ہی نرمی و لطافت جھلکتی ہے۔ کردار کے اندر جتنی بھی خوبیاں اور خصوصیات ہوتی ہیں ان کا لیل نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کردار میں اشفاق احمد نے جہاں خاندانوں کے درمیان محبت بھرے تعلقات کو ظاہر کیا ہے۔ وہیں لاڈ پیار سے بچوں کو دیئے ہوئے نام کو قبولیت بخشنے اور رواج دینے سے بہن بھائیوں کی سب سے چھوٹی بہن آلا جی کے لیے محبت بھی واضح ہوتی ہے۔ دوسری اہم بات کہ اشفاق احمد تعلیم نسواں کے علمبردار تھے۔ اس لیے ان کے کرداروں میں پڑھی لکھی خواتین نظر آتی ہیں۔ خاندان کی پہلی گریجویٹ خاتون کا حوالہ دینے سے وہ خواتین کے اندر تعلیم کی اہمیت واضح کرتے ہوئے ان میں تعلیم کے لیے لگن اور تڑپ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قیام پاکستان سے قبل کی بات ہے جب مردوں کی تعلیم بھی بہت مشکل تھی۔ مدارس اور مکتب تعداد میں بہت کم تھے۔ صرف عربی و فارسی کے ابتدائی قاعدے پڑھا دینا اور اسلامی عبادات و بنیادی عقائد سے آگاہی ہی کافی سمجھی جاتی تھی۔ صرف اعلیٰ گھرانوں میں پڑھائی لکھائی اور تعلیم جیسی آسائش کا تصور موجود تھا۔ اس دور میں جبکہ مردوں میں بھی شرح تعلیم مایوس کن حد تک کم تھی۔ ایک خاتون کو پڑھا لکھا اور گریجویٹ ظاہر کرنا اشفاق احمد کی نظر میں تعلیم نسواں کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ پڑھی لکھی خاتون ہونے کے ناطے وہ بچوں کی تربیت کے سلسلے میں بھی بہت محتاط تھیں۔ ایک شام جب بچے لڈو کھیلنے کے بعد رات کو چپکے سے لاما ماموں کے ساتھ فلم دیکھنے اور آئس کریم کھانے نکل گئے۔ گھر والے سارے لوگ سو رہے تھے۔ تو آلا جی نے ان الفاظ میں جوان اولاد کو تنبیہ کی۔

اگلی صبح آلا جی نے مجھے اور آپ کو بلا کر صرف اسی قدر کہا۔ تم مشرق کی بیٹیاں ہو، یورپ کی گلیمر گرلز نہیں ہو اور مشرقی بیٹیاں بڑوں سے پوچھے بنا کہیں نہیں جاتیں۔ پھر انھوں نے ہمیں اپنے ساتھ لپٹا لیا۔^{۶۴}

برصغیر کا معاشرہ اس وقت دھیرے دھیرے تبدیل ہو رہا تھا۔ معاشرتی تبدیلی کی وجہ سے لوگوں میں تفریح کے لیے نئے ذرائع اور طریقے متعارف ہو رہے تھے۔ گو کہ آلا جی شفیق والدہ اور مخلص تربیت کار تھیں مگر وہ جوان بیٹیوں کے اس طرح چوری چھپے سینما جا کے فلم دیکھنے اور دیگر سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں۔ مذہبی اور معاشرتی اقدار کی روشنی میں عورتوں کی نسوانیت، وقار اور تقدس کو کسی صورت پامال نہ ہونے دینا چاہتی تھیں۔ کیونکہ آلا جی بہتر جانتی تھیں کہ عزت اور تعظیم صرف اور صرف کردار بلکہ اعلیٰ کرداری اوصاف کی بدولت ملتی ہے۔ لہذا وہ اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں بہت زیادہ حساس تھیں۔ آلا جی کا کردار ایک بھرپور کردار ہے جو افسانے میں رنگ بھرنے اور اپنا خاص تاثر بنانے میں کامیاب رہتا ہے۔

امینہ (برکھا)

امینہ ثریا کی سہیلی کا نام ہے جو اس کی ہم جماعت بھی ہے اور اسی کے ساتھ دسویں جماعت کے امتحانات میں شریک ہوئی۔ امینہ، ثریا سے دوستی کا رشتہ نبھائے جا رہی ہے۔ وہ ثریا کی ہم راز بھی ہے اور اسے ثریا کی یک طرفہ اور خود ساختہ محبت کا علم بھی ہے۔ اصلاحی کردار امینہ کے اندر ایک درد مند دل موجود ہے جب وہ ثریا کو محبت میں گرفتار دیکھتی ہے تو اس اور غمزدہ ہو جاتی ہے کیونکہ ان دیکھے نقصانات کا تخمینہ اور اندازہ لگانے میں امینہ کو کچھ دیر نہیں لگتی۔ امینہ کو جب عشق و محبت کا پتہ چلتا ہے اور ثریا کی محبت کا درد اور چاہت کا احساس ہوتا ہے تو وہ تملنا اٹھتی ہے۔ امینہ اپنی عزیز سہیلی ثریا کی امیدوں، آرزوؤں اور امنگوں کو خاک ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی اس لیے وہ اس کو اپنی عمر کے سولہویں سال کے حساس ہونے کا بتاتی ہے کہ لڑکیوں کی عمر میں سولہواں سال عموماً ایسا برس ہوتا ہے جس میں لڑکیوں کے بھٹک جانے کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ امینہ کی انہی خصوصیات کی بنا پر ثریا کے گھر والے امینہ کو ایک سمجھدار اور شریف دوست سمجھتے تھے اور ثریا کو اجازت تھی کہ وہ اس کے گھر آ جا سکتی ہے۔

امینہ کا گھر اس کے یہاں سے پانچ سات میل دور تھا، اس پر بھی ثریا کو ہر روز اپنی سہیلی سے ملنے کی کھلی اجازت مل چکی تھی۔ یہ بات الگ تھی کہ وہ اپنی سستی کی بدولت امینہ سے ہفتہ میں ایک بار بھی نہ مل پاتی۔^{۶۵}

امینہ کے گھر جانے کی ثریا کو اجازت مل چکی تھی۔ اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ امینہ کی شرافت اور کردار کی بلندی و سمجھداری کی بدولت ہی اس کے گھر والوں نے اس سے ملنے ملانے کی اجازت اور تعلقات رکھنے کی اجازت دی۔ امینہ کا کردار اس طرح تراشا گیا ہے کہ مختصر وقت کے لیے ظاہر ہونے کے باوجود وہ اپنا ایک مضبوط اور گہرا تاثر بنانے میں کامیاب رہتی ہے۔ اشفاق احمد نے اسے ایک سہیلی کی حیثیت سے سامنے لایا ہے اور عموماً ہمارے معاشرے میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوستوں اور تعلق داروں کی نصیحتوں کو جلدی قبول کر لیتا ہے اور مان لیتا ہے۔ جبکہ والدین، اساتذہ وغیرہ کے سمجھانے کا اثر اتنا زیادہ نہیں ہوتا جتنا ایک دوست کے سمجھانے سے ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان دوستوں کو کھونا نہیں چاہتا ہوتا ہے۔ دوست اس کے ہم راز ہوتے ہیں اور ذہنی سطح و مزاج کی ہم آہنگی کی بنا پر ایک دوسرے کی نصیحت کا اثر جلدی ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے مسائل کو عقلی اور عملی طور پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس سے انھیں سدھرنے اور آگے بڑھنے کا موقع اور جذبہ ملتا ہے۔ جس طرح اس افسانے میں امینہ ثریا کو احساس دلاتی ہے۔

یہ میٹھا برس بڑا خطرناک ہوتا ہے گویاں۔ امینہ نے بڑی بوڑھیوں کا سانداز اختیار کر کے کہا۔
ایک تیری سانولی سلونی کشش، دوسرے اس سفید چوہے کی بے نیازیوں کے پھندے، دونوں
ایسی پھٹکی میں پھنسو گے کہ مجھ ایسی سہیلیاں بارہ بارہ برس شکل دیکھنے کو ترس جائیں گی۔^{۲۱}

امینہ کی نصیحت کا اثر ثریا پر ہو جاتا ہے۔ وہ امینہ کے سامنے پوری طرح بے بس اور لاچار ہے۔ جس طرح امینہ نے لفظوں کا سہارا لے کر ثریا کی عزت نفس اور غیرت و حمیت کو جگایا تھا کہ ایک لڑکی کے پاس لے دے کے ایک ہی قیمتی اور انمول چیز بچتی ہے جو کہ عزت و ناموس ہے تو ثریا ان باتوں کو دل میں جگہ دیتی ہے۔ ثریا کے اندر رانا کی چنگاری کو امینہ نے بھڑکا دیا تھا جس نے ثریا کے ان دیکھی اور نامعلوم راہوں پر بڑھتے قدموں کو روک دیا۔ ثریا کی ذات میں یہ تبدیلی اور انقلاب اُس کی عزیز از جان سہیلی امینہ کی بدولت آئی تھی جسے وہ کسی قیمت کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اشفاق احمد امینہ کے کردار کے ذریعے سبق دینا چاہتے ہیں کہ عموماً اُس عمر میں لڑکیاں کچھ ایسے جذباتی فیصلے کر لیتی ہیں کہ ان کا خمیازہ والدین، رشتے داروں اور سہیلیوں سے جدائی کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ حالات و زندگی کو معمول تک لاتے لاتے وقت بہت تیزی سے گزر جاتا ہے اور ندامت و پچھتاوے زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ امینہ کو ایک ایسی سمجھدار سہیلی کے روپ میں دکھایا گیا ہے جو ثریا کو تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ عورت ذات میں پاکیزگی کی قائل ہے کیونکہ اس ہی کی بدولت معاشرہ ہر طرح کی برائیوں سے پاک اور صاف و شفاف رہے گا۔ الغرض امینہ کا کردار ضمنی کردار ہونے کے باوجود ایک بھرپور کردار ہے۔

ریسمارینا مارنیا (ایل ویرا)

"ایل ویرا" شعبہ اردو کے پروفیسر کے اٹلی قیام کی کہانی ہے جب وہ روم یونیورسٹی میں تعینات تھا۔ یونیورسٹی کی سالانہ تقریب میں ریکٹر نے اس کی ملاقات ستاتالی کے نواب خاندان سے کرائی۔ وہ مشرقی ممالک اور علوم کے بارے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ نواب صاحب، ان کی بیگم اور ان کی تین صاحبزادیاں موجود تھیں۔ انھوں نے اسے مزید معلومات اور رابطے کے لیے محل تشریف لانے کو کہا۔ یہ ان کی بیٹی ریسمارینا مارنیا میں دلچسپی لینے لگا۔ ریسمارینا مارنیا بھی اسے محل پہ بلانے لگی۔ ان کی ملاقاتیں محبت میں تبدیل ہو گئیں۔ تحائف کا تبادلہ ہونے لگا کہ پروفیسر کا اٹلی میں کٹریکٹ (معاندہ ملازمت) پورا ہونے کی بنا پر وطن واپسی کا پروگرام بنا۔ نواب خاندان نے کہا کہ ہم الوداع کہنے ریلوے اسٹیشن نہیں آئیں گے کیونکہ عوام کا رش ہوتا ہے اور ہماری شان کے خلاف ہے لہذا ہم بندرگاہ پہ الوداع کرنے آئیں گے۔ پروفیسر جہاز کے عرشے پر انتظار کرتا رہا مگر ریسمارینا مارنیا نہ آ سکی اور پروفیسر کو رخصت کرنے ایل ویرا پہنچ گئی جسے پروفیسر نے منع کر رکھا تھا کہ تم نہ آنا کیونکہ نواب خاندان نے آنا ہو گا اور وہ لوگ عوام کا رش پسند نہیں کرتے۔ ریسمارینا مارنیا پروفیسر سے مشرقی ممالک، معاشرت، رسم و رواج، زبان، طرز رہن سہن کے علاوہ ادب پر بھی بحث کرتی تھی۔ پروفیسر اس کو متاثر کرنے کے لیے خود کو پاکستانی نواب ظاہر کرتا تھا۔ اپنی خاندانی عظمت اور شان و شوکت کے قصے بڑھا چڑھا کر بیان کیا کرتا تھا۔ جس سے ریسمارینا مارنیا اس سے بہت متاثر ہونے لگی۔ ایک دفعہ پروفیسر نے جو تحفہ دیا اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

میں نے پرانی اشیاء فروخت کرنے والے سے تانبہ کی کئی صد سالہ ایک چھوٹی سی ڈبیا خریدی تھی اور اسے مارنیا

کی خدمت میں یہ کہہ کر گزارا تھا کہ مونہو داڑو کی کھدائی سے نکلی تھی اور ہمارے خاندان میں اس وقت سے

چلی آرہی تھی جب میرے اب وجد سندھ کے حاکم تھے۔^{۶۷}

پروفیسر مارنیا کے خاندانی رعب داب میں آیا ہوا تھا جبکہ مارنیا کو غیر ملکی شخص سے علمی و ادبی گفتگو کے مواقع میسر تھے۔ دونوں اس قربت اور ذہنی ہم آہنگی کو محبت سمجھنے لگے تھے حالانکہ ملک، مذہب اور نسل کا بڑا فرق موجود تھا۔ مارنیا کا کردار اشفاق احمد نے خاندانی نواب اور طبقہ اشرافیہ کی حقیقت کو سامنے لانے کے لیے تراشا ہے تاکہ ان لوگوں کی محبت، جذبات کے معیار کو سامنے لایا جاسکے۔ یہ کردار اپنے طبقے کی اچھی طرح نمائندگی کرتا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی، ذاتی سوچ اور رکھ رکھاؤ کے انداز کو واضح کیا ہے۔ وہ اپنے مضبوط احساسات کی بدولت پروقار لڑکی کے روپ میں نظر آتی ہے۔ کہیں بھی اس معیار سے نیچے نہیں آتی کہ ان کے خاندانی وقار اور جاہ و جلال پہ حرف آجائے۔ ایک ایسا کردار جسے مغلوب نہیں کیا جاسکتا اور کسی کی محبت میں اس حد تک آگے نہیں بڑھ جاتی کہ سستے اور چھپورے اقدامات پہ مجبور ہو سکے۔ مارنیا کے کردار کو اشفاق احمد نے محض سماجی ناہمواری اور عدم مساوات کے نمائندہ کے طور پر ہی متعارف نہیں کرایا بلکہ ایک

پرو قار شخصیت کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔ پروفیسر سے علمی وادبی گفتگو اُسے ذہنی آسودگی فراہم کرتی ہے اور یہ بات ریسٹارینا مارینا کے کردار کی ذہنی سطح اور رجحانات کو سامنے لے کر آتی ہے۔ مارینا کو پروفیسر سے محبت تھی اور اس کا اظہار وہ کئی دفعہ کر چکی تھی مگر خاندانی وقار اور اقدار کو داؤ پہ نہیں لگانا چاہتی تھی۔ اس لیے جب پروفیسر کا معاملہ ختم ہوا اور واپسی کا دن آپہنچا تو انھوں نے عام جگہ پہ رخصت کرنے کی بجائے اپنے لیے خاص جگہ بندر گاہ کا انتخاب کیا۔ انھیں اس موقع پر بھی اپنی خاندانی عظمت اور وقار کا احساس کچھ اس طرح تھا۔

نواب صاحب نے تو کہا تھا کہ روما کے سٹیشن پر ہی الوداع کہہ دیا جائے مگر نواب بیگم نہ مانیں کہ روما کے سٹیشن پر پروفیسر کے دوست، یونیورسٹی کے چیر اسی، دفتری اور محلہ کے لوگ وغیرہ الوداع کہنے آئیں گے اور وہاں ایسی بے ہنگم بھیڑ میں ہم شرفاء کا جانا ٹھیک نہیں۔^{۱۸}

پروفیسر نے ان کی وجہ سے ایل ویرانامی طوائف کو آنے سے منع کر دیا تھا کہ تم بندر گاہ اور ساحل تک نہ آنا کیونکہ وہاں پر نواب خاندان اور ریسٹارینا مارینا نے آنا ہو گا تو ان کو کہیں ناگوار نہ گذرے۔ ان تمام تر اقدامات کے باوجود نواب خاندان ساحل تک نہ آیا اور الوداع کہنے کے لیے ایل ویرا بلا اجازت خفیہ طور پر آ پہنچی تھی۔ تمام پردیسوں اور مسافروں کو دوست، رشتہ دار اور احباب رخصت کر رہے تھے اور پروفیسر آخری دم تک حالت انتظار میں پریشانی کے عالم میں رہا۔ یہاں ریسٹارینا مارینا کی شخصیت کا کمزور پہلو سامنے آتا ہے کہ وہ طے ہو جانے کے باوجود رخصت کرنے اور الوداع کہنے نہ پہنچ سکی۔ اس طرح یہ کمزور پہلو قارئین کے ذہنوں میں کچھ اچھا تاثر نہیں بننے دیتا ہے اور ایل ویرا کی آمد سے اس کے کردار کو بلندی نصیب ہو جاتی ہے کہ ایک طوائف اور جسم فروش ہونے کے باوجود اپنی محبت کو ثابت کر دیتی ہے جبکہ ریسٹارینا مارینا ایسا کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

اشفاق احمد بیسویں صدی کے ایسے ادیب تھے جو مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ جدید مغربی علوم پہ بھی دسترس رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں گہری بصیرت، فنی پختگی، رنگارنگی اور جدت نظر آتی ہے۔ یہی گہرا رنگ ان کے افسانوں کے نسوانی کرداروں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ خواتین کی تعداد آبادی کے لحاظ سے نصف بنتی ہے مگر خاندان اور معاشرے میں عورت کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا رہا ہے لیکن اشفاق احمد کے ہاں اس طرح کا تصور ناپید ہے۔ انھوں نے ہر طبقے اور عمر کی عورتوں کو کردار کے طور پہ پیش کیا ہے اور ان کی سوچ، مسائل، مجبوریوں اور مقام کو قارئین کے سامنے لائے ہیں۔ اشفاق احمد نے عورت کے مشرقی روپ کو بھی پیش کیا ہے اور مغربی عورتوں کو بھی پیش کیا ہے۔ جہاں مسلمان عورتیں ان کے افسانوں کا حصہ بنی ہیں وہیں پرہندو، عیسائی اور دیگر غیر مذہب عورتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے بوڑھی عورت، کالج کی لڑکی، یونیورسٹی کی طالبہ، عام گھریلو عورت، نوکری پیشہ خاتون، ریٹائر

خاتون، طوائف، بہن، بیٹی اور ماں الغرض ہر روپ میں عورت کے کردار کو جگہ دی ہے۔ انھوں نے کرداروں کے انداز گفتگو، لب و لہجہ اور مکالموں پہ خاصی توجہ دی ہے اور ہر طبقہ اور عمر کی خاتون کے لیے اُسی طرح کے الفاظ کا چناؤ کیا ہے تاکہ حقیقت کا رنگ بھرا جاسکے۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں ہر سطح کی عورت پائی جاتی ہے اور انھوں نے نسوانی کرداروں کو سماجی رتبے، معاشی حیثیت، تعلیمی قابلیت، مقام و مرتبے کے لحاظ سے فطری انداز میں پیش کیا ہے۔

افسانہ "توبہ" کی لیکھا ایک نو عمر لڑکی ہے جس سے اعجاز کو پیار ہو جاتا ہے۔ یہاں اشفاق احمد محبت کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ اور لیکھا کے کردار کے ذریعے پیار کے ہتھیار کو آزماتے ہیں۔ وہی اعجاز جو گھر والوں کی ہر شرط، انعام، دھمکی، لالچ پہ بھی سگریٹ پینا نہیں چھوڑتا۔ وہی اعجاز لیکھا کی محبت کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور سگریٹ نوشی سے توبہ کر لیتا ہے۔ لیکھا کا کردار مثبت تبدیلی لانے کا باعث بنتا ہے۔ افسانہ "فہیم" میں نانی اماں کا کردار مرکزی ہے۔ وہ اپنے نواسے نواسیوں کو رات سلاتے وقت کہانی سنار ہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی گزری کہانی ننھے بچوں کو سنار ہی ہوتی ہیں۔ کہانی سنانے کا مقصد جہاں گزرے واقعات سے آگاہی تھا وہیں مشرقی اقدار اور مذہبی معلومات بھی نئی نسل کو منتقل کرنا بھی اہم مقصد تھا۔ نانی اماں باتوں باتوں میں قصے کہانی کی شکل میں خاندانی واقعات بچوں کو سناتی ہیں اور تربیتی پہلو سے ضروری امور سے بچوں کو روشناس کرواتی ہیں۔ افسانہ "تلاش" اور "گل ٹریا" میں کہانی دو بچوں کے پالتو کتوں جیکی اور ٹی ٹی کے گرد گھومتی ہے۔ یہاں بھی نسوانی کردار مختصر اظہار ہوتے ہیں۔ مگر جاندار صورت میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ "تلاش" میں ننھے احسان کے کتے جیکی کی کئی مواقع پہ امی جان تعریف کرتی ہیں اور جب جیکی کھو جاتا ہے تو ان سے ننھے احسان کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی ہے اور وہ مامتا کے جذبے سے مجبور ہو کے اس کے جیکی کے لیے قریبی مزار پیر بخاری پہ چلی جاتی ہیں اور منت مانتی ہیں تاکہ احسان کا جیکی مل جائے اور اس کی پریشانی کم ہو سکے۔ یہاں والدہ کا کردار بہت احسن انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ والدین خصوصاً والدہ سے اولاد کی پریشانی نہیں دیکھی جاسکتی۔

یہی سب کچھ ہمیں افسانہ "امی" میں نظر آتا ہے۔ اشفاق احمد نے امی کا کردار ماں کی محبت کو ظاہر کرنے کے لیے تراشا ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا کی محبت کا زمینی روپ ماں کی محبت ہے اور یہ سب ہمیں افسانہ امی میں دکھائی دیتا ہے۔ امی اپنے بیٹے گلریز کے دوست مسعود کو شفقت سے نوازتی ہیں بلکہ جب گلریز تعلیم کے لیے بیرون ملک چلا جاتا ہے تو یہ گھر میں اُس کا کمرہ تک مسعود کو دے دیتی ہیں۔ مسعود گھر سے نکالا ہوا اور بگڑا ہوا بچہ تھا۔ چوری اور جوئے کی لت میں مبتلا تھا۔ گھر میں بھی چوری چکاری کر لیتا تھا مگر امی نے ہمیشہ نظر انداز ہی کیا کہ مسعود ایسا نہیں کر سکتا۔ یہاں اشفاق احمد ماں کی ہی خوبی یا کمزوری سامنے لانا چاہتے ہیں کہ وہ کبھی بھی اپنی اولاد کو غلط سمجھتی ہے۔ افسانہ "سنگ دل" کی پٹی اور افسانہ "بابا" کی ایلن محبت کرنے والے نسوانی کردار ہیں۔ اشفاق احمد کے کردار مذہبی، لسانی، یا جغرافیائی تعصب کا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں

بلکہ اشفاق احمد مذہبی رواداری اور ہم آہنگی کے علمبردار کے طور پہ اپنے کرداروں کو پیش کرتے ہیں۔ یہ دونوں نسوانی کردار سراپا محبت و ایثار ہیں اور اپنی محبت کی قربانی دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بلا تفریق مذہب، رنگ، نسل، قوم کے صرف محبت کے وسیع تر مفہوم کو بیان کرتے ہیں۔ اشفاق احمد کے ہاں محبت ایک خاص اور وسیع تر مفہوم میں پائی جاتی ہے۔ اشفاق احمد محبت میں ایثار و قربانی کو لازمی خیال تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں محبت کسی کو پالنے کا نام نہیں بلکہ محبوب کی خوشی اور رضا کو پالنے کی سعی اور کوشش کا نام ہے۔ افسانہ "سنگ دل" کی پچی ایک ایسا ہی نسوانی کردار ہے جو کہ محبت کے لیے قربانی اور ایثار کے پیکر طور پہ متعارف کرایا گیا ہے۔ پچی کا کردار حیران اور متاثر کرنے والی نوجوان عورت کا ہے۔ یہ افسانہ تقسیم بر صغیر کے بعد مغوی عورتوں کی بازیافت کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ پچی، نوجوان آفیسر، جو کہ ہندوستان میں مسلمان عورتوں کی تلاش کے لیے تعینات ہوا تھا، کے عشق میں مبتلا تھی۔ مگر اس نے اپنی محبت قربان کر دی اور سجن سنگھ نامی ظالم انسان کے چنگل میں پھنسی حسنا نامی مسلمان لڑکی کو پاکستان روانہ کر دیا۔ وہ تعصب سے آزاد ایک مسلمان لڑکی کے لیے فکر مند دکھائی دیتی ہے۔ اس کے اندر ایک احساس کرنے والا دل موجود ہے۔ وہ نوجوان آفیسر کو سنگ دل قرار دیتی ہے جب وہ حسنا کے والد کی پاکستان سے آئی ہوئی چٹھی پر بغیر پڑھے لکھ دیتا ہے کہ تلاش کے باوجود یہ لڑکی نہیں مل سکی۔ پچی کے کردار میں محبت، انسانیت اور رحم دلی کو نئے روپ اور مفہوم میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح بیٹرس نامی نرس بھی قربانی و ایثار کی عمدہ مثال ہے۔ وہ ٹی بی کی وارڈ میں تمام مریضوں کے ساتھ بالعموم اور شقونامی مریض کے ساتھ بالخصوص محبت کا رویہ اپناتی ہے۔ وہ تمام مریضوں کو مثبت طرز زندگی اور انداز فکر اپنانے کی تلقین کرتی رہتی ہے اور ان کو زندگی سے مایوس نہیں ہونے دیتی وہ شقونامی مریض کے لیے خود اپنا خون دینا شروع کر دیتی ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر، طبی عملہ، لواحقین اور دیگر مریض اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے ہوتے ہیں مگر وہ اس کی دلجوئی کے لیے اس کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گزرتی ہے تاکہ اسے حوصلہ ملے اور زندگی کے بقیہ ایام اور اوقات بہترین انداز میں گزار سکے۔ مریضوں سے ہمدردی، والہانہ لگاؤ اور پُر خلوص کوشش اس کردار کو قارئین کی نظر میں اہم مقام دلانے کا باعث ہے۔

افسانہ "ستکہ"، افسانہ "ایل ویرا" اور افسانہ "بندرا بن کی کُنچ گلی میں" نسوانی کرداروں کے ذریعے اشفاق احمد نے طبقاتی تفریق اور مادیت پرستی کو اجاگر کیا ہے۔ "ستکہ" میں مرکزی کردار عطیہ بانو پیرزادی، "بندرا بن کی کُنچ گلی میں" کلثوم اور "ایل ویرا" کی ریسمناسینورینا مارینا کا تعلق معاشرے کے بالادست طبقات سے ہے۔ یہ لوگ اپنی منطق اور مجبوری کے تحت محبت جیسے جذبے کو ایک خاص مفہوم سے پہچانتے ہیں۔ ان لوگوں کے ہاں مادیت پرستی کا عنصر زیادہ توانا صورت میں پایا جاتا ہے جس کی بنا پر محبت اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ ساری سوچ اشفاق احمد ان نسوانی کرداروں کے ذریعے سامنے لاتے ہیں۔

"اُجلے پھول"، "شب خون" اور "توتا کہانی" میں نسوانی کردار عشقیہ روپ میں سامنے آتے ہیں۔ "توتا کہانی" کی نجستہ، "شب خون" کی نرس بیٹرس اور "اُجلے پھول" کی آپنی طلعت عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان افسانوں میں اشفاق احمد کا موضوع محبت ہے۔ "شب خون" کی نرس بیٹرس ٹی بی کے مریض شفق کو دل و جان سے چاہتی ہے اور بستر مرگ پہ پڑے، زندگی کے دن پورے کرتے مریض کو اپنا خون تک دینا شروع کر دیتی ہے تاکہ اس کی جان بچ جائے۔ "اُجلے پھول" کی آپنی، انجم کی وفات کے بعد سسرال سے جب بھی آبائی گاؤں اور میکے آتی تو اُجلے پھول قبر پہ ڈالنے ضرور جاتی ہے۔ کرداروں کا جائزہ لینے سے واضح ہوتا ہے کہ اشفاق احمد کے نسوانی کردار عام انسانوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اگر کرداروں میں انسانیت، اخلاقی اقدار، سماجی روایات اور مثبت انداز فکر پایا جائے تو ایسے کردار قاری کو بھی تحریک دینے کا باعث بنتے ہیں۔ اشفاق احمد کے نسوانی کردار زندگی کے انہی اہم پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ کردار عقل و دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاشرے میں مثبت اور اصلاحی پہلو سے کوششیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ الغرض ان میں کہیں بھی مصنوعی پن اور بناوٹ نظر نہیں آتی ہے۔ اور یہی اشفاق احمد کا کمال ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۱۰
- ۲۔ ایضاً، ص ۱۵
- ۳۔ ایضاً، ص ۱۸
- ۴۔ ایضاً، ص ۲۲
- ۵۔ ایضاً، ص ۲۹
- ۶۔ ایضاً، ص ۳۳
- ۷۔ ایضاً، ص ۳۴
- ۸۔ منیر الدین احمد، اشفاق احمد اردو افسانے کا سامری مشمولہ راوی اشفاق نمبر جی سی یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۵ء ص ۱۹۳
- ۹۔ اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۵۵
- ۱۰۔ ایضاً، ص ۵۶
- ۱۱۔ ایضاً، ص ۵۷
- ۱۲۔ ایضاً، ص ۶۱
- ۱۳۔ ایضاً، ص ۶۲
- ۱۴۔ ایضاً، ص ۷۷
- ۱۵۔ ایضاً، ص ۸۵
- ۱۶۔ ایضاً، ص ۸۸
- ۱۷۔ ایضاً، ص ۹۳
- ۱۸۔ ایضاً، ص ۹۶
- ۱۹۔ ایضاً، ص ۹۹
- ۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰۴
- ۲۱۔ ایضاً، ص ۱۰۵
- ۲۲۔ ایضاً، ص ۱۲۲
- ۲۳۔ ایضاً، ص ۱۲۸

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۲۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۲۸۔ ڈاکٹر سبینہ اولیس اعوان، افسانہ شناسی مثال پبلشرز رجم سینٹر پریس مارکیٹ، امین پور بازار فیصل آباد ۲۰۱۵ء ص ۴۳

۲۹۔ اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۱۸۲

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۳۱۔ ایضاً، ص ۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۷

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۰

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۳

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۵

۳۶۔ ایضاً، ص ۳۵

۳۷۔ ایضاً، ص ۴۰

۳۸۔ ایضاً، ص ۴۲

۳۹۔ ایضاً، ص ۴۴

۴۰۔ ایضاً، ص ۷۸

۴۱۔ ایضاً، ص ۸۶

۴۲۔ ایضاً، ص ۸۹

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۴۷۔ اشفاق احمد، اجلے پھول، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۶۹

- ۴۸۔ ایضاً، ص ۷۰
- ۴۹۔ ایضاً، ص ۱۱۰
- ۵۰۔ ایضاً، ص ۱۲۳
- ۵۱۔ ایضاً، ص ۱۲۸
- ۵۲۔ ایضاً، ص ۱۳۳
- ۵۳۔ ڈاکٹر طیب طاہر، لاہور میں اردو افسانے کی روایت، مثال پبلشرز فیصل آباد ۲۰۱۵ء، ص ۲۴۸
- ۵۴۔ اشفاق احمد، اجلے پھول، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۵
- ۵۵۔ ایضاً، ص ۱۵۹
- ۵۶۔ ایضاً، ص ۲۵
- ۵۷۔ ایضاً، ص ۱۵
- ۵۸۔ ایضاً، ص ۳۱
- ۵۹۔ ایضاً، ص ۶۰
- ۶۰۔ ایضاً، ص ۶۰
- ۶۱۔ ایضاً، ص ۱۰۸
- ۶۲۔ ایضاً، ص ۱۱۷
- ۶۳۔ ایضاً، ص ۱۱۰
- ۶۴۔ ایضاً، ص ۱۱۵
- ۶۵۔ ایضاً، ص ۱۲۸
- ۶۶۔ ایضاً، ص ۱۲۹
- ۶۷۔ ایضاً، ص ۱۵۵
- ۶۸۔ ایضاً، ص ۱۵۹

باب چہارم

اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں کے امتیازات

الف۔ عشقیہ اور رومانی کردار

اشفاق احمد منفرد اسلوب کے حامل افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں محبت وسیع تر معنی اور مفہوم میں سانس لیتی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے زندگی کی حقیقتوں کا مشاہدہ ایک خاص زاویہ نگاہ سے کیا ہے۔ انسانوں سے بڑھ کر انسانیت سے محبت کا درس ہمیں ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات، دھرتی، زبان، ثقافت، مذہب اور فطرت سے لگاؤ ان کی تحریروں سے واضح جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بھی اگر موضوع بنایا گیا ہے تو نرم الفاظ سے لطیف انداز میں تلخ پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے کہ قارئین کو تلخ پہلوؤں کی بجائے زندگی سے محبت کی ترغیب ملتی ہے۔ اشفاق احمد زندگی کے حسین رویوں کے حامل افسانہ نگار ہیں۔ سحر انگیز اندازِ بیاں اور ماضی پسندی کی بدولت رومانی مزاج ان کے ہاں کثرت سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ انسانوں سے ہمدردی اور انسان دوستی کا مضبوط تصور اشفاق احمد کے ہاں پایا جاتا ہے۔ زندگی کے مسائل کو جہاں انھوں نے موضوع بنایا ہے وہیں اس کا حل محبت کے وسیع تر مفہوم میں تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کمزور، بے بس، لاچار اور پسے ہوئے طبقے، انسانوں اور مخلوق کو اپنے کرداروں کی صورت میں پیش کر کے وہ محبت، ہمدردی، رحم اور انسانیت کی بات کرتے ہیں۔ اشفاق احمد کے افسانے ان کے دور اور عہد کی کہانیاں ہیں جن میں درد، کرب اور محبت کا جذبہ سماجی اکائیوں، گھرانوں، انسانی رشتوں میں ابھرتا ہوا محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اشفاق احمد کے ہاں محبت کا تصور ایک پاکیزہ تر جذبے کی صورت میں ملتا ہے۔ وہ محبت کے داعی اور پیامبر کے طور پر افسانوں میں کرداروں کو پیش کرتے ہیں۔ محبت جیسے مضبوط اور توانا جذبے کو وہ فرد کی انفرادی اور اجتماعی نشوونما کے لیے فروغ دینے میں کوشاں رہے ہیں۔ محبت اور عشق کے مثبت پہلو کا فروغ ان کا بنیادی مقصد رہا ہے۔ وہ انسانوں کے مصائب، مسائل اور پریشانیوں کا حل محبت اور احساس محبت بتاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ان کا انداز کسی واعظ، مبلغ یا مصلح کا سا نہیں ہوتا بلکہ انسانی زندگی سے دوستی کا رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔ ان میں پائی جانے والی خرابیوں، کوتاہیوں اور خامیوں کو سامنے لاتے ہیں اور دوستانہ طرز اختیار کرتے ہوئے ان کے خاتمے کا طریقہ اس طرح بتاتے ہیں کہ قارئین خود بخود برائی سے نفرت اور نیکی سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔ آسانیاں فراہم کرنا، آسانیاں بانٹنا ان کا عمومی مقصد رہا ہے۔ اپنے لوگوں سے محبت، ان کی اصلاح اور بھلائی ہی ان کا بڑا مقصد رہا ہے۔ وہ محبت کی روایات کو اگلی نسلوں تک ورثے کی صورت میں منتقل کرنا چاہتے ہیں اور ایک ایسی مثالی معاشرے کے قیام کی بات کرتے ہیں جہاں محبت جیسا آفاقی اور عالمگیر جذبہ بڑھے

، فروغ پائے اور اس کے حقیقی ثمرات انسانی معاشرے تک پہنچ سکے۔ ان کی تحریروں میں اللہ سے محبت اور اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق سے محبت بھی واضح جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ محبت کے آفاقی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کو ایک ظاہری جذبہ کی بجائے انسان کے اندر اور باطن میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں تاکہ انسانی کردار اور اوصاف میں یہ دکھائی دینے لگے۔ انسان کو اپنی ذات کی پہچان حقیقت میں خالق سے محبت اور پہچان کی علامت ہے۔ اس لیے وہ معاشرے میں محبت کے حقیقی جذبے کے علمبردار ادیب کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ اشفاق احمد کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے کرداروں میں عشقیہ عناصر مختلف روپ میں ملتے ہیں۔ ان کے پہلے افسانے "توبہ" کا موضوع محبت اور مقصد اصلاحی ہے۔ اصلاحی پہلو سے محبت کی طاقت اور قوت کو سامنے لاتے ہیں۔ ان کے اس افسانے کے کردار اعجاز اور لیکھار رومانوی کردار ہیں۔ اسی طرح ان کے پہلے افسانوی مجموعے میں "رات بیت رہی ہے"، "ملاش"، "سنگ دل"، "شب خون"، "توتا کہانی"، "بندر ابن کی کُنج گلی میں"، "بابا" اور "امی" میں عشق و محبت اور پیار کے جذبات کو مختلف بہروپ اور پہلوؤں سے قارئین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا افسانوی مجموعہ "اُجلے پھول" کے نام سے ہے۔ جس میں "گل ٹریا"، "تیکہ"، "اُجلے پھول"، "برکھا" اور "ایل ویرا" ایسے افسانے ہیں جن کا موضوع محبت ہے۔ ڈاکٹر محمد عالم خان اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

ان کے ابتدائی افسانوں میں ان کے رومانی تصورات بہت واضح ہیں۔ زندگی کی بالکل سامنے کی حقیقتیں کہانی کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اشفاق احمد اپنے رومانی طرز احساس کی مدد سے اس کہانی کو رنگین اور موثر بنادیتے ہیں اور ان کا افسانہ حقیقت اور رومانیت کا حسین امتزاج پیش کرنے لگتا ہے۔^۱

اشفاق احمد کے ہاں عشق و محبت کا تصور معیار سے بلند تر صورت میں ملتا ہے۔ وہ عشق جیسے پاکیزہ جذبے سے زندگی کی حرارت وصول کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ "توبہ" عشق کے مقصدی پہلو کو سامنے لاتا ہے۔ جہاں افسانے کا مرکزی کردار اعجاز نامی نوجوان سگریٹ نوشی کی بری عادت میں مبتلا تھا اور اپنی محبوبہ لیکھا کے کہنے پر سگریٹ نوشی سے توبہ کر لیتا ہے۔ یہاں اشفاق احمد عشق کو اصلاحی پہلو سے استعمال کر رہے ہیں۔ ان کی نظر میں عشق میں ایسی طاقت اور توانائی ضرور موجود ہوتی ہے کہ وہ زندگی بدلنے کی قدرت رکھتا ہو۔ ایک نوجوان جس پر ہر حربہ اور طریقہ آزمایا گیا، لالچ، مار، دباؤ، شریٹیں اور دھمکیاں دی گئیں مگر وہ سگریٹ نوشی سے باز نہیں آتا ہے مگر لیکھا کے کہنے پر اس عمل سے تائب ہو جاتا ہے۔ یہ عشق کا ہی کمال تھا کہ وہ ایک نوجوان کی زندگی میں مثبت تبدیلی کا باعث بنا۔ ڈاکٹر طاہر طیب اس افسانے کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

ان کا افسانہ "توبہ" بھی محبت کے موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے جس میں انسانی نفسیات کو خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔ اس افسانے میں اعجاز کا کردار اہم ہے جو والدین کے کہنے پر سگریٹ نوشی ترک نہیں کرتا مگر لڑکی کے لمس یا محبت کے ہاتھوں سگریٹ نوشی ترک کرنا گوارا کر لیتا ہے۔^۲

محبت کا یہی جذبہ ہمیں ان کے افسانے "رات بیت رہی ہے" کے کرداروں میں بھی نظر آتا ہے۔ پیٹر ایک امریکی ہوا باز ہے اور مارگریٹ اس کی محبوبہ ہے جو اسے پائلٹ کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی۔ جبکہ ارشد نامی ایک ہندوستانی نوجوان بھی بحری محاذ پر موجود ہے جو کہ پیٹر کا ساتھی ہوا باز اور ہم راز ہے۔ وہ بھی بحری جہاز پر جنگی حالات میں اپنی محبوبہ رینا کو یاد کرتا ہے۔ یہ جنگ عظیم دوم کے زمانے کی کہانی ہے۔ پیٹر، مارگریٹ، ارشد، رینا، پارلو اس کہانی کے اہم کردار ہیں۔ یہ کردار محبت کے سہارے زندگی گزار رہے ہیں۔ اشفاق احمد نے محبت کے جذبہ کو آفاقی اور عالمگیر قرار دیتے ہوئے مشرقی اور مغربی کرداروں کے ذریعے بتایا ہے کہ انسان محاذ جنگ پر ہوا یا حالت امن میں، اسے محبوب سے عزیز تر شے کوئی بھی نہیں ہوتی ہے۔ امریکی ہوا باز پیٹر اپنی محبوبہ کی خواہش پوری کرنے کے لیے فوج میں بھرتی ہوا اور جنگ شروع ہونے پر بطور پائلٹ بحری جہاز پر اڑنے والے طیاروں پر تعینات ہوا۔ وہ صبح شام اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے اپنی محبوبہ مارگریٹ کا ذکر کرتا رہتا، اسے خط لکھ لکھ کے بھیجتا رہتا، حتیٰ کہ آخری پرواز میں جب اس کے طیارے میں آگ لگ گئی اور وہ حالت نزع میں تھا تب بھی اپنی محبوبہ مارگریٹ کی تصویر طلب کی اور جان دے دی۔ اس رومانوی کردار کے ذریعے اشفاق احمد نے مشرق و مغرب میں محبت کے معاملے میں پائی جانے والی ایک جیسی شدت کو بیان کیا ہے۔ ہندوستانی نوجوان ارشد اور محبوبہ رینا کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر طاہر طیب لکھتے ہیں۔

افسانہ "رات بیت رہی ہے" بھی محبت کے موضوع پر ایک تخیل آمیز افسانہ ہے۔ اس افسانے میں پیٹر

کا کردار رومانوی مزاج کا حامل ہے۔ اشفاق احمد افسانوں میں مختلف صورتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔^۳

ڈاکٹر طاہر طیب بھی پیٹر کے کردار کو رومانوی کردار قرار دیتے ہیں۔ اشفاق احمد کا افسانہ "تلاش" محبت کے حوالے سے ایک مختلف صورت میں سامنے آتا ہے۔ انھوں نے محبت کے ایک نئے پہلو سے آشنا کرایا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک ننھا بچہ احسان ہے جو اپنے کتے جیکی سے بے حد پیار کرتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کے دوران جب مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے پاکستان کی جانب گامزن تھے اور صرف اشیائے ضروریہ ہی ان کے ساتھ تھیں تو ننھا احسان اپنا کتا جیکی بھی ہندوستان سے پاکستان لانے کی ضد کرتا ہے جسے کیپٹن ننھے بچے کی ضد سمجھ کر فوجی ٹرک میں لانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ اماں، کیپٹن حق نواز، خان، آپا، توقیر بھائی اس افسانے کے دیگر کردار ہیں۔ احسان کو اپنے کتے جیکی سے جنون کی حد تک محبت ہے۔ مگر کتا ہونے کی وجہ سے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ اماں اُسے گڈریوں کا کتا سمجھتی

تھیں جبکہ احسان اس کے بیس ناخنوں کی وجہ سے اعلیٰ نسل کا کتا سمجھتا تھا۔ خان کی مدد سے جبکی پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ لہذا خان بھی اماں کی نظر میں اس جرم میں برابر کا شریک تھا۔ جب غصے میں اماں نے خان کو ڈانٹا کہ تمہاری وجہ سے یہ کتا اس گھر میں ہے تو خان کتے کو اٹھا کر دور کہیں پھینک آتا ہے۔ جبکی کے گم ہو جانے سے گویا احسان کا سب کچھ کھو جاتا ہے۔ وہ دیوانگی اور شدید بے چینی کی حالت میں اسے تلاش کرنے نکل جاتا ہے اور خود بھی کھو جاتا ہے۔ اشفاق احمد نے احسان کو خدا کی مخلوق سے جنونی محبت کی مثال بنا کر پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں انسان تو انسان، جانوروں سے محبت کی انتہا اور جنون کو سامنے لایا گیا ہے اور محبت کے لیے ایثار اور قربانی کا درس دیا ہے۔ اس افسانے کے حوالے سے سید وقار عظیم رقمطراز ہیں۔

زندگی میں بچوں کا وجود محبت کی سب سے سچی اور سب سے مکمل تفسیر ہے۔ یہ اس محبت کی ایک سطح ہے جو ہمیں اشفاق احمد کے افسانوں میں دوسری چیزوں پر غالب اور حاوی نظر آتی ہے۔ اشفاق احمد کے افسانے "تلاش" اور "شب خون" اسی محبت کی عکاسی کرتے ہیں۔^۴

افسانہ "سنگدل" میں محبت ایک نئے اور منفرد روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد دونوں ملکوں میں گمشدہ اور اغوا شدہ عورتوں کی تلاش کے لیے ٹیمیں بھیجی گئیں۔ پاکستان سے نوجوان فوجی آفیسر مشرقی پنجاب میں اپنے آبائی علاقے میں مغویہ عورتوں کی برآمدگی اور محفوظ منتقلی کے لیے تعینات ہوا۔ وہاں اس کی بچپن کی دوست پٹی سے ملاقات ہوئی۔ یہ پٹی کے پتاجی کے اصرار پر ان کے ہاں رہنے لگا۔ پٹی سے محبت کو اشفاق احمد نے محبت جیسے جذبے کو بلا تخصیص مذہب و ملت پیش کیا ہے۔ پٹی مغویہ عورتوں کی برآمدگی میں مدد کرتی ہے اور حسنا نامی مسلمان عورت جو کہ سجن سنگھ نامی سخت دل انسان کی قید میں تھی، کورات کے اندھیرے میں فرار ہونے میں اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کر مدد کرتی ہے اور نوجوان آفیسر سے اپنی محبت قربان کر کے حسنا نامی عورت کی عزت اور زندگی بچا لیتی ہے۔ اشفاق احمد محبت کے مفہوم کو وسیع تر معنوں میں انسان دوستی تک پھیلا دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبت کا کوئی مذہب، علاقہ، زبان اور قوم نہیں ہوتی بلکہ یہ پاکیزہ احساس ہے جو ایک دوسرے کو زندہ رکھنے پر اور احساس کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ انسانیت کا درد ہی محبت کا درس ہے۔ جیسے پٹی الوداع ہوتے ہوئے اپنے عاشق سے اپنی محبت اور وفاؤں کا بدلہ ان الفاظ میں مانگتی ہے۔

مجھے پھولوں سے بہت پیار ہے میں ان پر جان دیتی ہوں۔ ہو سکے تو وہاں سے۔۔۔۔۔ حسنا اور دو بازیافتہ لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے " ایسے پھول بھیجتے رہنا۔ میں تمہیں بہت یاد کیا کروں گی۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اچھا تم اب جاؤ۔ دیکھو کتنی روشنی پھیل گئی ہے۔^۵

اشفاق احمد نے محبت کو مذہبی تعصب سے پاک اور بلند تر صورت میں پیش کیا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار اور پٹی میں ذہنی ہم آہنگی اور دلی ہمدردی کا جو احساس نظر آتا ہے۔ وہ قابل دید ہے۔ پٹی کا مغوی مسلمان عورتوں کو اپنے ملک کی طرف روانہ کر دینا محبت بھرے دودلوں میں موجود خلوص، محبت، ایثار و قربانی اور ہمدردی جیسے احساسات اور جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ جس میں مذہب، قوم، زبان، علاقے اور نسل کی قید اور تفریق نہیں ہے۔ افسانہ "بابا" کی بنیاد بھی انسان دوستی، انسانیت، ہمدردی اور رشتوں کا تقدس ہے اور ان تمام کا بنیادی محرک محبت ہے جو ایلن اور وحید کو ایک دوسرے سے ہے۔ وحید نامی نوجوان جو بابا کی اکلوتی اولاد ہے۔ میڈیکل کی تعلیم لینے انگلستان جاتا ہے تو ایلن سے پسند کی شادی کر کے وطن واپس آتا ہے۔ بابا اپنے بیٹے وحید کی محبت کو نہ صرف دل سے قبول کر لیتا ہے بلکہ اپنے پوتے مسعود کو اس سے بھی زیادہ چاہنے لگتا ہے۔ وہ وحید کو تاکید کرتا ہے کہ اپنی بیوی ایلن کی قدر کرنا، یہ دوسرے ملک سے سب کچھ چھوڑ کر تمہارے لیے محبت کے بندھن میں قید ہو کر آئی ہے۔ ایلن بھی رشتوں کو حد سے زیادہ محبت اور احترام دیتی ہے۔ انھیں زراعت کا شوق تھا تو گھر میں مقامی اور علاقائی کے ساتھ ساتھ ولایتی نسل کے پالتو جانور گھوڑا، گائے، مرغیاں اور بطخیں پال رکھی تھیں۔ ایلن کی ہمدردی جانوروں سے بھی ہے۔ جب گاؤں میں سیلاب آ جاتا ہے تو اندھیری رات میں جان کی پروا نہ کرتے ہوئے بچھڑے کی جان بچانے پانی میں کود جاتی ہے اور اس کی جان بچاتی ہے۔ بدلے میں اس کو سردی کی وجہ بخار ہو جاتا ہے۔ اور اس کی اپنی جان چلی جاتی ہے۔ اسی دوران فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔ بابا اپنے پوتے کے ساتھ ریلوے سٹیشن پر بلوائیوں سے بچتا بچتا پہنچتا ہے مگر وہاں پر بلوائیوں کے حملے میں پوتے کی جان بچاتے ہوئے قربان ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد نے اس افسانے میں کرداروں کے ذریعے محبت کے ایک اور پہلو سے روشناس کرایا ہے جس میں کردار اپنی محبت کے لیے جان کی قربانی تک دے دیتے ہیں مگر محبت کو رسوا نہیں ہونے دیتے۔ اس عمل میں وطن، نسل، زبان اور مذہب کی دیوار آڑے نہیں آتی۔ اشفاق احمد کا دوسرا افسانوی مجموعہ "اجلے پھول" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کا مشہور افسانہ "اجلے پھول" کا مرکزی موضوع محبت ہے۔ مرکزی کردار آپی اور انجم بھائی محبت کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ ڈاکٹر طیب طاہر اس افسانے اور کرداروں کی رومانویت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

افسانہ "اجلے پھول" بھی رومانوی فضا میں رچا بسا افسانہ ہے جس میں انجم اور آپی کا کردار محبت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس افسانے میں شاعرانہ اسلوب واضح ہے۔ اشفاق احمد کے ابتدائی افسانوں میں جذبات نگاری اور محبت کا جذبہ بہت بھرپور ہے اور رومان کارنگ پوری رنگینی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔^۶

افسانے میں انجم بھائی اور آپی کے علاوہ آلا جی، ڈیڈی اور لاما موموں دیگر کردار ہیں۔ انجم بھائی اپنی محبت کے ذریعے دونوں ناراض خاندانوں کے درمیان پل کا کام دیتے ہیں۔ دو بھائیوں کے تعلقات سرد مہری کا شکار تھے مگر جب انجم بھائی کو ملازمت مل جاتی ہے اور اسے شہر میں اپنے چچا جان کے ہاں رہائش اختیار کرنا پڑی تو وہاں بی ایس سی کی طالبہ آپی سے تعلقات گہری محبت میں بدلتے گئے۔ جو آگے چل کر دونوں خاندانوں میں گرجوشی کا سبب بنے۔ وہ خاندان جو برسوں سے دور تھے، محبت بھرے دو کرداروں کی بدولت قریب آئے اور منگنی کی رسم ادا کی گئی۔ اشفاق احمد محبت برائے محبت کے قائل نہ تھے بلکہ ان کے ہاں محبت ایک بھرپور اور توانائی کی حامل قوت کا نام ہے جو دنیا میں کچھ بھی کر دکھانے کی طاقت رکھتی ہے۔ یہاں بھی انجم اور آپی کی محبت سے دونوں گھرانوں کو قریب آنے کا موقع ملتا ہے۔ انجم بھائی کو جب فوج میں کمیشن مل جاتا ہے اور تعیناتی برما کے محاذ پر ہو جاتی ہے تو وہ موت کے ہاتھوں میں کھیلے ہوئے والدین کو گھر خطوط لکھتے رہے جن میں وہ والدین کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ ناراض بھائی کے گھر رشتہ مانگنے چلے جائیں۔ والدین اولاد کی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح محبت بھرے دو کردار دو خاندانوں کی قربت کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس افسانے کا انجام افسوسناک انداز میں ہوتا ہے۔ جب برما سے انجم بھائی کا سامان واپس آتا ہے اور دوسرے دن لاش گھر پہنچ جاتی ہے۔ کچھ عرصے بعد آپی کی شادی کسی دوسری جگہ کر دی جاتی ہے۔ لیکن جب بھی وہ میکے آتی ہے تو چھوٹی بہن کے ہمراہ قبرستان جاتی ہے اور گھر کے صحن اور پھلواری سے ابلے پھول ساتھ لے جانا نہیں بھولتی۔ اشفاق احمد کے ہاں محبت ایک ایسے مضبوط اور گہرے تعلق کا نام ہے جس میں صرف دو جسموں کا ملنا ہی ہدف نہیں ٹھہرا بلکہ ایک مضبوط احساس کا نام ہے۔ محبت جو مرنے کے بعد بھی دو افراد کو ملنے اور خراج عقیدت پیش کرنے کا نام ہے۔ آپی کا کردار اسی احساس کو نبھانے کا دوسرا نام ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اشفاق احمد نے انجم کے کردار میں امید، خوشی، مسرت اور بہادری جیسے اوصاف کو پیش کیا ہے۔ مایوسی، دکھ، خوف اور کرب جیسے جذبات انجم کے کردار میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ وہ آپی کو مایوسی اور خوف سے نکال کر امید اور خوشی کی طرف لے آتا ہے۔ اس کے پست حوصلے بلند کرتا ہے۔ جس بنا پر یہ کردار زیادہ پر اثر اور مضبوط تاثر ابھارنے میں کامیاب رہتا ہے۔ افسانہ "ایل ویرا" کا موضوع بھی محبت ہے۔ اس کا نام مرکزی کردار ایل ویرا کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ پروفیسر کے اٹلی قیام کے دوران پیش آنے والے واقعات پر مبنی افسانہ ہے۔ ایل ویرا ایک طوائف تھی۔ جبکہ پروفیسر اطالیہ کے نواب خاندان کی ریسما ماریا میں دلچسپی لیتا تھا۔ ریسما سنورینا ماریا بھی پروفیسر کو چاہتی تھی مگر اُسے اپنے خاندانی وقار اور عظمت کا بہت خیال تھا۔ پروفیسر کو حقیقی محبت اور وقت گزاری کے لیے قائم کیے گئے تعلقات میں فرق نہیں محسوس ہو پاتا۔ پروفیسر ایل ویرا کو طوائف سمجھتا تھا اور حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اشفاق احمد واضح کرتے ہیں کہ انسان بعض اوقات غرور، تکبر اور ہوس کا شکار ہو کر حقیقی اور سچائی کی

حامل پر خلوص محبتوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ ماریا کی محبت کے نشے میں مدھوش پروفیسر نے ایل ویرا کی محبت کو کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور ایل ویرا کی بے لوث چاہت اور ایثار کو وہ محض حماقت سمجھتا رہتا ہے۔ مگر افسانے کے اختتام پر پتہ چلتا ہے کہ ایل ویرا مضبوط احساسات و جذبات کی مالک تھی اور آخر میں دو ہزار لیرے (اٹلی کرنسی) الوداعی ملاقات میں واپس کر دیتی ہے جو اُس نے پروفیسر سے پہلی ملاقات میں بلا خدمت معاوضہ کے طور پر لیے تھے۔ اشفاق احمد نے بتایا ہے کہ دھڑکتا ہوا دل ایک طوائف کے دل میں بھی پایا جاتا ہے اور محبت کے خلوص بھرے جذبات اس کے من میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کو معاشرتی اونچ نیچ اور مرتبے کے لحاظ سے کم تر تصور کرتے ہوئے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ ایل ویرا نے رقم واپس کر کے ایک با اصول انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ انور سدید محبت کے اسی تصور کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت کا حسی تصور بے حد لطیف اور کثیر الاضلاع ہے۔ ان کے افسانے بظاہر محبت کے مرکزی نقطے پر گردش کرتے ہیں تاہم ان کے موضوعات متنوع ہیں اور وہ محبت کی قدیل سے زندگی کے بے شمار گوشوں کو منور کرتے چلے آ رہے ہیں۔^۷

اشفاق احمد نے زمانے کی تلخیوں اور مسائل کو اس لطیف انداز میں محبت میں سمو کر لکھا ہے کہ قاری محبت کے نئے معنی و مفہوم سے آشنا ہوتا ہے۔ زندگی سے محبت کے حوالے سے کئی پہلو قارئین کے سامنے بے نقاب ہوتے ہیں۔ اشفاق احمد نے انسان پر بیتنے والے احساسات و کیفیات کو خوبصورت اور سحر انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ قارئین کو مایوس نہیں ہونے دیتے ہیں بلکہ زندگی کو مثبت انداز میں انجام کی طرف لے جانے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی کے مسائل و مصائب سے گھبراتے نہیں بلکہ محبت کو ایک ایسے آلے اور ہتھیار کے طور پر متعارف کرواتے ہیں جس سے زندگی کی مشکلات و مسائل کو جھیلنے میں مدد مل سکے اور محبت کی طاقت و قوت سے ان کا مقابلہ کیا جاسکے۔ کیونکہ محبت کا جذبہ اپنے اندر اتنی طاقت ضرور رکھتا ہے کہ کائنات کے اندر کسی مثبت تبدیلی کا محرک اور باعث بن سکے۔ واضح ہوتا ہے کہ اشفاق احمد کا تصور محبت محدود نہیں بلکہ ہمہ جہت اور مختلف پہلوؤں کا حامل ہے جو ان کے افسانوں میں ہمیں ملتا ہے اور ان کے کرداروں سے جھلکتا ہوا دیکھا جاسکتا ہے۔ افسانہ "تنگہ" عطیہ بانو پیرزادی اور صوبیدار ریتے خان کے لڑکے کے پیار و محبت پر مشتمل ہے۔ اس افسانے میں محبت اور رومان کو انتہائی معصومانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے مگر طبقاتی امتیاز اور مادیت پرستی کی بھینٹ چڑھتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ہوس غالب آ جاتی ہے اور سچے جذبے کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اشفاق احمد نے محبت کو ایک نئے تناظر میں پیش کیا ہے۔ سرور ایک بی اے پاس نوجوان تھا جسے گاؤں کے بڑے پیرزادہ صاحب نے اپنی بھتیجی کو پڑھانے پہ مامور کیا۔ پڑھنے پڑھانے کے دوران ذہنی ہم آہنگی محبت کی صورت اختیار کر

گئی۔ مگر طبقاتی فرق آڑے آجاتا ہے۔ عطیہ نے افسردہ ہو کر سرور کو بتایا کہ میری منگنی عزیز الدین نامی شخص سے کردی گئی ہے جو کہ مالدار آدمی ہے۔ انیس ہزار اس کی پاس بک پر موجود ہیں۔ سرور بھی پیسے کمانے اور جوڑنے لگ جاتا ہے۔ ڈاکخانے کی نوکری کرتا ہے اور ہر وقت پیسے گنتا رہتا۔ اپنی ذات پہ کبھی خرچ نہ کرتا اور جمع کرنے کی فکر میں پورے دفتر میں کنجوس مشہور ہو گیا تھا۔ ایک دن ریلوے پلیٹ فارم پہ سکھ گر جاتا ہے اور اُسے پانے کے لیے پٹری پہ کود جاتا ہے اور اوپر سے گاڑی گزر جاتی ہے۔ پیسے جمع کر کے اپنی محبت کو پانے کی ناکام سعی میں مبتلا سرور بالآخر جان سے بھی جاتا ہے۔ محبت کا المناک انجام ہمیں محبت کے ایک نئے پہلو سے روشناس کراتا ہے۔ اشفاق احمد ان کرداروں کے ذریعے معاشرتی ناہمواریوں اور غیر انسانی رویوں کو بے نقاب کرتے ہیں کہ کس طرح عشق میں مبتلا نوجوان کو روپے پیسے اور مال و دولت جمع کرنے کے جنون میں مبتلا کر دیا گیا اور سرور نے اسی کو زندگی کا اوڑھنا بچھو بنا لیا اور بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اشفاق احمد کے کردار محبت کے لیے قربانی دیتے آئے ہیں اور اس افسانے کے انجام سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ سرور محبت کو پانے کے لیے اپنی جان تک دے دیتا ہے۔ اشفاق احمد واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جائے جس میں انسان کی تعلیم، خلوص اور شرافت کی قدر ہو۔ محبت کرنے والوں کو ان کا حق دیا جائے نہ کہ پہلے ان کو روپے پیسے میں تولد جائے۔ جہاں صرف دولت کو ہی سلام نہ کیا جائے، کسی کی زندگی کی قیمت پٹری پہ گری اٹھنی ہی نہ ہو۔ ایسا معاشرہ جس میں اخلاقی قدریں عام ہوں اور معاشرتی رویے صحت مند ہوں۔

ب۔ مذہبی عناصر کے حامل کردار

اشفاق احمد کے بیشتر افسانوں میں محبت مرکزی موضوع کے طور پر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جو دو سرا عنصر ان کے افسانوں میں اکثر و بیشتر ملتا ہے وہ مذہب ہے۔ مذہب کے حوالے سے وہ تمام مذاہب کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے اس لیے ان کے افسانوں میں مختلف مذاہب کا حوالہ موجود ہے۔ ان کے افسانوں کے کرداروں میں عیسائی، سکھ، ہندو اور لادین لوگ پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ اشفاق احمد نے زندگی کے حقیقی ماحول سے گہرے مشاہدے کی بنا پر موضوعات اور کردار لیے ہیں اور کرداروں کی تعمیر و تشکیل میں جو خام مواد استعمال کیا ہے وہ حقیقی زندگی سے اخذ شدہ ہے۔ اس لیے ان کے موضوعات اور کرداروں میں مصنوعی پن دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ موضوعات میں یکسانیت سے گریز کرتے ہوئے انھوں نے کرداروں میں بھی مختلف مذاہب کے لوگوں کو پیش کر کے قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ اشفاق احمد کے ہاں مذہب کا خاص تصور پایا جاتا ہے۔ وہ محض عبادت اور رسومات کو ہی مذہب خیال نہیں کرتے ہیں بلکہ مذہب کی روح کے مطابق عمل کرنے اور رائج کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ کیونکہ باطنی پاکیزگی ہی ذہنی اور روحانی سکون کی ضامن ہے۔ انھوں نے حسب ضرورت اور موقع محل کے مطابق مذہبی

عناصر کا سہارا ضرور لیا ہے مگر کبھی بھی کہانی، افسانے یا کردار کو اس پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ "سائنس، مذہب اور کھوج" کے عنوان سے مضمون مشمولہ "زاویہ ۳" میں رقمطراز ہیں۔

تمام مذاہب معصومیت پر یقین رکھتے ہیں اور انسانوں کو معصومیت کی راہ سے پاکیزگی عطا کرتے ہیں۔ مذاہب کے راہنما اور پیغمبران ہمیشہ اُمی ہوتے ہیں اور معصوم ہوتے ہیں اور وہ معصومیت کے ذریعے پاکیزگی عطا کرتے ہیں۔^۸

واضح ہوتا ہے کہ اشفاق احمد مذہب کے حوالے سے ایک خاص رائے کے حامل تھے۔ وہ مذاہب کے رہنماؤں اور پیغمبروں کو ایسی معصوم ہستیاں تسلیم کرتے تھے جن کے ذریعے مخلوق خدا پاکیزگی، رہنمائی اور فلاح کا پیغام حاصل کرتی ہے۔ ان ہستیوں کی تعلیمات اور عمل انسانوں کو حقیقت سے روشناس کرتا ہے اور معاشرے میں اتفاق، محبت، امن و آشتی اور ہم آہنگی کے لیے اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ تمام مذہبی رہنماؤں کا مقصد انسانیت کی فلاح رہا ہے۔ چاہے وہ الہامی ہوں یا غیر الہامی۔ ان کی تعلیمات انسانیت کے لیے عام ہوتی ہیں اور امن و سکون والی زندگی کی ضامن بھی۔ اشفاق احمد کے نزدیک مذہب انسانی زندگی سے وابستہ تمام راز و اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے اور کائنات کے اندر پھیلی ہوئی اشیاء کو معانی عطا کرتا ہے۔ مذہبی تعلیمات انسانوں کو معاشرے میں زندہ رہنے اور زندگی بسر کرنے کے اصولوں سے آشنا کرتی ہیں۔ مذہبی تعلیمات اور اصولوں پر عمل پیرا انسان ہی معاشرے میں مقام اور کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ تمام مذاہب کی تعلیمات اور اصولوں کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اخلاقی اصول نہ صرف یکساں ہیں بلکہ آفاقی اور عین فطری ہیں۔ اشفاق احمد مذہب کے اس پہلو کو سامنے رکھتے تھے۔ زندگی کا راز بھی حرکت و عمل اور کوشش و جدوجہد میں چھپا ہوا ہے اور بے عملی سستی اور مایوسی کا سبب ہے۔ اس لیے اشفاق احمد مذہب کو ضروری گردانتے ہیں اور مذہب کے ذریعے عمل پیہم اور مسلسل کوشش کا سبق لیتے ہیں۔ اشفاق احمد نہ صرف اسلام بلکہ دیگر تمام مذاہب کا بھی احترام کرتے تھے۔ ان کے متعلق عطا الحق قاسمی لکھتے ہیں۔

اشفاق احمد تمام مذاہب کا دل سے احترام کرتے تھے۔ بہت سے مذاہب کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ قرآن میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے چند ایک کا ذکر ہے۔ چنانچہ ممکن ہے یہ ہستیاں بھی اللہ کی فرستادہ ہوں۔ ان کے پیروکاروں نے ان کی تعلیمات کی شکل مسخ کر دی ہو۔^۹

اسلام کی تعلیمات کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام سلامتی کا دین ہے اور اس کے پیروکاروں کو احترام آدمیت، آزادی اظہار رائے، اختلاف برداشت کرنا، مذاہب کا احترام، اقلیتوں کے حقوق ادا کرنا اور اسی طرح کے دیگر احکامات کا پابند بنایا گیا ہے۔ اشفاق احمد بھی اسی پہلو سے دوسرے مذاہب کا احترام کرتے تھے اور اپنے افسانوں میں دوسرے مذاہب کے کرداروں کا تذکرہ کیا ہے اور انھیں جگہ دی ہے۔ "ایک محبت سو افسانے" مجموعے میں شامل افسانہ "فہیم" ایک خاندان کی کہانی ہے۔ وہ کہانی نانی اماں اپنے بچوں کو سنار ہی ہیں اور پورا قصہ، واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ نانی اماں گھر کی بڑی بوڑھیوں کی طرح مذہبی خاتون ہیں

اور اقدار کی پابند اور قدر کرنے والی ہیں۔ وہ بظاہر رات کو سونے سے پہلے اپنے نواسے نواسیوں کو کہانی سنارہی ہوتی ہیں مگر مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار بھی ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کر رہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے خاندان کے قصے اور گزری ہوئی تاریخی باتیں نواسے نواسیوں کو دلچسپ انداز میں سنارہی ہوتی ہیں اور جہاں کہیں ضرورت پڑتی ہے اسلامی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی عکاسی کرتی ہیں۔ جب وہ ایک مرحوم کا ذکر کرتی ہیں تو ان الفاظ کا سہارا لیتی ہیں۔

بابو بھائی، خدا اسے جنت نصیب کرے، بسم اللہ الرحمن الرحیم اس کی روح کو ثواب

پہنچے، ہمیشہ میری طرف داری کرتا تھا۔ تمہارے نانا خدا اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب

کرے فقیر تھا۔^{۱۰}

ایصال ثواب کرنا اور مرحوم کا نام ادب و احترام سے لینا مذہبی تعلیمات کے پیش نظر ہماری سماجی روایات کا حصہ ہے۔ جب بھی کوئی کسی مرحوم کا ذکر کرتا ہے تو اسے اچھے القاب و آداب کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے اور چونکہ مرحوم کے اعمال کا سلسلہ رک جاتا ہے تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ پڑھ کر بطور تحفہ بھیجنا بھی ہماری اقدار کا حصہ ہے۔ نانی اماں اسی روایت کو نبھارہی ہیں اور اس کے لیے دعائیہ کلمات ادا کر رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُسے جنت نصیب کرے۔ کیونکہ بطور مسلمان اُخروی کامیابی اور جنت کا حصول ہی ایک مسلمان اور مومن کا مطمح نظر رہا ہے تو نانی اماں مرحوم کے لیے جنت الفردوس کی دعا کر رہی ہیں۔ اشفاق احمد کے کردار اسی طرح مذہب کو پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ مذہب کے ایک خاص پہلو روحانیت اور تصوف کی طرف بھی اشفاق احمد قائل تھے۔ ان کو دور حاضر کا ماڈرن صوفی بھی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ تصوف میں صرف کشف و کرامات کے قائل نہ تھے بلکہ اصل مقصد باطنی پاکیزگی کے ذریعے روحانی طاقت حاصل کرنا ہے۔ جس کے ذریعے انسانوں کو محبت، اخلاق اور بھلائی کا پیغام دیا جانا مقصود ہوتا ہے۔ تصوف کی راہ کے مسافر تھے اور بہت سے بابوں کے ڈیروں پہ حاضری دیتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

دور افتادہ جگہوں پر ڈیرہ لگانے والے بابے اس کے ہم سفر تھے۔ وہ نور والے بابے کی باتیں کرتا تھا

اور اس کی آنکھیں نظر کے آنے والے نور سے بھیگ جایا کرتی تھیں۔ اس نے مذہب کی بات

تخلیقی انداز میں کی۔ دین و دانش کو ر لایا ملایا۔ دانش اور لوک دانش کو ملایا جلایا۔ وہ صوفی تھا۔^{۱۱}

ان کے اندر کا چھپا ہوا صوفی "فہیم" افسانے میں نانا کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ نانی اماں اپنے نو سے نواسیوں کو بتا رہی ہوتی ہیں کہ ان کا نانا گڑھ شکر میں نائب تحصیلدار تھا۔ بڑی حویلی، نوکر چاکر، بھینسیں، گھوڑے، کتے وغیرہ ان کے ہاں موجود تھے۔ مگر نانا کو جب پتہ چلا کہ قریبی علاقے میں ایک درویش آیا ہے جو نہ کسی سے ملتا ہے اور نہ کسی سے کچھ لیتا دیتا ہے تو نانا اس درویش کی عظمت کے قائل ہو جاتے ہیں۔ انھیں ایک کامل بزرگ اور پیر کی تلاش تھی اور اس فقیر کی صورت میں انھیں یہ تلاش پوری

ہوتی نظر آنے لگتی ہے۔ وہ اس مقصد کے لیے سرکاری نوکری تک چھوڑ دیتے ہیں اور اس بزرگ کی خدمت میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ استغنیٰ دینے کے بعد جب گھر سے جانے لگتے ہیں تو نانی اماں کو یوں قائل کرتے ہیں۔

تم تو پگلی ہو۔۔۔ بجائے خوش ہونے کے خفا ہوتی ہو۔ وہاں جا کر آخرت کا توشہ مہیا کروں گا۔ درویش کی خدمت گزاری اس ملازمت سے بدرجہا اچھی ہے۔ سرکار کی نوکری کا جل کو ٹھڑی ہے اور اس میں دھبہ لگنے کا ڈر ہی لگا رہتا ہے۔^{۱۲}

اشفاق احمد نے اپنے کرداروں کے ذریعے جہاں صوفی ازم اور تصوف کو پروان چڑھایا ہے۔ وہیں انھوں نے مذہب کی آڑ میں توہم پرستی کے کاروبار کو فروغ دینے کی مذمت اور حوصلہ شکنی بھی کی ہے۔ جب نانا جی کو وہ کاندار ویش راتوں رات لوٹ کر اور دغا دے کر نکل جاتا ہے تو نانا خالی ہاتھ گھر واپس لوٹتے ہیں اور بہت نادام ہوتے ہیں۔ یہاں اشفاق احمد مذہب کی آڑ میں سرگرم منفی کرداروں کو سامنے لاتے ہیں جو لوگوں کو ورغلا تے ہیں، دین کے نام پہ بہکاتے ہیں اور دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ دین کے نام پر بد نما داغ کی مانند ہوتے ہیں اور لوگوں میں گمراہی پھیلانے کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے کرداروں کی اشفاق احمد حوصلہ شکنی کرتے نظر آتے ہیں اور لوگوں کے سامنے تصویر کا دوسرا رخ بھی لاتے ہیں تاکہ خلق خدا سبق حاصل کرے اور اس طرح کے کرداروں سے اپنا دامن بچا سکے۔ "افسانہ رات بیت رہی ہے"، امریکی اور ہندوستانی ہوا بازوں کی یادداشتوں پر مبنی ہے جب وہ لوگ محاذ پر ہوتے ہیں۔ پیٹر امریکی ہوا باز ہے اور اس کی محبوبہ کا نام مارگریٹ ہے جبکہ ارشد نامی ہندوستانی ہوا باز اپنی محبوبہ رینا کو یاد کرتا رہتا ہے۔ دونوں کرداروں کا وقت جنگی ماحول میں اپنی محبوب ہستیوں کو یاد کر کے گزرتا ہے۔ اشفاق احمد محبت کے قائل تھے اور اسے آفاقی جذبہ قرار دیتے ہیں جو مشرق و مغرب کی حدود و قیود سے آزاد ہے۔ مشرق و مغرب کے کردار اپنی اپنی محبوباؤں کے قصے کہانیاں ایک دوسرے کو سناتے رہتے ہیں۔ پیٹر کا باپ عیسائی ہے۔ اس کے متعلق اشفاق احمد بتاتے ہیں۔ "پیٹر کا باپ کسی یونیورسٹی میں جغرافیہ کا پروفیسر ہے۔ وہ رومن کیتھولک خیالات کا حامی ہے اور انجیل کو چوم کر کھولتا ہے۔" ^{۱۳} پیٹر امریکی ہوا باز ہے جو کہ محاذ جنگ پر بحری جہاز پر سوار فوجی دستے کا بطور پائلٹ حصہ ہے۔ اس کے والد کے عقیدے کے متعلق اشفاق احمد نے واضح کیا ہے۔ اسی طرح جب اس کی پرواز کا وقت ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھی ہوا باز کو یوں بتاتا ہے۔

میں جہاز کے نچلے عرشہ سے ہو آیا ہوں جہاں ہمارا طیارہ کھڑا ہے۔ اس کی آب و تاب ہی نرالی ہے اور وہ دوسرے طیاروں میں سب سے الگ دکھائی دیتا ہے۔ میں اس کے پروں پر صلیب کا نشان بنا آیا ہوں۔ خداوند یسوع مسیح نے آج تک میرے طیارے کو سبکسار نہیں کیا۔ اب بھی اس سے یہی دعا ہے۔^{۱۴}

پیٹر کے جذبات مذہبی تعلیمات اور عقیدے کے مطابق بہت عمدہ طریقے سے اشفاق احمد نے بیان کیے ہیں۔ کیونکہ محاذ پر جب جوان جنگ کے لیے تیار کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنی موت کو اپنی آنکھوں سے بہت قریب سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ یہاں وہ موت کے بعد کی زندگی کو سامنے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ موت سے بچنے اور جنگ جیتنے کے لیے ہر حربہ انسان آزماتا ہے۔ یہاں پر بھی تمام دنیاوی تیاریوں کے بعد اپنا فیصلہ خدا تعالیٰ کی ذات پہ چھوڑ دیتا ہے۔ جب وہ جہاز کے پروں پر صلیب کا نشان بنا آتا ہے تو اپنے طور پہ اپنے جہاز کو تین خداؤں کی امان میں دے دیتا ہے اور اس یقین کے ساتھ کہ خداوند یسوع مسیح اس طیارے کو کبھی گرنے نہیں دے گا اور طیارے کو کبھی بھی نقصان نہیں پہنچ پائے گا۔ اشفاق احمد نے اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگوں کو بھی کردار کے طور پہ پیش کیا ہے اور ان کے مذہبی عقائد و تعلیمات کو ان ہی کی زبانی پیش کیا ہے۔ یہ ایک بہترین انداز ہے کہ انھی کے معمولات کو پیش کیا جائے جو ان کے ہاں رائج ہوں اور دیگر رسم و رواج وغیرہ جو ان کے مذہبی تعلیمات کے زیر اثر ہیں۔ پیٹر کا کردار مذہبی عقائد کے نمائندہ کے طور پر بہترین انداز میں پیش کیا گیا۔ افسانہ "تلاش" میں کہانی ننھے احسان کے کتے جیکی کے گرد گھومتی ہے۔ ننھا احسان یہ کتا ہجرت کے دوران ساتھ لایا تھا اور اس میں اس کی جان تھی۔ یہ کتے کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ جب امی کی ڈانٹ ڈپٹ سے تنگ آ کر خان اس کتے کو کہیں دور پھینک آتا ہے تو اس کتے کی تلاش میں سارا گھر لگ جاتا ہے۔ ننھا احسان بھی کتے کو ڈھونڈنے میں تو قیر بھائی کے ساتھ نکل پڑتا ہے۔ دن رات ایک کر کے کتے کو ڈھونڈا جاتا ہے مگر وہ کہیں نہیں مل پاتا۔ شام کو واپسی پہ ننھا احسان راستے میں واقع ایک مزار پیر بخاری پہ رک جاتا ہے اور تو قیر بھائی کو بتاتا ہے۔

تو قیر بھائی، پیر بخاری کرے اگر وہ زندہ ہے تو آرام سے رہے۔ اسے کوئی صاحب پال لے یا وہ کتوں کا سردار بن جائے۔ قرآن شریف کی قسم میں نے پانچ پیسے اس لیے نہیں چڑھائے کہ وہ مجھے واپس مل جائے بلکہ اس لیے چڑھائے ہیں کہ جیکی زندہ رہے اور کوئی تکلیف اسے نہ پہنچے۔ پیر بخاری سب کی بات پوری کر دیتے ہیں۔ شاید میری۔۔۔ میری بھی۔۔۔۔۔ پھر اس کی آواز تھرا گئی۔^{۱۵}

ننھے احسان کے خیالات سے اس کے گھر کی سوچ جھلک رہی ہے۔ ہمارے معاشرے میں درباروں، مزاروں پر جانا اور مشکل وقت میں منت ماننا ایک عام سی بات ہے۔ ننھے احسان کا عزیز از جان کتا جیکی جب گم ہو جاتا ہے تو ننھا احسان اس کو ڈھونڈنے کے لیے ہر حربہ آزماتا ہے مگر وہ نہیں مل سکتا۔ اسی دوران اسے پیر بخاری کے مزار کے پاس سے گزرنے کا موقع ملتا ہے تو وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندر چلا جاتا ہے اور دعا کرتا ہے اور ساتھ پانچ پیسے چڑھاوا بھی چڑھا آتا ہے۔ اور کتے کی خیر و عافیت کی دعائیں مانگتا ہے۔ اسی افسانے میں اس کی والدہ بھی اسی مزار پر حاضری دیتی ہیں اور ننھے احسان کے گمشدہ جیکی اور اپنے بیٹے کے لیے دعائیں کرتی ہیں۔ چونکہ اشفاق احمد کو تصوف سے لگاؤ تھا اور مزاروں، درباروں سے عقیدت اور لگاؤ تھا اس لیے اس کہانی میں بھی اس کے اثرات ملتے ہیں۔ افسانہ سنگ دل میں نوجوان آفیسر جو کہ تقسیم ہند کے بعد اغوا شدہ لڑکیوں کی برآمدگی پہ تعینات ہوتا ہے۔ وہ بچپن کی ہم جولی ہندو مذہب کی لڑکی پتی پہ فریفتہ ہو جاتا ہے۔ دونوں میں پیار محبت بڑھ جاتا ہے۔ مگر پتی وسیع قلبی کا مظاہرہ

کرتے ہوئے مسلمان لڑکیاں جو ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں تھیں، ان کی برآمدگی اور بازیافت میں ہر ممکن مدد کرتی ہے۔ بلکہ حسنانامی لڑکی جو کہ سنگ دل سجن سنگھ کے ہاں قید تھی، رات کے اندھیرے میں دیوار پھلانگ کر اسے رہائی دلاوتی ہے اور پاکستان کی جانب روانہ کر دیتی ہے۔ یہ اشفاق احمد کے کرداروں کی خوبی ہے کہ وہ بلا تفریق مذہب انسانیت کا علم اٹھائے ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں مذہب، فرقہ اور مسلک کی قید نہیں۔ "شب خون" افسانے میں بھی ہمیں مختلف مذاہب کے لوگ کرداروں کی صورت میں ملتے ہیں۔ بیٹرس نامی نرس عیسائی ہے جو کہ مسلمان مریض شوق کے لیے پیار اور محبت بھرے جذبات رکھتی ہے۔ وہ ٹی بی کی وارڈ میں اُسے بہت پسند کرتی ہے اور اس کی دیکھ بھال دل و جان سے کرتی ہے۔ مسٹر بھومکا ہندو، سپورن سنگھ سکھ، کامریڈ اصغر لادین اور صوفی ابراہیم مذہباً مسلمان کردار ہیں۔ ٹی بی مریضوں کی سوچ کی عکاسی کرتی یہ کہانی ٹی بی وارڈ میں پیش آنے والے حالات و واقعات پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر شاہ، ڈورن، بیٹرس، مس تھاپر، سسٹر اور نرس بوائے طبی عملے پر مشتمل کردار ہیں۔ اس وارڈ میں ٹی بی جیسے جان لیوا مرض میں مبتلا مریض زندگی کے آخری ایام گزارنے آتے تھے۔ ایک رات جب وہ تمام لوگ گزرے زمانے کو یاد کر رہے تھے اور اپنے عزیز واقارب اور رشتہ داروں کے ساتھ ساتھ اپنے پیار و محبت کو یاد کر رہے تھے کہ کس کی موت پہ کون کون روئے گا۔ کوئی اپنی محبوبہ تو کوئی والدین، بیوی بچوں کا حوالہ دیتا۔ شوقرمان بھرے جذبات کا اظہار کرتا ہے کہ کوئی مہندی لگے ہاتھ میرا ماتم کرتے تو کامریڈ اصغر کیا جواب دیتا ہے۔

کاش کوئی مہندی لگا ہاتھ میرا ماتم کرتا۔ شوق تھک کر خاموش ہو گیا۔ "کاش خدا کی آنکھوں میں

سرمہ لگا ہوتا اور اس کے ہاتھ حنا آلود ہوتے" کامریڈ اصغر نے کہا۔ "کیونکہ وہی ہمیں روئے گا

اور وہی مالک روز جزا کا اور رب ہے سارے عالموں کا" تم ہر بات میں خدا کو کیوں کھینچ لاتے ہو؟

صوفی ابراہیم نے کہا۔ "اس کے قہر سے ڈرو" کامریڈ ہنسنے لگا اور ہنسنے ہنسنے بے حال ہو گیا۔^{۱۶}

کامریڈ اصغر کا کردار اشفاق احمد نے لادین فرد کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ خدا کی ذات اور وجود پہ یقین نہ رکھتا تھا۔ وہ کسی بھی مذہب کا پیروکار نہ تھا اور دوسرے مذاہب کے خداؤں کا مذاق اڑاتا رہتا تھا۔ چونکہ ان کے افکار و نظریات اور تصورات کے مطابق خدا کی ذات کا کوئی وجود نہ ہے بلکہ یہ ایک نظام ہے جو چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ اس کے لیے کسی رام، رحمن، ایشور، بھگوان یا گاڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے وہ ان تمام مذاہب کے افراد کی باتوں کو ہنسی مذاق میں اڑا دیتا تھا۔ اشفاق احمد نے جہاں دیگر الہامی و غیر الہامی مذاہب کو نمائندگی دی ہے۔ وہیں انھوں نے لادین طبقے اور گروہ کے افراد کو بھی پیش کیا ہے تاکہ تمام ادیان اور مذاہب کے لوگوں کے افکار و نظریات سامنے لائے جاسکیں اور عوام تک ان کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو پہنچایا جاسکے۔ تمام مذاہب ایک دوسرے سے پیار کرنا اور امن و سلامتی کا پیغام دیتے ہیں اور یہی پیغام اشفاق احمد اپنے کرداروں کے ذریعے دینا چاہتے ہیں۔ افسانہ "بابا" فسادات کے تناظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ جس میں بابا اپنے پوتے مسعود کی جان بچاتے ہوئے بلوائیوں کے حملے میں جان سے چلا جاتا ہے۔ اس کا بیٹا وحید جب میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے انگلستان چلا جاتا ہے تو وہاں اپنے ہم جماعت کی بہن سے شادی

کر لیتا ہے اور وطن واپسی پہ بابا اپنے اکلوتے بیٹے کی پسند پہ راضی زندگی گزارنے لگتا ہے۔ ایلن مذہباً عیسائی خاتون تھی۔ دادا اپنے پوتے مسعود کی مذہبی تعلیم کے لیے بہت فکر مند رہتا تھا۔ وہ ہر وقت اپنے پوتے کو ساتھ ساتھ رکھتا اور اسے بنیادی اسلامی تعلیمات اور عقائد بتاتا رہتا۔ ایلن کے مذہب کی قدر و حید کرتا ہے اور مذہبی تعصب نہیں رکھتا ہے۔ اس کا دل ایلن کے لیے محبت سے بھرا ہوا ہے۔ دونوں کرداروں میں مثالی محبت اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا احساس پایا جاتا ہے۔ ایلن جب وحید کو صبح صبح جگاتی ہے تو وحید کا رد عمل ملاحظہ کیجیے۔

وحید نے ایلن کے گریبان سے باہر لٹکی ہوئی طلائی صلیب کو دیکھا اور اسے اپنے ہونٹوں میں دبالیہ۔ سورج کی کرن دے پاؤں پھر باہر نکل گئی۔^{۱۷}

ایلن کے گلے میں لٹکی ہوئی صلیب کو پیار سے چوم لینا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وحید کے دل میں ایلن کے مذہب اور مذہبی علامات کے بارے میں پیار اور عقیدت بھرے جذبات موجود ہیں۔ وہ نہ صرف صلیب کو چوم لیتا ہے بلکہ اس کے مذہبی عقائد اور علامات کا احترام کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے۔ یہ اشفاق احمد کا کمال ہے کہ ان کے کرداروں کے ہاں مذہبی رواداری پائی جاتی ہے۔ وہ کسی بھی موڑ پہ مذہبی تعصب کا شکار نہیں ہوتے بلکہ ان کے کردار وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اشفاق احمد کا مشہور زمانہ افسانہ "گڈریا" بھی مذہبی پہلو لیے ہوئے ہے۔ تعصب و تنگ نظری سے پاک معاشرے کا قیام اور معاشرتی اقدار کا احیاء ہی افسانہ نگار کا مقصود ہے۔ یہاں اشفاق احمد کے اس افسانے کا مرکزی کردار داؤجی مذہباً گھٹری ہے۔ جسے مسلمان استاد حضرت اسماعیل چشتی رح کی نگاہ ناز چنتو سے چنت رام بنا دیتی ہے۔ گڈریا کا داؤجی آج بھی اپنے پیغام کی شان و شوکت کے ساتھ زندہ ہے۔ "گڈریا" کا داؤجی اردو کے افسانوی ادب میں نہ صرف یہ کہ نہایت ارفع مقام حاصل کر چکا ہے بلکہ اشفاق احمد کی پہچان اور شناخت بن چکا ہے۔ گڈریا کا شمار اردو ادب کی چند ایک بہترین اور مقبول عام کہانیوں میں ہوتا ہے۔ "گڈریا" کا مرکزی کردار داؤجی ایک صوفی منش شخص ہے جو منشی گیری سے ریٹائر ہو چکا ہے اور قصبے کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتا ہے۔ اس کا مشن گاؤں کے بچوں کو بغیر کسی معاوضے، صلے اور اجرت کے زیور علم سے آراستہ کرنا ہے۔ جس میں رنگ، نسل، ذات پات، مذہب و قوم کا فرق نہیں رکھا جاتا تھا۔ اشفاق احمد اس افسانے کے حوالے سے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ "میں نے اپنا افسانہ "گڈریا" اٹلی کی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہو کر لکھا۔" ^{۱۸}

گڈریا کا داؤجی بھی متعصب لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ انسانیت، مذہب یا معاشرہ کسی تعصب کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ وہ ختم الرسل ﷺ کو اپنا رہبر قرار دیتے تھے۔ اسلامی تعلیمات کا گہرا مطالعہ اور اثر داؤجی کی گفتگو سے صاف جھلکتا

ہے۔ گو کہ داؤجی کا تعلق ہندو مذہب سے تھا مگر مکمل رجحان اسلامی معاشرت اور طرز زندگی کی طرف آتا ہے۔ جب گولو پہلی مرتبہ داؤجی کو ملنے گھر جاتا ہے تو وہ انھیں سورۃ فاتحہ سناتا ہے اور مکمل ہونے پر داؤجی با آواز بلند آمین کہتے ہیں۔ اور سورۃ فاتحہ سننے کے دوران ادب سے پانچے نیچے کر لیتے ہیں۔ اسی طرح گولو سے کلمے یاد ہونے کی بابت دریافت کرنا، بیٹی قراۃ العین کو الوداع کہتے ہوئے لا حول ولا قوۃ پڑھنے کی تلقین کرنا، پاؤں پر گرم چائے گر جانے پر ذکر خدا اور رسول ﷺ کے صبر کا حوالہ دینا جب بوڑھی عورت اوپر کوڑا پھینکا کرتی تھی، بیٹی کی شادی کے لیے استخارہ کرنا وغیرہ ایسے افعال ہیں جو داؤجی کے کردار میں مذہبی تعصب نہ ہونے کی دلیل ہیں اور داؤجی کو مسلم ثقافت و معاشرت کا دلدادہ ثابت کرتے ہیں۔ ممتاز مفتی نے اشفاق احمد کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ ان کو صوفی قرار دیتے ہیں۔ "اور اوکھے لوگ" میں وہ اشفاق احمد کے متعلق لکھتے ہیں۔

پتہ نہیں کن وجوہات کی بنا پر اشفاق احمد کی شخصیت میں ہفت رنگی عناصر پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک بے نیاز صوفی بابا، رکھ رکھاؤ سے سرشار۔^{۱۹}

یہی صوفی داؤجی کے کردار کی صورت میں قارئین کے سامنے آتا ہے۔ داؤجی کی ہمہ جہت شخصیت، انسان دوستی کی مثال ہے۔ رنگ و نسل اور مذہب کی تفریق کیے بنا وہ انسان دوستی اور رواداری کا پیغام دیتے ہیں۔ درس و تدریس ان کا پیشہ اور بلا معاوضہ ہر دم طالب علموں کو پڑھانے کی لگن ان پہ سوار رہتی۔ وہ اسی مقصد کے تحت محلے اور پڑوسیوں کے بچوں کو پڑھاتے رہتے۔ ایک غیر مذہب ہوتے ہوئے اپنے استاد حضرت اسماعیل چشتیؒ سے علوم کے ساتھ ساتھ فیض حاصل کیا کہ ان ہی کے طریقہ کار کو اپنائے ہوئے تھے اور اس سلسلے کو مزید فروغ دے رہے تھے۔ ایک صاحب نظر کی صحبت کا اثر تھا کہ دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ داؤجی کو اسلام کی تعلیمات پر عبور تھا جو کہ ان کی محنت، لگن اور علم دوستی کا بین ثبوت ہے۔ ان کی زندگی کا کمزور پہلو ان کی سخت زبان، چڑچڑی بیوی بے تھی۔ ایک دفعہ بے بے نے جب غصے میں ان کے پاؤں پر گرم چائے گرا دی تو ان کی بیٹی قراۃ العین رونے لگی اور گولو ہنسنے لگا تو داؤجی نے اپنا رد عمل ان الفاظ میں دیا۔

میں تو اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے سر مطہر پر کلمے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی "میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ و شیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پر۔ وہ اپنے محبوب کے طفیل نار جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیم مجھے جرات عطا کر، مولائے ایوب مجھے صبر کی نعمت دے۔"^{۲۰}

داؤجی کے اندر کا انسان صبر و استقامت کے لیے کتنے بیش قیمت خیالات رکھتا تھا۔ جن کو جان کر گولو کو بھی حیرت ہو رہی تھی کہ ایک غیر مذہب انسان بھی کس طرح انبیائے کرام کے صبر و استقامت کی مثالیں دے رہا تھا اور ان کی مدد طلب کر رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ان پاکیزہ اور برگزیدہ ہستیوں کے حوالے سے یاد کر رہا تھا اور رحم طلب کر رہا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک صوفی کا دل اور کسی صاحب بصیرت کی نظر کا کمال ہی تھا جو کہ داؤجی کے کردار سے جھلک رہا تھا۔ اشفاق احمد اسی مسلک کے پیروکار دکھائی دیتے ہیں جو کہ آگے چل کر زاویہ، تلقین شاہ، من چلے کا سودا اور بابا صاحب کی صورت میں عوام کے سامنے آیا۔ اشفاق احمد مذہب کے ایک خاص پہلو روحانیت، صوفی ازم اور تصوف سے گہرے لگاؤ کی نسبت سے اس حوالے سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ وہ ایک دانشور اور ادیب کے ساتھ ساتھ صوفی بزرگ اور بابے کے طور پر بھی نمایاں مقام کے حامل تھے۔

ج۔ علمی و ادبی کردار

اشفاق احمد ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے افسانوں میں جہاں ہمیں عشقیہ کردار اور مذہبی عناصر ملتے ہیں وہیں پر ان کے ہاں تعلیم و تدریس اور علم و ادب کا ذوق رکھنے والے کردار اور عناصر کثرت سے ملتے ہیں۔ اشفاق احمد خود ایک معلم کے طور پر اندرون ملک اور بیرون ملک کام کرتے رہے ہیں لہذا اس کام کی چھاپ ان کے افسانوں میں گہری نظر آتی ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جب اشفاق احمد نے افسانہ نگاری شروع کی تو اس وقت تحریک پاکستان آخری مراحل میں تھی۔ انگریز سرکار جانے والی تھی۔ سر سید احمد خان کی علمی تحریک کئی دہائیوں کا سفر طے کر چکی تھی۔ مسلمان جہاں ناخواندگی اور کسمپرسی کا شکار تھے وہیں پر علم و ادب کی ترویج اور اردو زبان کی نشر و اشاعت کے لیے خصوصی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اس فکر نے اشفاق احمد کو بہت متاثر کیا تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی و ادبی ترقی کے لیے اشفاق احمد اردو زبان کو ضروری گردانتے تھے اور مذہب کو ایسی قوت قرار دیتے تھے جن کی بدولت مسلمانوں میں تبدیلی کا جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ علمی و ادبی حوالے سے دیکھا جائے تو اشفاق احمد خود درس گاہ میں رہے تھے تو ان کے افسانوں اور کرداروں میں علم و ادب اور تعلیم و تدریس کے شعبے سے وابستہ افراد کثرت سے نظر آئیں گے۔ پروفیسر، استاد، استانی، طالب علم، سکول، یونیورسٹی، ہیڈ ماسٹر وغیرہ اور اس کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے شوقین اور باذوق کردار بھی دکھائی دیں گے جن کے ہاتھ میں دیوان غالب، اردو انگریزی کے معروف ادیبوں کی کتب، ان کے اقوال، ادبی مباحث دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اشفاق احمد نے پہلا افسانہ "توبہ" کے نام سے لکھا تھا۔ "توبہ" افسانہ سگریٹ نوشی کی لت میں مبتلا نوجوان کا قصہ ہے جو ہر حربہ اور طریقہ آزمانے کے باوجود سگریٹ نوشی نہیں چھوڑتا ہے مگر اپنی محبوبہ لیکھا کے کہنے پر سگریٹ پینا چھوڑ دیتا ہے۔ نوجوان لیکھا کا تعارف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

میں لکھا سے بہت پہلے کا واقف ہوں۔ جب وہ آٹھویں جماعت میں تھی۔ نویں میں ہوئی، دسویں پاس کر لی اور جب وہ کالج میں داخل ہونے کے لیے روتی رہی۔^{۲۱}

لیکھا کا پڑھا لکھا ہونا اشفاق احمد کی نظر میں تعلیم نسواں کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس وقت جبکہ مدارس اور سکولوں کی تعداد بہت کم تھی۔ مالی وسائل اور مواصلاتی ذرائع کم تھے اور مشکلات زیادہ تھیں۔ پڑھنے پڑھانے کا رواج بہت کم تھا۔ جبکہ شرح خواندگی افسوسناک حد تک کم تھی۔ صرف شہری علاقوں میں پڑھنے لکھنے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ ان حالات میں اشفاق احمد کا ایک لڑکی کو پڑھے لکھے کردار کے طور پر پیش کرنا نہایت اہم ہے۔ اسی مرکزی کردار نے اپنے محبوب کو سگریٹ نوشی چھوڑنے پہ آمادہ اور مجبور کیا تھا۔ اس لحاظ سے ایک پڑھے لکھے فرد سے فائدہ اٹھانا اور اس کی اہمیت کو سامنے لانا اشفاق احمد کا خاصہ ہے۔ گو کہ "توبہ" افسانہ اصلاحی پہلو سے لکھا گیا تھا مگر اس میں مرکزی اور فیصلہ کن کردار لیکھا نامی پڑھی لکھی لڑکی کو دیا گیا تھا تاکہ خواتین میں تعلیم و تربیت کے رجحان کو فروغ دیا جاسکے اور عورتوں میں تعلیم کی قدر میں اضافہ کیا جاسکے۔ اسی بدولت عورتوں میں علم اور تعلیم کا شوق پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔ "رات بیت رہی ہے" افسانہ ایک امریکی ہوا باز پیٹر اور ایک ہندوستانی ہوا باز ارشد کی محاذ پر گزارے لمحات کی داستان ہے۔ پیٹر امریکی ہوا باز ہے جس کا والد کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ پیٹر اپنے ہندوستانی دوست ہوا باز سے ہر وقت اپنی محبوبہ مارگریٹ کا ذکر کرتا رہتا اور اس کی یاد میں وقت گزارتا۔ کبھی اس کی تصویر ارشد کو دکھا رہا ہوتا اور کبھی کوئی قصہ مارگریٹ سے منسوب کر کے سناتا۔ پیٹر مارگریٹ سے پہلی ملاقات کا ذکر ہمیشہ کیا کرتا اور یہ الفاظ دہراتا "پھر پرنسٹن یونیورسٹی کی ہلکی سی تمہید کے بعد وہ تیرنے کے اس تالاب کا ذکر ضرور کرتا جہاں پہلے پہل ان کی ملاقات ہوئی تھی۔"^{۲۲} اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ مارگریٹ سے پیٹر کی ملاقات پرنسٹن یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ دونوں یونیورسٹی فیلو تھے۔ دوسرا کردار ارشد اور رینا کا ہے۔ ارشد ہندوستانی ہوا باز ہے جو پیٹر کے ساتھ جنگی مشن پہ ایک بحری جہاز پر تعینات تھا۔ یہ افسانہ دوسری جنگ عظیم کے عرصے میں لکھا گیا ہے۔ ارشد نامی نوجوان محبوبہ کو خط لکھتے ہوئے بہت سی باتوں کو یاد کرتا ہے۔ جس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ایف اے کرنے کے بعد آوارہ گرد اور خود سر ہو گیا تھا تو اپنی محبوبہ رینا کے کہنے پر ہی بی اے میں داخلہ لیا تھا۔ جو کہ خود بی اے کر رہی تھی۔ ارشد کی والدہ نے جب رینا کی والدہ سے اپنے بیٹے کی شکایت کی کہ وہ ایف اے کے بعد پڑھنا نہیں چاہتا ہے تو رینا کی والدہ کے ساتھ رینا نے بھی یہ محسوس کیا کہ ارشد کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ چونکہ رینا ارشد سے محبت کرتی تھی اس لیے اس نے ارشد سے دو ٹوک انداز میں بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ارشد خط میں اس کا ذکر کچھ یوں کرتا ہے۔

تم نے مجھے اسی دن ڈیوڑھی میں روک کر کہا تھا "بی اے کا داخلہ ابھی بند نہیں ہوا۔ کسی کالج میں داخل کیوں نہیں ہو جاتے" تو میں نے کہا تھا "ہو جائیں گے۔ ایسی کون سی جلدی ہے۔ میرا دل

پڑھنے کو نہیں چاہتا۔ " لیکن میرا چاہتا ہے۔ " تم تو پڑھ رہی ہو " اپنے لیے نہیں، تمہارے لیے کہہ رہی ہوں۔۔۔۔۔ کم از کم بی اے تو کر لو۔ ۲۳

ارشاد اور رینا کے اس مکالمے سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں سکول کے بعد کالج کی سطح پر تعلیم حاصل کرنے کا سوچ رہے تھے بلکہ رینا تو پڑھ رہی تھی۔ اور وہ ارشد کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ بھی تعلیم حاصل کرے۔ اس افسانے کے دونوں مردانہ کردار پیٹر اور ارشد دونوں نسوانی کردار مارگریٹ اور رینا نہ صرف خود تعلیم یافتہ تھے بلکہ تعلیم کی اہمیت سے آگاہ بھی تھے۔ دونوں نے اپنی اپنی محبتوں کو فرمائش کر کے ہوائی فوج میں بھرتی ہونے پہ مجبور کیا تھا کیونکہ پائلٹ ان کو پسند تھے۔ ان دونوں پڑھی لکھی خواتین اور مردانہ کرداروں کی تعلیمی قابلیت سے اشفاق احمد کی سوچ جھلکتی ہے کہ ان کے ہاں تعلیم کی قدر و قیمت کیا تھی۔ وہ اپنے نوجوانوں کو کس روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کی طرف وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کے ذریعے رغبت دلانا چاہتے ہیں تاکہ یہ نوجوان نسل علم کے زیور اور ہتھیار سے آراستہ و پیراستہ ہو کر میدان عمل میں اترے اور کامیابیاں حاصل کرے۔

افسانہ "سنگ دل" تقسیم ہند کے بعد فسادات کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں دوران ہجرت اغوا شدہ اور گمشدہ لڑکیوں اور عورتوں کو تلاش کی جانے والی کوششوں کا ذکر ہے۔ ایک نوجوان کیپٹن کی تعیناتی انڈیا میں مشرقی پنجاب کے آبائی علاقے میں ہو جاتی ہے۔ اُسے وہاں کچھ دن قیام کرنا تھا۔ کھوجنے کے اس عمل میں وہ اپنے آبائی گھر اور پڑوسیوں سے ملتا ہے جہاں اس کی بچپن کی آشنا بچی بھی ہوتی ہے۔ بچی کے پتاجی اسے گھر پہ قیام پہ مجبور کرتے ہیں۔ یہ ان کے ہاں رہنے لگتا ہے اور بچپن کی شناسائی محبت میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ بچی کے جذبات بھی کچھ اسی طرح کے تھے۔ لیکن وہ براہ راست اظہار کی بجائے شعر و شاعری کا سہارا لیتی ہے اور اُس سے اشعار کا مطلب، مفہوم اور تشریح کرواتی رہتی ہے۔ جو اس نوجوان آفیسر کے جذبات کی تسکین اور بھڑکانے کے لیے کافی تھا۔ اشفاق احمد نے یہ کردار شعر و ادب کا گرویدہ اور باذوق قاری کی صورت میں تراشا ہے۔ بچی کے پتاجی کی الماری میں شاعروں کی کتابیں موجود تھیں جنہیں بچی اکثر پڑھا کرتی تھی۔ وہ شعر و ادب سے محفوظ ہونے والی لڑکی تھی۔ وہ شعر کہنے کی کوشش بھی کرتی ہے اور اس کی حسرت ہی رہتی ہے کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی بحر کی غزل ہی کہہ سکے۔ اس کے والد نے بچی کو ایف اے پاس کرنے پر ادبی تحفہ دیا تھا۔ وہ نوجوان کو بتاتی ہے۔

ایف اے میں تمہیں شاید معلوم نہ ہو، میں اردو میں اول آئی تھی۔ پتاجی نے مجھے جرمنی کا چھپا ہوا دیوان غالب انعام دیا۔ جب سوچتی ہوں تو اکثر روتی ہوں کہ ایف اے میں فرسٹ آکر بھی میں دیوان غالب سمجھ نہیں سکتی۔ ۲۴

پتاجی کی کتابوں کے مطالعے کی بدولت پٹی اردو میں فرسٹ پوزیشن حاصل کر لیتی ہے تو پتاجی اُسے دیوان غالب انعام میں دیتے ہیں۔ اس سے دو باتوں کا اظہار ہوتا ہے ایک تو یہ کہ اشفاق احمد کے ہاں تعلیم نسواں کا تصور کس قدر مضبوط اور توانا بنیادوں پر موجود ہے اور دوسرا یہ کہ پٹی کے پتاجی ایک باذوق اور ادب کے دلدادہ و قدر دان شخصیت کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ انھوں نے اس مادیت پرستی کے دور میں بھی اپنی بیٹی کی کامیابی پر غالب کا دیوان انعام میں دیا ہے نہ کہ کچھ اور۔ اشفاق احمد نے پٹی، اس کے پتاجی کو ہندو ہونے کے باوجود علم و ادب اور اردو دان طبقے کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا ہے کہ غالب جیسی ہستی ہندو مسلم دونوں کے ہاں مقبول اور معروف تھی۔ دونوں اقوام میں مذہب، نسل اور وطن کی تفریق کے باوجود غالب جیسی شخصیت کی قدر و منزلت موجود تھی۔ نوجوان آفیسر پٹی کے ساتھ گھر کے قریب لگے درخت کے پاس جاتا ہے اور اُسے بتاتا ہے کہ آٹھ سال قبل بچپن کے عرصے میں اُس نے ایک خط لکھ کر دیا تھا۔ وہ دونوں خط تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس دوران دلی کیفیات کا اظہار نوجوان شاعری کے ذریعے کرتا ہے۔ میرے دل و دماغ پر غالب کی وہ ساری غزل لکھی جا رہی تھی۔ وہ اپنی دلی کیفیات کو کچھ یوں بیان کرتا ہے۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے، جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے
ہوئے، دعوتِ مژگاں کیے ہوئے، چاک گریباں کیے ہوئے، تصورِ جاناں کیے
ہوئے، تہہ طوفاں کیے ہوئے۔^{۲۵}

نوجوان آفیسر پٹی کے ساتھ اور پٹی بھی اپنی گفتگو میں شعر و شاعری کو شامل کر کے اور ان اشعار کا سہارا لے کر جذبات ایک دوسرے تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ چونکہ وہ دونوں مذہب، زبان، نسل، قوم اور وطن کے حوالے سے الگ الگ تھے لہذا براہِ راست جذبات کی شدت کو بیان نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ اظہار اور ابلاغ کے دوسرے وسیلوں کا سہارا لیتے ہیں جس کے لیے شعر و ادب ایک بہترین طریقہ اور وسیلہ تھا۔

افسانہ "توتا کہانی" داستانوی طرز پر لکھی گئی ایک کہانی ہے جس میں خجستہ نامی لڑکی کی کلیم سے محبت کو داستانوی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار حامد ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے جو ہوٹل میں مقیم اپنے دوستوں کو یہ قصہ سنا رہا ہوتا ہے۔ جو اس کی ہمسائی خجستہ کے ساتھ محبت پر مبنی ہوتا ہے۔ اشفاق احمد کا یہ کردار بھی ادب کا دلدادہ ہے اور مغربی شعراء کے کلام کا ذوق رکھتا ہے۔ وہ اپنی ملاقات کا تذکرہ کچھ یوں کرتا ہے۔

خجستہ سے میری ملاقات بس یونہی سرسری سی تھی۔ میں اپنے کو ٹھہرے پر آنے کا اعلان شیلے کے
اشعار سے کیا کرتا اور وہ اپنی چھت پر آکر زور سے پکارتی "سارے کپڑے اتار لاؤں، امی" اور
ہماری ملاقات ہو جاتی۔^{۲۶}

کلیم کا چھت پہ آکر شیلے کے اشعار سنانا اس بات کا غماز ہے کہ اشفاق احمد کے ہاں کرداروں کا معیار کیا ہے؟ اشفاق احمد کے کرداروں میں شعر و ادب کی جھلک تو دکھائی دیتی تھی مگر یہاں مغربی شعراء اور ادیبوں کا حوالہ دینا ثابت کرتا ہے کہ اشفاق احمد کی سوچ اور ان کے ہاں کرداروں میں وسعت کس حد تک ہے۔ پھر نجستہ کی پھوپھی حیدر آباد سے آتی ہیں اور لاہور میں مقبرہ جہانگیر دیکھنے کا پروگرام بنتا ہے تو کلیم وقت سے پہلے پہنچ جاتا ہے تاکہ نجستہ سے ملاقات ہو سکے۔ نجستہ اور کلیم کی ملاقات میں نجستہ کلیم سے گلہ کرتی ہے کہ تمہارا خیال اور وہم میرا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا اور ہر جگہ میرے ساتھ رہتا تھا۔ وہ کمرہ امتحان کے حوالے سے اُسے بتاتی ہے۔

ایک مرتبہ جب کمرہ امتحان میں سوال حل کر رہی تھی تو تم نے اچانک آن کر مجھے گدگدایا تھا اور میں نے جل کر کہا تھا۔ تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ یہاں نہ آؤں گا، لیکن اب میرا وقت خراب کرنے یہاں بھی پہنچ گئے ہو؟^{۲۷}

نجستہ کا کمرہ امتحان میں بھی کلیم نے خیال آ جانے کا گلہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ محبت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کا محبت کسی بھی جگہ پیچھا نہیں چھوڑتی حالانکہ یہ ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں طلبہ و طالبات کو صرف اور صرف امتحان کی فکر ہوتی ہیں۔ مگر یہاں پر بھی کلیم کا خیال نجستہ کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ یہ باتیں اشفاق احمد کے ہاں تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کی موجودگی کی طرف اشارہ کرنے کو کافی ہیں۔ افسانہ "بندرا بن کی کُنج گلی" میں "سجاول مچھیرے کے بیٹے نمدار اور کلثوم کی محبت پر مشتمل ہے۔ نمدار اچھیروں کی بستی میں رہنے والا لڑکا تھا کہ اسے پڑھنے کا شوق چڑایا اور پڑھ لکھ گیا۔ ایف اے اور بی اے میں وظیفہ حاصل کیا۔ اس سارے افسانے میں پرنسپل صاحب، کالج، پروفیسر، آنرز کی کلاس، لائبریری، کینیٹین، کلاس روم، لیکچر، کتاب کے ساتھ ساتھ اقتصادیات، معاشیات، انگریزی ادب کے کرداروں شیکسپیر، ہارڈی اور کیٹس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی نسوانی کردار کلثوم ایک سیٹھ کی بیٹی تھی۔ گھر میں مادیت پرستی عروج پر تھی اور وہ کالج میں علم و ادب کے خزانوں کو جمع کر رہی تھی۔ اس افسانے میں نمدار کے پاس کلثوم کی نشانی لائبریری سے حاصل کی گئی کتاب پہ دیا گیا بوسہ ہی ہوتی ہے۔ جس کے لیے وہ بار بار اس کتاب کے لیے لائبریری جاتا رہتا ہے۔ کلثوم تو پڑھائی کو جاری نہ رکھ سکی مگر نمدار ابی اے آنرز کی فرسٹ کلاس ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کے کرداروں کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اشفاق احمد کے ہاں پڑھے لکھے کردار کثرت سے ملتے ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا تعلیم اور علم و ادب ہی ہوتا ہے۔ اس کی زندہ مثالیں نمدار اور کلثوم ہیں۔ جن کی ساری کہانی یونیورسٹی، کالج، لائبریری، امتحان، کتاب اور لیکچر کے گرد گھومتی ہے۔ افسانہ "بابا" میں مرکزی کردار وحید اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جاتا ہے اور کلاس فیلو ایلن سے شادی کر کے واپس لوٹتا ہے۔ افسانہ "امی" میں دیدی کا کردار پڑھی لکھی

لڑکی کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے جبکہ مسعود اور گلریز بچپن کے کلاس فیلو اور امی ریٹائر اسٹانی ہیں۔ "پناہیں" افسانہ میں ڈاکٹر ہجرت کے بعد اپنے آپ کو استاد اور معلم کے طور پر پیش کر دیتا ہے۔ جس عمارت میں ایک معلم چند بچوں کو پڑھانے پہ مامور ہوتا ہے۔

افسانہ "گڈریا" اشفاق احمد کا مشہور افسانہ ہے جس کا کردار داؤجی اردو افسانے کے مشہور کرداروں میں سے ایک ہے۔ یہ بنیادی طور پہ گڈریا اور بھیڑیں بکریاں چراناس کا پیشہ تھا۔ گاؤں کے حضرت اسماعیل چشتیؒ ایک بزرگ گاؤں کے بچوں کو رضاکارانہ طور پر بے لوث پڑھایا کرتے تھے۔ انھوں نے چنتو گڈریے کو منشی چنت رام بنادیا۔ منشی اس دور میں استاد کو کہتے تھے۔ یعنی مشہور زمانہ افسانے کا مرکزی کردار بھی معلم تھا۔ منشی چنت رام جب تک سرکاری سکول میں مدرس رہے تو تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے بھی استاد گرامی کے سلسلہ کو آگے بڑھایا اور ذاتی شوق اور شغف کی بنا پر بچوں کو پڑھانے لگے۔ گولوان کا شاگرد تھا جس کے گرد یہ ساری کہانی گھومتی ہے۔ یہ ایک اچھوتا موضوع تھا۔ یہ اصلاحی مقصد کو لیے مذہبی ہم آہنگی اور رواداری کے درس پہ مبنی افسانہ ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

اشفاق احمد زندگی کے اندھیرے سے چھوٹے چھوٹے جگنو چختے اور پھر ان سے پورے مطمع کو

روشن کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔ اشفاق احمد نے افسانے کو سماجی تنقید کا وسیلہ بنانے کے

بجائے اس سے مجموعی طور پر نیکی اور خیر کی فضا تعمیر کرنے کا کام لیا ہے۔^{۲۸}

اس افسانے میں بھی مجموعی طور پر نیکی اور خیر کی فضا نظر آتی ہے۔ یہاں استاد اور شاگرد ادب و احترام کی بجائے عقیدت و ارادت کے رشتے میں پروئے ہوئے ہیں۔ استاد اور شاگرد میں تعلق بے مثال اور قابل دید ہے۔ چاہے وہ حضرت اسماعیل چشتیؒ اور چنت رام کا ہو یا داؤجی اور گولو کا ہو۔ وہ لوگ مذہب کی تفریق اور تعصب کے بغیر سرِ پامحبت اور ایثار نظر آتے ہیں۔ داؤجی ایک ماہر استاد کی طرح گولو کو امتحان کی تیاری کراتے ہیں۔ کبھی صر فی نحوی تراکیب پوچھی جارہی ہیں تو کبھی مادی اور غیر مادی اشیاء کا علم طبعیات کی رُو سے جائزہ لیا جا رہا ہے۔ کبھی نہری و آب پاشی نظام اور جغرافیائی خدو خال سمجھائے جارہے ہیں تو کبھی علم ہندسہ، علم ریاضی اور حساب کے مشکل سے مشکل مسئلوں کی گتھیاں سلجھائی جارہی ہیں۔ الغرض داؤجی ایک ایسے استاد کے طور پر سامنے آتے ہیں جن کو ہر مضمون پر عبور ہے اور دوسرے تدریس کے اصولوں پر بھی عمل پیرا ہوتے ہیں مثلاً آسان سے مشکل کی طرف، معلوم سے نامعلوم کی طرف اور مثالوں سے تصور پنختہ کرنا اور قصے کہانی کے ذریعے بوریت سے بچانا وغیرہ ایسے تصورات اور طریقہ ہائے تدریس تھے کہ گولو جیسا بچہ بھی چند ماہ کی تیاری کے بعد میٹرک کر جاتا ہے۔ افسانہ "گل ٹریا" کتے کی تلاش اور اُس سے جڑے واقعات پر مبنی ہے۔ ننھا اپنے بھیا کے ساتھ

اپنے کتے گل ٹریا کو تلاش کرتا ہے جو ان سے کھو جاتا ہے۔ گل ٹریا چچا امان نے بذریعہ ریل کو ہاٹ سے بھجوا یا تھا مگر بھیا سے کھو جاتا ہے۔ یہ دونوں بھائی کتے کی تلاش کا عمل شروع کر دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل ننھا بچہ یوں بتاتا ہے۔

اگلے دن سے ٹی ٹی کی باقاعدہ تلاش شروع ہو گئی۔ صبح سکول پہنچتے ہی ہم دونوں بھائی اپنے اپنے بستے ڈسک فیلو کے سپرد کر دیتے اور ٹی ٹی کی تلاش میں نکل جاتے۔^{۲۹}

یہاں سکول جانے والے دو طلبہ کا طریقہ واردات اشفاق احمد سامنے لاتے ہیں کہ جب وہ گھر سے پڑھنے سکول جاتے تھے تو سکول پہنچنے کے بعد اصل ہدف کی جانب روانہ ہو جاتے اور سارا دن ٹی ٹی کی تلاش میں گزار دیتے۔ اس افسانے میں بھی سکول کا تذکرہ ملتا ہے۔ صفدر ٹھیلا ایک کردار کا نام ہے جو کہ ہائی سکول میں پڑھتا ہے اور پچھلے کئی سالوں سے میٹرک میں بار بار فیل ہو رہا ہے۔ یہ افسانہ اسی کے نام پر ہے۔ یہ سکول کے طلبہ کی شرارتوں اور قصے کہانیوں پر مشتمل افسانہ ہے۔ اس میں صفدر ٹھیلا کے علاوہ ہیڈ ماسٹر پنڈت امر ناتھ جی اور عربی و اسلامیات کے استاد مولوی ابوالحسن بھی اہم کردار ہیں۔ یہ ساری کہانی ایک سکول میں درپیش آنے والے واقعات پر مبنی ہے۔ اس میں اشفاق احمد طلبہ کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف واقعات اور شرارتیں بیان کرتے ہیں۔ طلبہ کی فطرت، اساتذہ سے رویہ، دوستوں سے لڑائی جھگڑے، سکول میں کھیل کود کے مقابلے وغیرہ کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس طرح اس افسانے میں بھی اشفاق احمد درس و تدریس سے وابستہ لوگوں کو شریک کرتے ہیں جو کہ ان کی دلچسپی کا خاص علاقہ ہے۔ "اجلے پھول" افسانہ آپنی اور انجم بھائی کی ادھوری محبت کی کہانی ہے جو انجم بھائی کی المناک موت کی بدولت ادھوری رہ جاتی ہے۔ انجم بھائی ایک سائز محکمہ سے انسپکٹر کی نوکری چھوڑ کر آرمی میں کمیشن لے کر برما کے محاذ پر چلا جاتا ہے۔ آپنی میڈیکل کی طالبہ ہے جو گریجویشن کے بعد تعلیم کے سلسلہ کو جاری نہیں رکھنا چاہتی۔ شعر و ادب کی دلدادہ ہے اور گھر میں وقت گزار رہی ہوتی ہے۔ ان کی والدہ آلا جی یونیورسٹی کی گریجویٹ ہیں۔ یہ سارا گھرانہ علمی ہے اور شعر و ادب سے لگاؤ کی وجہ سے گھر میں مجلس اہل قلم کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ جس میں گھر کے سارے لوگ روزانہ شام کو صحن میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہر کوئی اپنا فن پارہ تنقید اور جائزے کے لیے پیش کیا کرتا۔ اس مجلس کا ماجر کچھ یوں ہے۔

انجم بھائی کی رائے سے گھر میں "مجلس اہل قلم" کی بنیاد رکھ دی گئی۔ سیکرٹری شپ کا قرضہ میرے نام پڑا اور کارروائی لکھنے کے لیے ایک خوبصورت سی کاپی میرے حوالے کر دی گئی۔ سب سے پہلی مجلس کی صدارت آلا جی نے کی۔ آپنی نے ایک افسانہ "زندانی تقدیر" پڑھا۔ جس پر بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ "انجم بھائی اقبال کے اشعار پڑھ کر یہ ثابت کر رہے تھے کہ انسان زندانی تقدیر نہیں بلکہ تقدیر یزداں ہے"۔^{۳۰}

اسی طرح دیگر اصناف پر بھی بحث مباحثہ اس افسانے کا اہم حصہ ہے۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں علم و ادب اور حکمت و دانش کے مباحث عموماً دکھائی دیتے ہیں۔ اس افسانے میں تو باقاعدہ طور پر کچھ پیش کر کے ادیبوں کے رنگ میں بحث کی جاتی اور اجلاس کارروائی لکھی جاتی تھی۔ یہ تمام رجحانات اشفاق احمد کے افسانوں میں کرداروں کے ذریعے اکثر اوقات دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی، فارسی اور انگریزی ادیبوں اور ان کی تخلیقات کے حوالے اس افسانے میں اکثر ملتے ہیں۔ "برکھا" افسانہ امینہ اور ثریانامی دو لڑکیوں کی کہانی ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں میٹرک کے امتحانات کے بعد فراغت کا عرصہ گھر پہ گزار رہی ہیں۔ اس عمر کے جو خیالات اور خواہشیں کسی نوجوان لڑکی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ان کی منظر کشی اشفاق احمد نے کی ہے۔ اس افسانے میں بھی بار بار امینہ کے امتحانات، کتابیں، رسالے، ڈائجسٹ، میگزین وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ لطیف صاحب کا بھانجا بھی ادب پسند لڑکے کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو ہر وقت کتابوں کے ڈھیر لگائے رکھتا ہے اور لکھتا لکھتا رہتا ہے۔ الغرض یہ افسانہ بھی علمی رنگ لیے ہوئے ہے۔

"ایل ویر" افسانہ پروفیسر کے اٹلی قیام کے واقعات پر مبنی ہے۔ جہاں اُسے ایل ویر انامی طوائف سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایل ویر پروفیسر کے اخلاق اور اصولوں سے متاثر ہو کر محبت کرنے لگتی ہے جبکہ پروفیسر اُس سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ پروفیسر کی ملاقات ریکٹر نے یونیورسٹی کی سالانہ تقریب میں ستالی نواب خاندان سے ملاقات کرائی۔ جن کی لڑکیوں میں ایک لڑکی ادب کی دلدادہ تھی۔ وہ پروفیسر کو محل بلا لیتی ہے اور دونوں میں ذہنی ہم آہنگی تحائف کے تبادلے کے بعد محبت و الفت میں بدل جاتی ہے۔ وہ پاکستانی پروفیسر کو کے۔ ٹو کی پہاڑی سے متعلق بتاتی ہے اور اس سے ادبی و علمی مسائل پر گفتگو کرتی ہے۔ ایک دن نواب خاندان کی لڑکی ریسمنا سنورینا مارسیا سے محل میں بلا کر ادبی مسائل اور مباحث پر گفتگو کرتی ہے اور پوچھتی ہے۔

آپ کے ادب کے کون کون سے مسائل ہیں؟ میں نے عرض کیا ہمارے ادب کے چند

تمدنی مسائل ہیں اور چند جدلیاتی۔ میرے جواب سے وہ بہت متاثر ہوئیں۔^{۳۱}

اسی طرح ایک دفعہ وہ پروفیسر سے لسانیاتی پہلو سے استفسار کرتی ہے۔ پروفیسر اس کی قربت کے لیے اور دل میں مقام بنانے کے لیے ہمیشہ مشکل گفتگو کا سہارا لیتا ہے تاکہ اس کو زیادہ سے زیادہ متاثر کر سکے اور اس پر علمی رعب داب ڈال سکے۔ لسانی مسائل پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر اس کو بتاتا ہے۔

ہمارا ادب صوتی اعتبار سے دنیا کا ایک ہی ادب ہے۔ ہماری زبان میں کوئی بھی لفظ ایسا نہیں جو

صوتی اعتبار سے اسم کی ترجمانی نہ کرتا ہو مثلاً ہاتھی لیجئے۔ تھپکارنے کے لیے جب زبان کی

نوک اوپر کے تالو سے لگتی ہے تو ایک قسم کی گھمبیرتا، ایک قسم کی ہیبت اور ایک طرح کے خوف کا احساس ہوتا ہے۔ دیکھیے ہاتھی!! ایلی فانتے میں وہ بات نہیں۔^{۳۲}

اس طرح پروفیسر اس غیر ملکی خاندان کی عورتوں کو متاثر کرنے کے لیے مشکل مشکل الفاظ اور ان کے متبادل ڈھونڈ کر لے جاتا۔ انھیں اپنے ملک اور باشندوں کے بارے میں بتاتا تو وہ بہت متاثر ہوتیں۔ یہ انھیں موجوڈاڑو کے قصے سناتا اور اپنے آباؤ اجداد کو سندھ کے حکمرانوں میں سے ظاہر کرتا۔ اس افسانے میں اشفاق احمد کے کردار خالصتاً ادبی نوعیت کے ہیں جبکہ پروفیسر خود ایک یونیورسٹی کے شعبہ شریقات میں اردو زبان کا استاد ہے۔ یہ تمام کردار خالصتاً ادبی نوعیت کے مکالمے ادا کرتے ہیں۔ جو کہ علم و ادب سے اشفاق احمد کے گہرے لگاؤ کی نشانی ہے کہ وہ علم و ادب اور تعلیم و تدریس کو ایک ایسی قوت اور طاقت ضرور سمجھتے تھے جو کہ کسی بھی معاشرے میں باوقار اور مثبت تبدیلی لانے کا باعث بن سکتی ہے۔ اشفاق احمد اسی نقطہ نظر سے اپنے افسانوں میں موضوع اور فن کے حوالے سے علم و ادب سے وابستہ افراد کو شامل کرتے ہیں۔ یہ تمام کردار جہاں اشفاق احمد کے افسانوں میں حقیقی رنگ بھرتے ہیں۔ وہیں پر اشفاق احمد کے لیے آسانی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا پیغام سہولت کے ساتھ قارئین تک پہنچا سکتے ہیں۔ جہاں یہ چیز اشفاق احمد کو دیگر افسانہ نگاروں سے منفرد اور ممتاز مقام دلوانے کا باعث ہے۔ وہیں یہ تمام تر غیر فطری بھی معلوم نہیں ہوتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اشفاق احمد کے ہاں محبت، مذہب اور علم و ادب ایک نئے، منفرد اور وسیع تر مفہوم میں نظر آتے ہیں انہوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی مدد سے محبت کے مفہوم کو وسعت دی ہے اور اس جذبے کو محض دو جسموں یا مادیت کے حصول کی بجائے کل انسانیت سے محبت اور ملانے والا جذبہ قرار دیا ہے۔ انہوں نے معاشرتی مسائل اور دکھوں کے مداوا کے لیے محبت کو ایک ایسا جذبہ بتایا ہے جو مشکل سے مشکل حالات میں بھی انسان کو جینے کی امنگ دیتا ہے اور اس میں امید کا دیا جلانے کا باعث بنتا ہے کبھی بھی مایوس، افسردہ اور پریشان نہیں رہنے دیتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ اشفاق احمد اخلاقی برائیوں، سماجی مسائل اور دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے محبت جیسے جذبے کو بروئے کار لاتے ہیں وہ اس کو ایک ایسے روپ میں پیش کرتے ہیں کہ وہ انسانوں میں مثبت تبدیلی لانے کا محرک اور باعث بن جاتا ہے۔ وہ نہ صرف انسانوں بلکہ دیگر مخلوقات سے بھی محبت، رحمدلی کا درس دیتے ہیں اسی طرح محبت کو ایثار و قربانی کے لیے تحریک دینے والا جذبہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ”گل ٹریا“، ”ملاش“، ”سنگ دل“، ”ہنکھ“، ”بابا“ اور ”ایل ویرا“ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

مذہب کے حوالے سے اشفاق احمد کے ہاں ایک خاص تصور دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ مذہب کو امن و آشتی، اتفاق و اتحاد اور ہم آہنگی کی علامت قرار دیتے ہیں۔ معاشرے میں شر پسند عناصر کے عدم پھیلاؤ کے لیے مذہب کی

تعلیمات پر اصل روح کے مطابق عمل کرنا بہت ضروری ہے۔ تمام مذاہب، الہامی ہوں یا غیر الہامی، ان کا مقصد انسانیت کی فلاح اور کامیابی رہا ہے۔ مذاہب کی تعلیمات امن و سکون کی زندگی گزارنے کی تلقین کرتی ہیں۔ مذہب کے نام پر انتشار اور فساد صرف اس کی غلط تشریح کے سبب دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی پیغام کا پرچار وہ اپنے افسانوں میں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اشفاق احمد کے کردار بلا تفریق مذہب امن و سلامتی، روداری، قربانی و ایثار کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ”رات بیت رہی ہے“ میں پیٹر اور مارگریٹ، ”بابا“ میں ایلن، ”سنگ دل“ میں پچی، ”ایل ویرا“ میں ایل ویرا اور ”گڈ ریا“ میں داؤجی اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ الغرض اشفاق احمد کے ہاں یہ تصورات نئے روپ میں دیکھنے کو ملتے ہیں جنہیں قارئین اور ناقدین نے بہت سراہا ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ ڈاکٹر محمد عالم خان، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، علم و عرفان پبلشرز لاہور ۱۹۹۸ء ص ۷۵
- ۲۔ ڈاکٹر طاہر طیب، لاہور میں اردو افسانے کی روایت، مثال پبلشرز فیصل آباد ۲۰۱۵ء ص ۲۴۸
- ۳۔ ایضاً، ص ۲۴۸
- ۴۔ سید وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ص ۳۸۱
- ۵۔ اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء ص ۶۴
- ۶۔ ڈاکٹر طاہر طیب، لاہور میں اردو افسانے کی روایت، مثال پبلشرز فیصل آباد ۲۰۱۵ء ص ۲۴۸
- ۷۔ ڈاکٹر انور سدید، اشفاق احمد مجسم لطافتوں کا افسانہ نگار، مشمولہ اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۱ء ص ۱۳۹
- ۸۔ اشفاق احمد، سائنس، مذہب اور کھوج مشمولہ زاویہ ۳ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ء ص ۲۳۶
- ۹۔ عطا الحق قاسمی، بلبل ہزار داستان مشمولہ ماہنامہ ادب لطیف اشفاق نمبر جلد ۷۰ شمارہ نمبر ۵ لاہور مئی ۲۰۰۵ء ص ۴۰۱
- ۱۰۔ اشفاق احمد، اجلے پھول، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ء ص ۱۹
- ۱۱۔ ڈاکٹر محمد اجمل نیازی، داستان سرائے کا مسافر۔۔۔ اشفاق احمد، مشمولہ ماہنامہ ادب لطیف اشفاق نمبر جلد ۷۰ شمارہ نمبر ۵ لاہور مئی ۲۰۰۵ء ص ۴۱۱
- ۱۲۔ اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ ۲۰۱۰ء ص ۱۹
- ۱۳۔ ایضاً، ص ۳۰
- ۱۴۔ ایضاً، ص ۳۱
- ۱۵۔ ایضاً، ص ۴۸
- ۱۶۔ ایضاً، ص ۸۱
- ۱۷۔ ایضاً، ص ۱۳۵
- ۱۸۔ علی سفیان آفاقی، مضمون "نماز کی قضا ہے لیکن خدمت کی قضا نہیں ہے" مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے۔ مرتب محمد نواز کھرل، زاویہ پبلشرز دربار مارکیٹ لاہور ۲۰۱۳ء ص ۱۶۱
- ۱۹۔ ممتاز مفتی، "اور اوکھے لوگ" فیصل ناشران لاہور ۲۰۰۸ء ص ۱۰۱
- ۲۰۔ اشفاق احمد، اجلے پھول سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ء ص ۲۶
- ۲۱۔ اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ ۲۰۱۰ء ص ۱۰

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۰

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۲

۲۴۔ ایضاً، ص ۵۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۹

۲۶۔ ایضاً، ص ۹۹

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۲۸۔ ڈاکٹر انور سدید، اشفاق احمد مجسم لطافتوں کا افسانہ نگار، مشمولہ اردو افسانے کی کروٹیں مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۱ء ص

۱۳۹

۲۹۔ اشفاق احمد، اگلے پھول سنگ میل پہلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ء ص ۵۶

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۵۳

باب پنجم

مجموعی جائزہ

اشفاق احمد ہمہ جہت شخصیت تھے۔ بطور ادیب، ڈرامہ نگار، ناول نگار، دانشور، ریڈیو، ٹی وی کے صداکار کے طور پر دنیائے ادب کا معروف نام ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کا شمار اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اشفاق احمد کے چھ افسانوی مجموعے منظر عام پہ آئے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "ایک محبت سو افسانے" اور دوسرا مجموعہ "اُجلے پھول" کے نام سے شائع ہوا۔ اشفاق احمد کے افسانوں کے کردار فکری و فنی دونوں حوالوں سے بہت اہم ہیں۔ کسی بھی افسانے میں پلاٹ، مکالمے، واقعات، منظر نگاری کے ساتھ ساتھ کردار بھی افسانے کے اجزاء میں اہم مقام کے حامل ہوتے ہیں۔ اشفاق احمد کے کردار نہ صرف یہ کہ اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں بلکہ یہ کرداروں کو اس طرح تراش خراش کر کے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ وہ افسانے کی جان اور اس کی پہچان بن جاتے ہیں۔ ہر افسانہ نگار کو کردار نگاری میں مہارت نہیں حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ کردار نگاری کے فن میں ماہر وہ شخص ہو سکتا ہے جس کا مشاہدہ گہرا ہو اور وہ خود تجربہ کار ہو۔ جو زمانے کے حادثات سے گذرا ہو اور وہ ان کو قریب سے ضرور دیکھا ہو۔ ایسا شخص جب کردار تراشے گا یا کوئی پیکر پیش کرے گا تو منفرد اور بے مثال و لا جواب کردار سامنے لائے گا۔ ذاتی تجربے اور گہرے مشاہدے کے بغیر کرداروں کی بجائے محض کٹھ پتلی تو پیش کی جاسکتی ہے مگر حقیقی انداز میں کردار نہیں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ کرداروں کی پیشکش کو افسانوی ادب میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔

اردو کی نثری اصناف میں کردار کے حوالے دیکھا جائے تو کسی بھی داستان، ناول، افسانہ یا ڈرامہ میں کہانی، منظر اور مکالموں کے ساتھ ساتھ کردار نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ لفظ کردار انگریزی زبان کے لفظ کیریکٹر سے اردو زبان میں آیا ہے جو کہ سیرت، سراپا، خدو خال، شخص کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ صفت کی بجائے اسم فاعل کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ لغوی معنی سے ہٹ کر ادب میں یہ بطور اصطلاح استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی کہانی میں چلتا پھرتا ہوا دکھائی دینے والا۔ فن افسانہ نگاری میں بالخصوص اس کو نہایت احتیاط اور مہارت سے کام میں لایا جاتا ہے۔ کیونکہ افسانہ نگار کہانی کو واقعات اور کرداروں کے ذریعے ہی آگے بڑھاتا ہوا انجام پذیر کرتا ہے۔ اور واقعات کی تشکیل بھی کرداروں کے ذریعے ہی ممکن ہوتی ہے اس لیے کردار نگاری کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ناول اور داستان طویل کہانی پر مشتمل ہوتے ہیں جبکہ افسانہ مختصر کہانی کا نام ہے اور وہ بھی کسی ایک واقعہ یا ایک پہلو کو لیے ہوتا ہے اس لیے افسانہ نگار کے لیے کردار نگاری اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس نے اس مختصر سے واقعے کے ایک پہلو کو اس فنی مہارت سے قارئین

کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے کہ وہ متاثر بھی ہوں اور یکسانیت اور یوریت بھی محسوس نہ کریں۔ اس لیے کرداروں کی بہت سی اقسام کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کردار موضوع، ہیئت، تکنیک، اثر پذیری اور مزاج کے اعتبار سے کئی اقسام کے ہوتے ہیں۔ جنس اور صنف کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مردانہ اور نسوانی کردار سامنے آتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو جوڑوں کی صورت میں پیدا کیا ہے اور کردار بھی حقیقی زندگی سے ہی لیے جاتے ہیں اس لیے ان میں ہر دو جنس کے کردار افسانوں میں شامل ہوتے ہیں۔ مردانہ کردار جہاں مردانہ خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ وہیں عورتوں کے مسائل، مجبوریوں، رویوں اور نفسیات کو سامنے لانے کے لیے نسوانی کردار بھی افسانوں کا حصہ بنائے جاتے ہیں۔

فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو مرکزی اور ضمنی کردار کی دو بڑی اقسام سامنے آتی ہیں۔ کسی افسانے کے مرکزی کردار سے مراد وہ کردار ہے جس کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے۔ یہ کردار شروع سے انجام تک افسانے کا حصہ ہوتا ہے۔ اس کردار میں عمومی طور پر کئی خوبیاں، صفات اور خصوصیات شامل کی جاتی ہیں تاکہ یہ رعب دار سی صورت اختیار کر سکے۔ اس کے ذریعے ہی کوئی افسانہ نگار افسانے کا بنیادی مقصد حاصل کرتا ہے۔ مرکزی کردار جتنا جاندار اور توانا صورت میں پیش کیا جائے گا۔ افسانہ بھی اتنا ہی لاجواب اور جاندار ہو گا۔ اس لیے مرکزی کردار تراشنے پر بہت محنت اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ضمنی اور ذیلی کردار بھی مرکزی کردار کے معاون کی صورت میں افسانے میں موجود ہوتے ہیں۔ کسی بھی کہانی کی جزئیات اور تفصیلات کو سامنے لانے کے لیے مرکزی کردار کے ساتھ ضمنی کردار بھی افسانے میں شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ موقع محل کی مناسبت سے کہانی میں منظر عام پر آتے ہیں اور اپنے حصے کا کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ کسی بھی تصویر کا دوسرا اور مکمل رخ دیکھنے کے لیے ضمنی کرداروں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ تکنیکی لحاظ سے دیکھا جائے تو سپاٹ کردار، اکھرے کردار، مرکب کردار، مجہول کردار، اصلی اور نقلی کردار جیسی اقسام سامنے آتی ہیں۔ سپاٹ کردار ایسے کردار ہوتے ہیں جو شروع سے آخر تک ایک جیسے رویے کے حامل ہوتے ہیں۔ ان سے ایک جیسے افعال اور رد عمل کی توقع کی جاتی ہے۔ اکھرے کردار ایسے کردار ہوتے ہیں جن پر صرف ایک ہی قسم کے طرز عمل یا رویے کی گہری چھاپ نمایاں ہو۔ ان کی زندگی کا صرف ایک ہی پہلو سامنے لایا جاتا ہے۔ جبکہ مرکب کردار ایسا کردار ہوتا ہے جو ایک سے زائد رویوں کا حامل ہوتا ہے۔ ایسے کردار میں دو متضاد صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کی شخصیت میں پائے جانے والے تضاد کو کئی واقعات میں اصلیت سامنے لانے کے لیے شامل کیا جاتا ہے۔ تاکہ کسی خاص صورت حال میں مرضی کے نتائج حاصل کیے جا سکیں۔ مجہول کردار ایسے کردار ہوتے ہیں جن کے اعمال و افعال میں جھول پایا جاتا ہے۔ یہ کمزور طرز عمل کے حامل ہوتے ہیں اور ایسے کردار کسی مقصد کو پانے اور تکمیل تک پہنچانے کے دوران ہی ختم ہو جاتے ہیں تو ایسے کردار مجہول کردار کہلاتے ہیں۔

اصلی اور نقلی کردار بھی فنی اور تکنیکی لحاظ سے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اصلی کردار ایسے کردار ہوتے ہیں جن پہ حقیقی اور اصلی ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ بالکل معاشرے اور زندگی کا جیتا جاگتا اور اصلی کردار، جو عادات و خصائل، اطوار، گفتگو، انداز اور طرز عمل سے زندگی کا حصہ محسوس ہو۔ ایسا کردار اصلی اور حقیقی کردار کہلائے جانے کا مستحق ہوتا ہے۔

اخلاقی و اصلاحی کردار، رومانوی و تخیلی کردار، جنسی و نفسیاتی کردار، باغی کردار دیگر اقسام میں شامل ہیں۔ ادیب اسی معاشرے کا حصہ ہوتا ہے اور ارد گرد و نما ہونے والے حالات و واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا اور حالات کے تناظر میں اخلاقی پیغام دینے کے لیے اور اصلاح کی غرض سے کچھ کردار تراشتا ہے۔ جن کی عادات و اطوار، گفتگو اور انداز بطور خاص اس طرح پیش کیا جاتا ہے تاکہ مطلوبہ مقاصد حاصل کیے جاسکیں۔ اردو افسانے نے ناول کی کوکھ سے جنم لیا اور ناول پہ داستان کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے اس لیے افسانے پہ داستان کے اثرات مرتب ہونا فطری امر تھا۔ داستان گو اپنی تخیلاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پہ کردار نگاری کیا کرتے تھے اسی طرح تخیلی کردار بھی بعض دفعہ شامل کیے جاتے ہیں۔ تخیلی کردار عام طور پہ جذباتیت کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ صرف حسن و عشق کو ہی مکمل زندگی سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ جنسی و نفسیاتی کرداروں کے ذریعے نفسیاتی پیچیدگیوں اور ذہنی کشمکش کو بیان کیا جاتا ہے۔

جس طرح انسانی زندگی میں تنوع اور رنگارنگی پائی جاتی ہے اسی طرح اشفاق احمد کے افسانوں کے کرداروں میں بھی رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ اشفاق احمد کے کردار یک رنگی کا شکار نہیں ہوتے ہیں۔ ویسے تو بہت سے افسانہ نگاروں کے ہاں موضوعات کی یکسانیت کے باعث ان کے کردار اکہرے پن کا شکار دکھائی دیتے ہیں اور بعض لکھاریوں کے لیے کچھ الفاظ یا کردار شناخت کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ایسے ادیب اپنے مخصوص حصار سے باہر نہیں نکلتے ہیں تاہم اشفاق احمد کے حوالے سے ایسی بات نہیں کہی جاسکتی ہے۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں نرم و نازک احساسات اور مظاہر فطرت کثرت سے ملتے ہیں۔ اشفاق احمد کی کردار نگاری میں فنی پختگی کا ثبوت ان کے اپنے کرداروں سے اظہار لا تعلقی ہے۔ گو کہ اشفاق احمد کی افسانہ نگاری کا اہم پہلو اور مقصد اصلاح ہے لیکن وہ معاشرے اور سماج کو بدلنے کی خواہش نہیں کرتے ہیں۔ ان کو معاشرتی نا انصافی اور عدم مساوات کے شکار انسانوں سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہے۔ انھیں عورتوں کی مظلومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ سیاست دانوں، سرمایہ داروں اور بالادست طبقات سے دشمنی مول لیتے ہیں بلکہ یہ جس حالت میں بھی معاشرے میں پائے جاتے ہیں، اشفاق احمد انھیں اُسی طرح پیش کر دیتے ہیں۔ یہی ان کے افسانوں کے کرداروں کی خوبی ہے۔ کیونکہ کسی لکھاری کی جذباتی وابستگی یا اظہار ہمدردی کرداروں کو کٹھ پتلی بنادیتی ہے۔ اشفاق احمد کرداروں کے معاملے میں نہ تو جذباتیت کا شکار ہوتے ہیں اور نہ ہی ان سے ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ معاشرتی ناہمواریوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نہ ہی کرداروں کی کمی کجی کا مذاق اڑاتے ہیں اور نہ ہی اپنے کرداروں کو مثالی اور ہیر و کے طور پہ پیش کرتے ہیں کہ جو ہر عیب اور برائی سے پاک ہوں۔ ان کے کردار

فطری انداز میں دکھائی دیتے ہیں کیونکہ فطرت اور جبلت کو بدلنا آسان کام نہیں ہے بلکہ قریب قریب ناممکن سی بات لگتی ہے۔ اس لیے ان کے کردار اسی معاشرے اور مٹی سے وابستہ ہیں اور وہ مٹی سے چپٹے ہوئے ہوتے ہیں، وہ سنہرے خواب نہیں دیکھتے ہیں۔

افسانوں میں کردار نگاری ایک مشکل مرحلہ ہے۔ اگر اسے افسانہ نگار کی آزمائش کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کردار نگاری کے سلسلے میں افسانہ نگار کو بہت سی پابندیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ اس بات کا خواہشمند ہوتا ہے کہ اس کے کردار اُن خصوصیات کے حامل ہوں جن کے لیے انھیں پیش کیا جا رہا ہے۔ بادشاہ، وزیر، آقا، غلام، باندی، ملکہ، استاذ، شاگرد، تاجر، مزدوری پیشہ لوگ الغرض جو بھی کردار دیا جائے اس میں فطرت اور حقیقت کی جھلک ضرور دکھائی دینی چاہیے۔ ورنہ کرداروں میں جھول پیدا ہونے کا خدشہ رہتا ہے اور اسے کچھ اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔ چونکہ کسی بھی افسانے میں زندگی کا سنجیدہ تجزیہ کیا جاتا ہے اور زندگی کی حقیقتوں اور باریکیوں کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جاتا ہے اور افسانہ نگار انسان کو سوچنے اور غور و فکر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لیے افسانے میں واقعات اور فضا و منظر کے ساتھ ساتھ کردار نہایت اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی بھی افسانے کی جان کرداروں میں ہوتی ہے لہذا قصہ اور کہانی میں اثر انداز ہونے والے کرداروں کی پیشکش اور جان ڈالنا افسانہ نگار کا پہلا فرض قرار پاتا ہے۔ اگر افسانہ نگار اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کو لکھاری کی کامیابی سمجھا جائے گا کہ اس نے قاری کو حقیقی اور فطری کردار دیئے۔ اور قارئین میں یہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب رہا ہے کہ کردار اس کے ساتھ ہے۔ وہ کرداروں سے اجنبیت اور ناانوسیت محسوس نہیں ہونے دیتا ہے۔

ایک کامیاب افسانہ نگار اپنے افسانوں میں سماج اور معاشرے کے جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے کردار پیش کرتا ہے۔ قارئین کو ان سے متاثر ہو کر محبت و نفرت کا پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔ افسانہ ختم ہونے کے بعد بھی قاری اُن سے لطف اٹھا سکتا ہے اور متاثر اس حد تک کہ کسی کردار کی یاد ہمیشہ کے لیے دل میں رہ جائے۔ کہانی، قصے کے کرداروں کا تعلق جس سماج، معاشرے اور عہد سے ہو اس کی جملہ خصوصیات سے آگاہی بھی افسانہ نگار کو ہونا ضروری ہے۔ اس وقت کے رسم و رواج و طرز رہن سہن سے آگاہی جب تک افسانہ نگار کو نہ ہوگی تب تک وہ کرداروں کے حوالے سے انصاف نہ کر پائے گا۔ کسی بھی افسانے میں چونکہ زندگی کا صرف ایک رخ یا ایک پہلو ہی دکھایا جانا مقصود ہوتا ہے لہذا کردار کی پوری زندگی یا اس کی مجموعی شخصیت کی بجائے صرف کسی ایک پہلو کی واضح جھلک دکھانا ہی کافی سمجھا جاتا ہے کیونکہ داستان، ڈرامہ، ناول کی نسبت افسانے میں کرداروں کی پیشکش بالکل مختلف انداز میں ہوتی ہے۔ کسی بھی افسانے میں کردار کا اظہار مختصراً بھی ہو سکتا ہے اور طویل بھی۔ مگر لکھاری کو چاہیے کہ جتنا بھی ہو اُسے اس حد تک جاندار ہونا

چاہیے تاکہ قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ لے اور تادیر اُن پر اپنے اثرات رکھے اور مدتوں تک قارئین کو یاد رہے۔ اسے افسانہ نگار کی کامیابی سمجھا جائے گا۔

اشفاق احمد کے کرداروں کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان کے کردار ان کے افسانے کے موضوع کو نبھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اشفاق احمد نے پہلا افسانہ نوعمری میں "توبہ" کے نام سے لکھا۔ اشفاق احمد کے بیشتر افسانوں کی طرح یہ افسانہ بھی اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہے۔ اشفاق احمد کے دونوں مرکزی کردار کہانی کے انجام پہ افسانے کے سبق سے آگاہی دلاتے ہیں۔ نوجوان اعجاز کو سگریٹ نوشی کی بری عادت پڑ گئی تھی تو گھر میں سب لوگ بہت پریشان تھے۔ وہ ہر حال میں اسے بری عادت سے بچانا چاہتے تھے۔ گھر والوں نے لاڈ پیار سے سمجھایا، شرطیں لگائیں، انعام کا لالچ دیا، دھمکی بھی دی لیکن یہ اس عادت سے باز نہیں آتا ہے۔ اعجاز کو اپنے ننھیال شادی پہ جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ جہاں اس کی بچپن کی آشنا لیکھا اسے ایک نوعمر لڑکی کے روپ میں ملتی ہے اور یہ اسے دل دے بیٹھتا ہے۔ لیکھا کا کردار ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہے۔ اسے خود بھی سگریٹ نوشی سے نفرت ہے اور اپنے محبوب اعجاز سے بھی یہ عادت چھڑوانا چاہتی ہے۔ اشفاق احمد کا یہ کردار اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہے اور اعجاز سے یہ عادت بد چھڑوانے میں لیکھا کامیاب ہو جاتی ہے۔ وہ کام جو کوئی نہ کر سکا تھا، محبت نے کر دکھایا۔ اشفاق احمد نے ان کرداروں کی عادات و اطوار اور گفتگو کو ایسے ہی پیش کیا ہے جیسے اس عمر میں ہونے چاہیے۔ یہ دونوں کردار حقیقت کے بہت قریب دکھائی دیتے ہیں۔ یہ افسانہ قیام پاکستان سے پہلے کا ہے اس لیے اس افسانے اور کرداروں میں ہندوستانی فضا نظر آتی ہے۔ کرداروں کو مزید نکھارنے کے لیے اشفاق احمد نے ہندوستانی جھلک دکھائی ہے۔ اپنے کرداروں میں حقیقی انداز میں عکاسی کرتے ہوئے قارئین کے دلوں میں اتار دیتے ہیں۔ اس افسانے میں شادی کی رسومات کے لیے ہندوستانی سماج کی رسوم و رواج کا سہارا لیا گیا ہے تاکہ کرداروں میں حقیقت کی جھلک نظر آئے۔ دونوں کرداروں کے جذبات اور تاثرات کی عکاسی کے لیے ایسے الفاظ کا سہارا لیا ہے جو اس نوعمری میں نوجوان لڑکے لڑکیاں استعمال کیا کرتے ہیں۔ تاکہ قارئین پہ اچھا تاثر پڑے۔ کرداروں کے زبان و بیان میں تغیر و تبدل کا مظاہرہ بھی کیا ہے تاکہ یکسانیت اور بوریت سے بچا جاسکے۔ معاشرتی زندگی میں موجود چھوٹی چھوٹی برائیوں اور ناگوار یوں کو غیر محسوس طریقے سے بدلنے کی تڑپ ان کے کرداروں میں پائی جاتی ہے۔ اسی لیے لیکھا نے اعجاز میں پائی جانے والی بری عادت کو بدلنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب رہی ہے۔ درحقیقت یہ اس کردار کی کامیابی ہے جسے خوبصورتی سے تراشا گیا ہے۔ نیکی اور بدی کا تصور اس قدر پختہ ہو چکا تھا اور محبت اتنے توانا روپ میں سامنے آتی ہے کہ نوجوان کی زندگی بدل دیتی ہے۔

اشفاق احمد نے ننھے ننھے بچوں کو بھی بطور کردار پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی جوائنٹ فیملی کے بارے میں اشفاق احمد نے بہت سے افسانے لکھے ہیں اور ان میں مختلف نوعیت کے کرداروں کو پیش کیا ہے۔ گھرانہ کسی بھی معاشرے کی اکائی مانا جاتا ہے اس لیے افسانہ نگار نے اسی کو بنیاد بنا کر معاشرتی مسائل، حالات و واقعات کو اپنے کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اشفاق احمد کے

کرداروں کی خاص بات یہ ہے کہ ان کا بنیادی تعلق اور رشتہ اپنی مٹی سے بہت مضبوطی سے جڑا ہوا اور بندھا ہوا ہوتا ہے۔ نانی اماں اور فہیم کا کردار بہت عمدگی سے "فہیم" افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔ نانی اماں اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ اپنے تجربے کی روشنی میں نسل نو کے سینے میں منتقل کر رہی ہیں۔ یہاں ان کا پس منظر میں مقصد اصلاحی اور اخلاقی تربیت کا ہے۔ نانی اماں گزرے زمانے کے واقعات کو اپنے بچوں کو اس انداز میں سنارہی ہیں کہ ان کی دلچسپی بھی برقرار رہے اور کہانی سننے کا مقصد بھی پورا ہو سکے۔ بچے جب سوتے ہوئے لڑتے جھگڑتے ہیں اور ایک دوسرے کے بستر پہ ٹانگیں پھیلانے اور مکمل نیچے گرا دینے کا گلہ شکوہ کیا جاتا ہے تو نانی اماں ان کو شرارتوں سے تشبیہ دیتی ہیں اور بچوں کو نانا ابو، ان کے بہن بھائیوں کے واقعات سنا کر ثابت کرتی ہیں کہ چھوٹے موٹے واقعات ہر دور میں ہر گھرانے میں پیش آتے رہتے ہیں مگر انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ انھی واقعات کو بنیاد بنا کر دائمی ناراضگی مول لے بلکہ نظر انداز کرنا سیکھ لے تو زندگی گزارنا آسان ہو جاتا ہے۔ انسان کی نہ صرف اپنی زندگی بلکہ دوسروں کی زندگی بھی آسان ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسانی رشتے اور تعلق نبھانے میں آسانی ہوتی ہے۔ ننھے بچوں کی نفسیات کو اشفاق احمد نے ننھے فہیم اور اس کے بہن بھائیوں نعیم، سلیم، نسرین اور پروین کے کرداروں کی صورت میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ بچوں کے اندر پایا جانے والا تجسس، خوف، خوشی و مسرت کو اشفاق احمد نے فطری انداز میں پیش کیا ہے تاکہ یہ ننھے کردار حقیقی انداز میں سامنے لائے جاسکیں۔ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر بات اور معاملے کو کرید کرید کر تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ نانی اماں سے کہانی سننے کے دوران بار بار سوالات پوچھتے رہتے ہیں۔ اس سے اگر کہانی کا تسلسل اگرچہ بار بار ٹوٹ جاتا ہے مگر بچوں کی ایک تو دلچسپی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کہانی سن رہے ہوتے ہیں اور دوسرا وہ ہر بات پہ تسلی اور تشفی کے بعد ہی کہانی کو آگے بڑھنے دیتے ہیں۔ کہانی کے دوران نانی اماں اپنی گزری زندگی کے دکھ بھرے واقعات اور مسائل و پریشانیوں کا ذکر کرتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنی زندگی سے جفا کشی اور بہادری کے قصے بھی سناتی ہیں جن کا مقصد بچوں کی تربیت کے حوالے سے یہ تھا کہ بچوں کو عملی زندگی میں درپیش آنے والے مسائل و مصائب سے نہ صرف آگاہ کیا جائے بلکہ ان کو ذہنی طور پہ تیار بھی کیا جائے کہ زندگی کوئی آسان شے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ محنت، صبر، حوصلے اور استقامت سے سامنا کرنے سے ہی آسان بنائی جاسکتی ہے۔ افسانہ "فہیم" میں ننھے فہیم کا نام کردار کی مناسبت سے فہم و فراست کی وجہ سے فہیم رکھا گیا ہے اور یہ بھی اشفاق احمد کا خاصہ ہے کہ کردار کا نام اسی کی مناسبت سے رکھا گیا ہے کیونکہ ننھا فہیم باقی بہن بھائیوں کی نسبت زیادہ ذہین اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ اسی لیے اُسے افسانے میں مرکزیت حاصل ہو جاتی ہے اور یہی اس کردار کی خوبی ہے کہ اپنے اوصاف اور اہلیت کی بنیاد پہ مرکزی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔

اشفاق احمد کے ہاں عشق اور مذہب و وسیع تناظر میں اور زندگی کے نشیب و فراز پہ پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے انسانیت سے محبت کا درس اور پیغام دیا ہے۔ اشفاق احمد محبت کی روایت کو اگلی نسل تک ورثے کی صورت میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ محبت کو آفاقی اور عالمگیر جذبہ قرار دیتے ہیں اور محبت کے حقیقی جذبے کو زندہ کرنا چاہتے ہیں جس میں دکھاوا اور مادیت پرستی نہ

ہو۔ انھوں نے تلخ حقائق اور مسائل کو احسن انداز میں محبت میں اس طرح سمویا ہے کہ قاری عشق و محبت کے ایک نئے مفہوم سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ محبت کو جینے کے لیے مثبت پیغام اور تحریک کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا تصور محبت محدود نہیں ہے بلکہ ہمہ جہت پہلوؤں کا حامل ہے جو کرداروں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ محبت کا یہ روپ ان کے کرداروں لیکھا، مارگریٹ، ایلن، وحید، پیٹر، شوق، بیٹرس، بھیا، پی، آپی، انجم بھائی، ایل ویرا، نمدارا اور کلثوم میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں مذہبی عناصر ایک خاص رنگ اور نئے روپ میں ملتے ہیں۔ وہ مذہب کی روح پہ عمل کرنے کے قائل ہیں۔ وہ مذہب کو ذہنی و روحانی سکون اور باطنی پاکیزگی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اسی نقطہ نظر سے مذہبی عناصر کو کرداروں کے ذریعے پیش ضرور کیا ہے مگر کہانی پہ حاوی کبھی نہیں ہونے دیا۔ مذہب کو اخلاقی تعلیمات، علم و عمل اور امن و آشتی کا ذریعہ گردانتے ہیں۔ صرف اسلام ہی نہیں بلکہ دیگر الہامی اور غیر الہامی مذاہب کو بھی انھوں نے اپنے افسانوں کے کرداروں کے ذریعے شامل کیا ہے۔ اشفاق احمد نے مذہب کے اثرات انسانی زندگیوں پہ دکھانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اس کو ایک ایسے آلے کے طور پہ دیکھتے ہیں جو انسانوں کی زندگی سنوارنے اور مثبت تبدیلی لانے کی بھرپور اہلیت رکھتا ہے۔ مذہبی تعلیمات کی روشنی میں وہ انسان دوستی، ہمدردی، مساوات اور رواداری کا پیغام عام کرنا چاہتے ہیں۔ اشفاق احمد کے کردار بھی مذہبی رواداری کے قائل نظر آتے ہیں اور کہیں بھی شدت پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں۔ اس طرح کے کرداروں کی جھلک پیٹر، ایلن، پی، سنپورن سنگھ، داؤجی، صوفی ابراہیم، کامریڈ اصغر، نانی اماں، امی اور احسان میں واضح طور پہ دیکھنے کو ملتی ہے۔

اشفاق احمد کے بیشتر افسانے کرداری ہیں اور ان کے پورے افسانے پہ ان کے کردار حاوی دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے کرداروں کی پیشکش اور ان کا روپ تراشنے میں بھرپور طور پہ محنت کی ہے۔ ان کے افسانوں میں مرکزی کرداروں کے ساتھ ساتھ ضمنی کردار بھی پوری آب و تاب اور فنی دلکشی کے ساتھ موجود ہیں۔ بعض دفعہ یوں ہوتا ہے کہ ضمنی کردار مرکزی کرداروں کے پیچھے چھپ جائیں یا پس منظر میں چلے جائیں لیکن اشفاق احمد کے افسانوں میں ایسی صورت حال نہیں ملتی ہے بلکہ ان کے ضمنی کردار بھرپور طریقے سے حق نمائندگی ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے دیہاتی پس منظر کے حامل ہیں اور ان میں دیہاتی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسی طرح ان کے کردار بھی دیہاتی پس منظر رکھتے ہیں۔ اس کی مثالیں لیکھا، ارشد، انجم بھائی، آپی، بابا، وحید، نمدارا، سرور، عطیہ بانو پیرزادی فہیم، احسان، کیپٹن اور پی ہیں۔

بحیثیت مجموعی اشفاق احمد کے کردار چلتے پھرتے اور اپنی زمین سے وابستہ ہیں۔ ان میں کہیں بھی تخیلاتی رنگ، مصنوعی پن یا مبالغہ نہیں پایا جاتا ہے۔ اشفاق احمد کے کردار اور کہانیاں حقیقی پس منظر لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کے کردار زیادہ حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے کرداروں کو مکمل روپ میں پیش کیا ہے اس لیے مکمل تشکیل و تعمیر کی وجہ سے ان کے کردار قارئین کو متاثر کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں مستقل مقام بنالینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اشفاق احمد کے افسانوں کا زیادہ تر موضوع محبت ہے اور وہ محبت کو وسیع تر مفہوم میں پیش کرتے ہیں اس لیے ان کے کرداروں میں

عشقیہ عناصر اور جھلک زیادہ نظر آتی ہے۔ اگرچہ اشفاق احمد کے موضوعات منفرد اور متنوع رنگ لیے ہوئے ہیں مگر انھوں نے جس موضوع کو بھی لیا ہے اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہنے دیا ہے۔ اور جس طبقے، مذہب، رنگ، نسل یا قوم سے کردار لیا ہے اسے اس کی بھرپور نمائندگی دی ہے اور اس کا مکمل بہرہ وپیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس کردار کو حقیقی انداز میں پیش کیا جاسکے۔ اشفاق احمد نے کرداروں کی وضاحت کے لیے جزئیات نگاری سے کام لیا ہے اور جزئیات نگاری کا کمال یہ ہے کہ براہ راست زندگی کے گہرے مشاہدے اور ذاتی تجربات سے اخذ کرتے ہیں۔ وہ کرداروں کی زندگی میں درپیش واقعات کو کبھی سرسری نہیں دیکھتے ہیں بلکہ ان کے محرکات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں اور اس سے جہاں افسانوں کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے وہیں کرداروں کی اہمیت بھی دوچند ہو جاتی ہے۔

نتائج

- ۱۔ اشفاق احمد کے کرداروں کے مطالعے سے جو نتائج سامنے آتے ہیں۔ وہ کچھ یوں ہیں۔
- ۱۔ اشفاق احمد کے اکثر و بیشتر افسانے کرداری ہیں۔ ان افسانوں کی کہانیاں مرکزی کرداروں کے گرد ہی گھومتی اور اختتام پذیر ہوتی ہیں۔
- ۲۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں مرکزی کرداروں کے ساتھ ساتھ ضمنی کردار بھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ تمام ضمنی کردار کہانی یا مرکزی کردار کے معاون ہوتے ہیں۔
- ۳۔ اشفاق احمد کے زیادہ تر کردار اور افسانے دیہاتی پس منظر کے حامل ہوتے ہیں۔
- ۴۔ اشفاق احمد کے کرداروں میں زیادہ تر مردانہ کردار ہیں۔ مگر اس کے باوجود نسوانی کردار بھی افسانوں کا حصہ ہیں۔
- ۵۔ اشفاق احمد کے کردار چاہے نسوانی ہوں یا مردانہ یا کسی بھی مذہب سے ہوں حق کا ساتھ دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔
- ۶۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں مردانہ کردار زیادہ جاندار اور متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ نسبتاً نسوانی کرداروں کے۔
- ۷۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں واقعات کی نسبت کردار زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور یہ کردار بھی اپنے عہد، ثقافت اور لسانی انفرادیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔
- ۸۔ اشفاق احمد کے کردار زیادہ تر متوسط طبقے سے ہیں اور عام طور پر پڑھے لکھے اور ہنرمند افراد ہوتے ہیں۔

سفارشات

- ۱۔ اشفاق احمد کے کرداروں کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں کا فکری، فنی، موضوعاتی، اسلوبی اور تکنیکی جائزہ لینے کے لیے تحقیق کی ضرورت ہے۔
- ۲۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں دیہاتی معاشرہ پورے آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افسانوں کا سماجی پہلو سے جائزہ لیا جانا چاہیے۔
- ۳۔ اشفاق احمد کے ان دو مجموعوں کے افسانوں میں اکثر و بیشتر فسادات کا تذکرہ ملتا ہے۔ لہذا ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے افسانوں میں تقسیم ہند، قیام پاکستان، فسادات اور ہجرت کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔
- ۴۔ اشفاق احمد کے افسانوں کا معاصر افسانہ نگاروں کے ساتھ تقابلی جائزہ لینے کے لیے بھی تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔
- ۵۔ اشفاق احمد صوفی دانشور اور ادیب تھے۔ اس لیے ان کے افسانوں میں صوفیانہ عناصر کی تلاش کے حوالے سے بھی تحقیق کی ضرورت ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

اشفاق احمد، اُجلے پھول، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ء

اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء

ثانوی مآخذات

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب لاہور ۲۰۱۵ء

احسن فاروقی، ڈاکٹر، ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی، ناول کیا ہے؟ در د اکادمی لاہور ۱۹۶۴ء

انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ۱۹۹۸ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۱ء

اشفاق احمد، زاویہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ء

اے حمید، اشفاق احمد شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد ۱۹۹۸ء

حشمت جہاں ناز، اردو نثر نگاری (ابتداء سے آج تک اردو نثر کا جائزہ) یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار پشاور سن

خیال امر وہوی، ڈاکٹر، مترجم لغات سماجی علوم و فلسفہ، یو پبلشرز اردو بازار لاہور ۲۰۰۸ء

سبینہ اولیس اعوان، ڈاکٹر، افسانہ شناسی، مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ، امین پور بازار فیصل آباد ۲۰۱۵ء

سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۲۰۱۶ء اشاعت دوم

طیب طاہر، ڈاکٹر، لاہور میں اردو افسانے کی روایت، مثال پبلشرز فیصل آباد ۲۰۱۵ء

عابد علی عابد، اصول انتقاد ادبیات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰ء

عبدالقادر سروری، کردار اور افسانہ حصہ دوم مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن ۱۹۲۹ء

ڈاکٹر فوزیہ اسلم، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی اسلام آباد ۲۰۰۷ء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۸۲ء

گوپی چند نارنگ، نیا اردو افسانہ، انتخاب، تجزیے اور مباحث، اسلم پبلشرز کراچی ۱۹۸۹ء

محمد عالم خان، ڈاکٹر، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، علم و عرفان پبلشرز لاہور ۱۹۹۸ء

محمد نواز کھل، مرتب، باتوں سے خوشبو آئے۔ زاویہ پبلشرز دربار مارکیٹ لاہور ۲۰۱۳ء

مرزا حامد بیگ، افسانے کا منظر نامہ، مکتبہ عالیہ لاہور س۔ن
 مسعود رضا خاکی، ڈاکٹر، اردو افسانے کا ارتقاء، مکتبہ خیال لاہور ۱۹۸۷ء
 ممتاز مفتی، اور اوکھے لوگ، فیصل ناشران، لاہور ۲۰۰۸ء
 نجم الہدی، ڈاکٹر، کردار اور کردار نگاری، میر بخش علی اسٹریٹ مدراس ۱۹۸۰ء
 وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، الو قار پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰ء
 سید وقار عظیم فن افسانہ نگاری سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد ۱۹۳۵ء

۲۴. The World Book of Encyclopedia, Volum ۵, Field Enterprises
 Education Corporation, Chicago, London, Rome, Sydney,
 Toronto. Copy right ۱۹۷۰ (Printed in USA)

لغات اور فرہنگ

خواجہ عبد المجید، مولفہ و مرتبہ جامع اللغات، جلد دوم، اردو سائنس بورڈ لاہور س۔ن
 ڈاکٹر فہمیدہ بیگم مرتب فرہنگ اصطلاحات (انگریزی اردو) Glossary of Technical Terms
 ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۸ء اشاعت اول
 سید قائم رضا نسیم امر و ہوی، سید مرتضیٰ فاضل لکھنوی (اردو مترجمین) نسیم اللغات، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور س۔ن
 محمد عبداللہ خان خویشتگی مرتبہ فرہنگ عامرہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۹ء
 مولوی فیروز الدین مرتبہ و مولفہ فیروز اللغات فیروز سنز لاہور ۲۰۰۱ء
 وارث سرہندی، قاموس مترادفات اردو سائنس بورڈ اپر مال لاہور ۱۹۸۶ء

رسائل و جرائد

ادب لطیف (ماہنامہ) اشفاق نمبر جلد ۷۰ شمارہ نمبر ۵ لاہور مئی ۲۰۰۵ء
 راوی سالنامہ اشفاق نمبر جلد ۹۲ واحد شمارہ جی سی یونیورسٹی لاہور اکتوبر ۲۰۰۵ء

اخبارات

روزنامہ مساوات، لاہور، بدھ ۸ ستمبر ۲۰۰۴ء

Pakistan Observer ,Wednesday ۸,September ۲۰۰۴